فیضی بھرتپوری معاصرین کی نظر میں

مجلہ

بیادِ شاعرِ اہلِ بیت

حضرت سید فرزند حسن زیدی الواسطی

فیضی بھرتپوری

اعلی اللہ مقامہ

لکھا اک مرثیہ بہ عنوانِ حسینؑ
پہنچا درِ جنت پہ ثنا خوانِ حسینؑ
رضوان کو ندا آئی، قدم لے بڑھ کر
یہ فیضی ہے فیضیابِ فیضانِ حسینؑ

زیرِ اہتمام

ادارہ فیضی ادب کراچی

● نامِ اشاعت : حضرت فیض بھرتپوری ــــ معاصرین کی نظر میں

● تعدادِ اشاعت : ایک ہزار

● تاریخِ اشاعت : جولائی ۱۹۸۹ء

● زیرِ اہتمام : ادارۂ فیضِ ادب

۵ سی، ۱۱/۵، ناظم آباد، کراچی - پاکستان

فون : ۶۱۳۴۰۷

مطبوعہ :- عالمگیر پبلیکیشنز ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

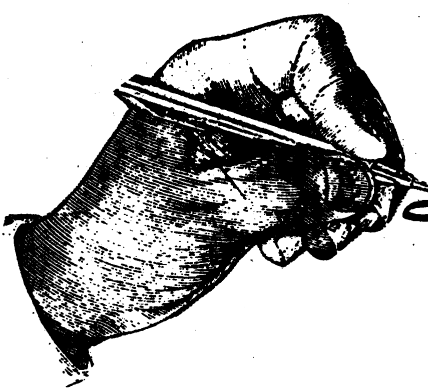

حرفِ سپاس

حضرت سیّد فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری کا شمار برِصغیر کے ممتاز و معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل، نظم، رباعی اور قطعہ کے ساتھ ساتھ نعت، منقبت، قصیدہ، نوحہ، سلام اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی اور رثائی شاعری میں خاصی اہمیت اور مقبولیت حاصل کی۔

حضرت فیض بھرتپوری شاعر اہلِ بیت تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں مرثیہ نگاری کا باقاعدہ طور پر آغاز کیا۔ ان کے مرثیوں نے برِصغیر پاک و ہند کے ساتھ ساتھ برطانیہ اور امریکہ میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ ان کے مرثیے کی انفرادیت حقائق نگاری، مقصدیت اور اصلاحی ترغیب ہے ——— قیامِ پاکستان کے بعد اردو شاعری کے دبستانِ کراچی میں رثائی ادب کے حوالے سے جن قدآور شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے، ان میں حضرت فیض بھرتپوری

بھی شامل ہیں۔

حضرت فیض بھرتپوری ۵ مئی ۱۹۸۹ء کو ہم سے جدا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ——— اس سانحہ ارتحال پر ادارۂ فیض ادب کراچی کو حضرت فیض بھرتپوری کے معاصرین، دوستوں، عقیدتمندوں اور چاہنے والوں کی جانب سے بے شمار تعزیتی خطوط اور پیغامات موصول ہوئے۔ پاکستان، بھارت، امریکہ اور برطانیہ سے تعزیتی پیغامات کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے ——— سوگواران حضرت فیض بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ نے ایصال ثواب کے لئے ۸ جون ۱۹۸۹ء کو مسجد باب العلم، شمالی ناظم آباد، کراچی میں ایک مجلس عزاء منعقد کی جبکہ پاکستان کے دیگر شہروں، بھارت، برطانیہ اور امریکہ کے مختلف شہروں میں بھی ایسی ہی مجالس عزاء کے انعقاد کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں ——— حضرت فیض بھرتپوری کی رثائی ادب میں نصف صدی پر محیط گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ۱۵ جون ۱۹۸۹ء کو پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کے زیر صدارت ایک تعزیتی جلسہ، امام بارگاہ چہاردہ معصومین، انچولی سوسائٹی، کراچی میں منعقد ہوا جس میں ملک کے نامور ادیبوں، شعراء اور صاحبان علم و دانش نے حضرت فیض بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ کی شاعری اور شخصیت اور خدمات کے حوالوں سے مقالات، نظمیں اور تاثرات پیش کئے جبکہ کئی مضامین، مقالات اور منظوم نذرانۂ عقیدت، ادارۂ فیض ادب کو بذریعہ ڈاک بھی موصول ہوگئے ——— اسی سلسلے میں ایک یادگاری مجلہ کی اشاعت کی شدید ضرورت بھی محسوس کی گئی۔

حضرت فیض بھرتپوری کے یادگاری مجلہ کی ترتیب و اشاعت اس قدر عجلت میں محال معلوم ہوتی تھی لیکن بہر حال یہ یادگاری مجلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس عجلت میں یہ مجلہ ترتیب دیا جاسکا اور شائع کیا جاسکا، عام حالات میں ایسا ممکن نہ تھا لیکن اسے ممکن بنانے میں حضرت فیض بھرتپوری کے معاصرین، عقیدتمندان اور ان کے چاہنے والوں کا بڑا حصہ ہے۔ معاصر ادیبوں، شعراء، اور ناقدین نے تنگیٔ وقت کے باوجود اپنے تاثرات، مقالات اور نظمیں بروقت فراہم کرکے ہمارے حوصلوں کو ثبات عطا کیا۔ ہم یقیناً ان حضرات کے سپاس گزار ہیں۔

ہم حضرت فیض بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادگان جناب باقر زیدی، جعفر زیدی، نسیم زیدی اور مسعود زیدی کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس مجلہ کی اشاعت کے لئے اپنا ہمہ جہتی تعاون فراہم کیا۔

ہم ممنون و مشکور ہیں محترم پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم تقوی
کے جنہوں نے اس مجلّہ کی اشاعت کو ممکن بنانے میں عملی تعاون کیا۔ ہم
ان کی مخلصانہ توجہ اور نوازش کا حق محض الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر
ہیں۔

ہم حضرت راحتؔ جہانگیرآبادی کے بھی مشکور ہیں جنہوں
نے مراثیٔ فیضؔ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۷۹ء کے تیسرے مرثیہ کے مطلع کے ایک مصرعہ

'کیا کم شرف ہے یہ کہ علیؑ کا غلام ہوں'

۱۹۸۹ء

سے حضرت فیضؔ بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ کی تاریخِ وفات نکالی۔

ہم سپاس گزار ہیں جناب نیّرؔ اسعدی، سرفراز ابدؔ
اور اقبالؔ کاظمی کے جنہوں نے اس مجلّہ کی اشاعت کے لیے اپنا ہمہ وقتی اور
ہمہ جہتی تعاون انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ فراہم کیا۔

اس یادگاری مجلّہ کی اشاعت کے لئے جو عمومی
تعاون ہر طرف نظر آیا وہ یقیناً حضرت فیضؔ بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ
کی اہمیت اور پسندیدہ شخصیت کو زبردست خراجِ تحسین ہے۔

یہ یادگاری مجلّہ اگر کسی قابل ہے تو لائقِ ستائش
ہیں وہ اربابِ علم جن کی نگارشات اس مجلّے کے صفحات کی زینت ہیں
— اور اگر کہیں کوتاہی نظر آئے تو اسے ہماری بے بضاعتی پر منتج کیا
جائے —!

ہم دست بہ دعا ہیں کہ پسماندگان کو رفتگان
کے علمی اور مذہبی آثار اور ورثوں کی حفاظت کی توفیق عطا ہوتی رہے!

اراکینِ ادارۂ فیضِ ادب
۵ سی، ۵/۱۱ - ناظم آباد
کراچی - پاکستان
فون: ۶۱۳۴۰۷

۱۵ جولائی سن ۹۰ء

"فیضؔ بھرتپوری معاصرین کی نظر میں"
یادگاری مجلہ
۱۹۷۹ء

فہرستِ ترتیب

عرضِ حال (خود نوشت سوانح حیات)	فیضؔ بھرتپوری	۱۰
جنابِ فیضؔ بھرتپوری (تعارف)	سید انعام حسین زیدی	۱۴
تاثرات و مقالات :		۱۷
اساتذۂ فن کی تابندہ یادگار	پروفیسر کرار حسین	۱۸
کربِ آگہی کا شاعر فیضؔ بھرتپوری	پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی	۱۹
اور فیضؔ بھرتپوری بھی...	سید محمد تقی	۲۲
فیضؔ بھرتپوری	صباؔ اکبرآبادی	۲۴
فیضؔ بھرتپوری کا فن	سید وحید الحسن ہاشمی	۲۵
تاجدارِ اقلیمِ سخن	علامہ سید رضی جعفر نقوی	۳۵
فیضؔ بھرتپوری	تابشؔ دہلوی	۳۹
فیضؔ بھرتپوری بحیثیت مرثیہ نگار	ظفرؔ جونپوری	۴۱
حضرت فیضؔ بھرتپوری	سردار نقوی	۴۶
فیضؔ مرحوم	علامہ سید جاوید جعفری	۴۹
آہ فیضؔ مرحوم	یاور حسین یاورؔ اعظمی	۵۰
بیادِ فیضؔ مرحوم	شادانؔ دہلوی	۵۳
فیضؔ بھرتپوری	امیدؔ فاضلی	۵۵
فیضؔ بھرتپوری ایک منفرد نثر نگار	ابن الشہید محمود الحسن رضوی	۵۶
آہ فیضؔ بھرتپوری	آغا محمد اصغر صاحب	۸۰
آہ فرزندِ حسین فیضؔ	شفقؔ اکبرآبادی	۸۱
مکتوب بنام فیضؔ بھرتپوری مرحوم..	راحتؔ جہانگیرآبادی	۸۴
آہ فیضؔ مرحوم	پروفیسر فرحت ظفر جعفری	۸۵
فیضؔ بھرتپوری	مولانا عبدالباری صدیقی	۸۶
ہمارے فیضؔ بھرتپوری	الحاج ضمیر اختر نقوی	۸۷

نذرِ فیض	ریاضت علی شائق	۸۹
یہ بھی کہو انسان تھے فرزندِ حسن فیض	سبطِ حسن انجم	۹۱
سفرِ آخرت	کرارحسین زاہد فتحپوری	۹۴
حضرت فیض بھرتپوری مرثیہ نگار کی حیثیت سے	پروفیسر سید غلام عباس	۹۶
وہ صورتیں الٰہی...	سید محمد عالم زیدی	۱۱۳
فیض بھرتپوری کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ	طارق عباس آذر	۱۱۷
حرفِ عقیدت	سرفراز ابد	۱۲۵
دنیائے مرثیہ کا ایک چراغ اور گل ہو گیا	آغا نیر علی نیر اسعدی	۱۲۹
دکھاتا ہے داغ آسمان کیسے کیسے	مشہود جعفری	۱۳۳
بیادِ فیض	سبط جعفر زیدی	۱۳۴
بیٹھوں تو نیند آ گئے	ریحان اعظمی	۱۴۴
فیض بھرتپوری	محمد رضی راہی	۱۴۵
فیض بھرتپوری جدید مرثیہ گو شاعر	ڈاکٹر سید نیر حسین	۱۴۸
آہ فیض بھرتپوری	محمد تقی زیدی رہبر	۱۴۹
فیض بھرتپوری بحیثیت مرثیہ گو	غلام عباس بٹ	۱۵۱

منظومات / نذرانۂ عقیدت / قطعہ ہائے تاریخِ وفات ۱۵۵

حضرت بشیر فاروقی • حضرت نیسان اکبرآبادی • رابعہ نہاں • یاور حسین یاور اعظمی
ساحر لکھنوی • حکیم محمد کاظم زیدی • باقر زیدی • قمر وارثی • کوثر نقوی
اقبال کاظمی • مرزا حیدر عباس • وقار محسن • حیدر مہدی رضوی
فیض امروہوی • سحر حیدر راہی • وحید الحسن ہاشمی

اظہارِ تعزیت (مکتوبات) ۱۸۱

نیسان اکبرآبادی • رابعہ نہاں • عدنان عادل • سید مرتضیٰ میاں زیدی
سید بنیاد علی نقوی • تحسین • شاہد حیدری

تعزیتی جلسے کی روئیداد ۱۹۱

تعزیتی جلسہ بیاد حضرت فیض بھرتپوری مرحوم رپورٹ: باقر زیدی ۱۹۲

یادداشت ۲۰۹

۱- مکتوبات بنام حضرت فیض بھرتپوری: ۲۱۰
- نسیم امروہوی • ڈاکٹر معتمد حسین • ڈاکٹر مسعود رضا خاکی
- راہی جہانگیرآبادی • ہلال نقوی • شاہد حمیدی • قمقام جعفری

۲- فیض بھرتپوری کا مضمون "بھرتپور کی تاریخ مرثیہ گوئی" ۲۱۸

۳- فیض اور فن (تاثراتی اقتباسات) ۲۲۸
- پروفیسر منظور حسین شور • علامہ طالب جوہری

۴- کلامِ فیض بھرتپوری- ۲۳۲
- نظم • نعت • منقبت • قصیدہ • سلام • نوحہ • قطعہ
- قطعہ تاریخ وفات • مرثیہ در حال شہادت حضرت سکینہؑ
- مرثیہ در بیان شہادت حضرت عباسؑ علمدار • غزل

۵- ترجمۂ کلام حضرت فیض بھرتپوری (انگریزی میں) ایس جی عباس ۳۰۷

English Section

Faiz Bharatpuri — a renowned poet
by: Prof. Dr. Naeem Taqvi 320

Faiz Bharatpuri by: Mohsin Burney 317

Faiz Bharatpuri by: Kausar Zaidi 314

An appreciation of Late Faiz Bharatpuri
by: Kausar Zaidi 312

مجھ پہ موقوف ہے کیا، جو بھی کرے مدح رقم — اس کو ملتے ہیں در علم سے موتی پیہم
عقل حیران ہے یہ دیکھ کے خالق کی قسم — دل کی آواز کو سُن لیتا ہے کس طرح قلم

اپنی مرضی سے نہ چلتا نہ کبھی لکھتا ہے
بات جو دل میں ہے میرے یہ وہی لکھتا ہے

حضرت سیّد فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری

فیضی بھرتپوری

۱۹۷۹ء

عرضِ حال

(خود نوشت سوانحِ حیات)

میری پیدائش ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو محلہ بدہ کی ہاٹ ریاست بھرت پور میں ہوئی ہم دو بھائی توام پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی کا نام سید انعام حسین زیدی رکھا گیا اور میرا فرزند حسن زیدی ہائی اسکول بھرت پور سے میٹرک ۱۹۲۶ء میں کیا اور شادی ۹، دسمبر ۱۹۳۴ء کو سید ہدایت علی رضوی اکبرآبادی کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ چونکہ آبا و اجداد سے عزاداری چلی آرہی تھی اس لئے والد مرحوم سید اکرام حسین کلیم نے بچپن ہی میں رباعیات و سلام پڑھوانے شروع کر دیئے چونکہ خاندان کا ہر فرد شاعر تھا اس لئے طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوئی اور تیرہ برس کے سن میں بھرت پور کی نمائش کے مشاعرے میں پہلی غزل اس مصرع طرح پر کہہ کر پڑھی۔

نظر چاروں طرف آتا ہے باغِ آرزو مجھ کو

غزل تلف ہوگئی۔ ایک شعر کا مصرعہ ثانی ذہن میں محفوظ ہے وہ اس لئے کہ ایک قافیہ زبان کا ایسا استعمال کیا تھا جو کسی نے نظم نہیں کیا تھا اور وہ یہ تھا۔ "سمجھ رکھا ہے کوئی آپ نے کیا بانگرو مجھ کو" ابتداء میں غزلیں شادؔ بھرت پوری کو دکھائیں اور کبھی کبھی عروجؔ بھرت پوری سے اصلاح لی۔ غرضکہ دونوں اساتذہ سے استفادہ حاصل کرتا رہا۔ ایک عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بھرت پور میں طرحی مشاعرے مہینہ میں دو بار ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب میں ہوا کرتے تھے۔ ایک صبح کو شریکِ حیات نے استفسار کیا کہ غزل کس کی اچھی رہی۔ میں نے کہا میری۔ اس پر طنزاً کہا کہ واہ واہ سبحان اللہ۔ میں نے کہا کیا مطلب تو کہا کہ یہ سب یہیں رکھا رہ جائے گا ایسا

کہئے جو عقبیٰ کے کام آئے۔ میں نے کہا کہ اس رنگ میں کبھی کچھ کہا نہیں تو جواب دیا کہ غزل تو آپ کہتے ہوئے پیدا ہوئے تھے اس جملے نے نشتر کا کام کیا نہیں ایام میں علیگڑھ سے ایک مصرعہ آیا ہوا تھا۔ "سلامی خوب کھیلی رن میں تیغ لافتے ہولی" چنانچہ اس مصرعہ پر سلام کہا۔

سلام

سلامی رنج و غم کی کربلا میں انتہا ہولی
سکینہؑ باپ سے زینبؑ برادر سے جُدا ہولی
فلک میں یہ اثر کب ہے کہ شہؑ کے خونِ ناحق سے
زمینِ کربلا تاثیر میں خاکِ شفا ہولی
لکھا مسلمؑ نے خط شہ کو۔ نہ آئیں آپ کوفے میں
کہ بیعت کرکے یہ ساری جماعت بیوفا ہولی
زمانہ پھر گیا کیسا غضب ہے شہ کی عترت سے
ہوئے قیدی۔ لٹا گھر۔ بی بی ہر اک بے ردا ہولی
پکارے عابدؑ بیمار۔ راہِ شام میں بابا
لگے ہیں پشت پر درّے۔ مرض اچھی دوا ہولی
بپا کہرام تھا مقتل میں شہ کے قتل پر کیسا
فلک رویا۔ زمیں کانپی ملائک میں بکا ہولی

قطعہ

بہائے اشکِ خون زینبؑ نے رُخ سوئے نجف کرکے
کہا بابا اٹھو مرقد سے۔ سُونی کربلا ہولی
پھری بے مقنع و چادر۔ گئی دربار میں بابا
بھرا گھر ہو گیا غارت جفا کی انتہا ہولی

سکینہؑ روئی جب شہؑ کو طمانچے شمر نے مارے
قیامت کربلا میں بعد شاہِ کربلا ہولی
زیارت کی علیؑ کی۔ کیوں نہ ہو امید تربت میں
کفن میں ساتھ اپنے فیض جب خاکِ شفا ہولی

٭ ٭ ٭

فارسی کی تعلیم عروج بھرت پوری سے حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں کچھ بند مرثیے کے کہے۔ عروج بھرت پوری نے سننے کے بعد فرمایا کہ مرثیہ کہنے کے کچھ قواعد ہیں پہلے وہ سیکھو۔ یہ سلسلہ جاری رہا کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں حیدرآباد دکن ہوتا ہوا کراچی پہونچا۔ یہاں سید علی اطہر جعفری مرحوم اطہر کے مسلسل اصرار پر سال ۱۹۶۳ء میں مرثیہ عزا خانہ انجمن ایرانیان میں دربارِ حضرت عباسؑ علمبردار پڑھا اور وہ مرثیہ کچھ ہمعصر مرثیہ گو حضرات پر گراں گزرا۔ آئندہ سال کے لئے مرثیہ کہنا شروع کردیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ میرا نام اس سال مرثیہ گویوں کی فہرست میں نہیں ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ مخالفین کا یہ خیال تھا کہ پڑھنے کا موقع نہ دیں گے تو کہنا بند کردے گا۔ چنانچہ اسی سال یعنی ۱۹۶۴ء میں جامعہ امامیہ ناظم آباد نمبر۲ عشرہ قائم کیا۔ جو سال ۱۹۷۹ء تک بڑی کامیابی کے ساتھ ہوتا رہا۔ لیکن اسی سال یہ مجالس نذرِ سیاست ہوگئیں۔ مولانا نسیم امروہوی نے اپنی مجلس میں مرثیہ پڑھنے سے قبل اعلان کیا کہ یہ مجالس اب بند کی جاتی ہیں۔ ادھر میرے اور مولانا مذکور کے درمیان سال ۱۹۷۷ء میں کچھ اختلافات ہوگئے۔ یہ ایس سبب میں نے ۱۹۷۷ء میں جامعہ امامیہ میں مرثیہ غیر اصلاحی پڑھا اور سال ۱۹۷۹ء میں بھی غیر اصلاحی مرثیہ اپنے داماد سید رضا حسین رضوی کے مکان واقع سید ولا۔ فیڈرل بی ایریا نمبر ۲ میں پڑھا۔ اس مجلس میں مولانا نسیم امروہوی نے بھی شرکت کی تھی۔ اب بہ فیضِ پنجتنؑ اصلاح تو درکنار کسی سے مشورہ بھی نہیں کرتا ہوں۔ خود اعتمادی کے سہارے چل رہا ہوں۔ میرے دادا سید اصغر حسین زیدی بصیر اور والد سید اکرام حسین زیدی کلیم نے بھی مرثیے کہے لیکن وہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی نذر ہوگئے۔

مطبوعہ تصانیف :

- مراثیٔ فیضؔ، جلد اول (۱۹۷۶ء) ● مراثیٔ فیضؔ، جلد دوم (۱۹۷۹ء)
- مرثیہ "گنجِ شہیداں" (۱۹۸۲ء) ● مرثیہ "تبرک" (۱۹۸۲ء)
- مرثیہ "فلسفۂ تبرک" (۱۹۸۴ء)

غیر مطبوعہ مراثی :

● در حالِ شہادتِ حضرت عباسؑ (جون ۱۹۶۳ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت علی اکبرؑ (جون ۱۹۶۴ء) ● در حالِ شہادتِ امام حسینؑ (دسمبر ۱۹۷۸ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت امام حسینؑ و تاراجیٔ خیام (ستمبر ۱۹۸۰ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت علی اصغرؑ (اپریل ۱۹۸۱ء) ● در حالِ حافظہ اہلبیتؑ دربارِ شام میں (مئی ۱۹۸۲ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت علی اکبرؑ (جولائی ۱۹۸۳ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت امام حسینؑ (اکتوبر ۱۹۸۴ء) ● در حالِ شہادتِ حضرت قاسمؑ (دسمبر ۱۹۸۴ء) ● در حالِ شہادتِ جنابِ سکینہؑ (جولائی ۱۹۸۵ء) ● داستانِ تشنہ وصالی، نہرِ فرات کی زبانی (اکتوبر ۱۹۸۶ء)

غیر مطبوعہ دیگر اصنافِ سخن :

● نعتِ رسولؐ ● منقبت ● قصیدہ ● سلام ● نوحہ ● قطعہ ● نظم ● غزل

جناب فیضؔ بھرت پوری

تعارف: سید انعام حسین زیدی

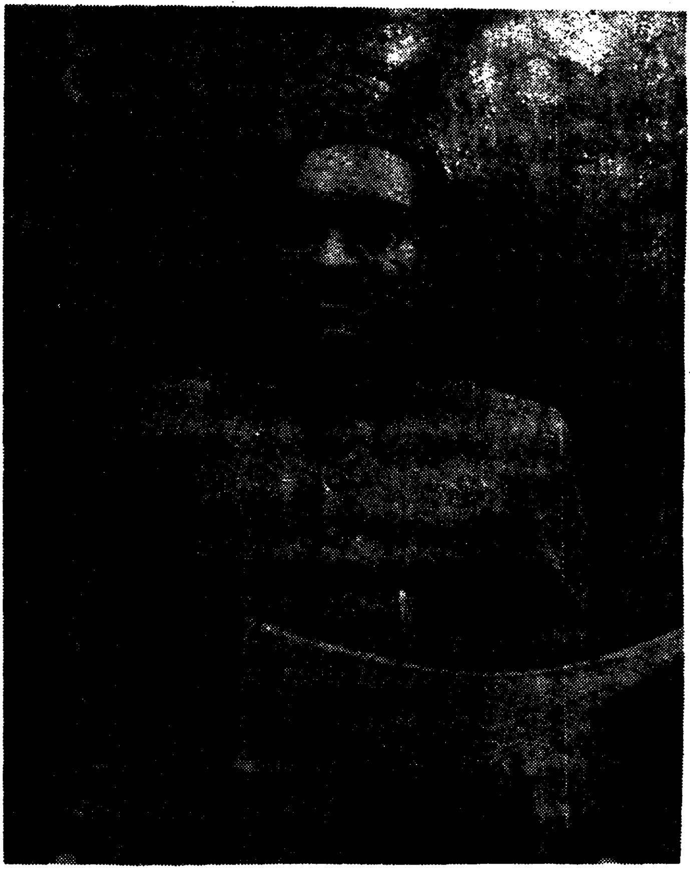

سید فرزند حسن فیضؔ ۱۱ر نومبر ۱۹۱۱ء کو ریاست بھرت پور (راج پوتانہ شرقی) میں متولد ہوئے۔ انگریزی میں میٹرک پاس کیا۔ فارسی کی تعلیم اپنے تایا جناب غضنفر حسین عروجؔ سے حاصل کی۔

فیضؔ صاحب کے مورثِ اعلیٰ جناب حکیم محمد علی مرحوم بزمانہ محمد ابوالمظفر شاہ عالم بادشاہ

شہر کول یعنی علیگڈھ میں منصب قضاء پر مامور تھے ایک مدت کے بعد آپ نے متھرا میں اقامت اختیار کی مہاراجہ بلونت سنگھ والیٔ ریاست بھرتپور نے جو کسی مہلک مرض میں مبتلا تھا حکیم صاحب موصوف کو بغرض علاج بلایا جنکے علاج سے مہاراجہ کو تھوڑے ہی عرصہ میں صحت ہوگئی۔ پس شفا نواز مہاراجہ نے حکیم صاحب کو ایک حویلی اور ایک گاؤں موضع باگلی جو تحصیل خاص بھرت پور میں ہے مع دیگر اعزاز سرداری عطا فرمایا۔ چنانچہ بھرت پور میں رہائش اختیار کی۔

حکیم محمد علی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے خادم حسین جو حکیم حاذق تھے اپنے والد مرحوم کی جگہ بھرت پور کے طبیب خاص مقرر ہوئے انھوں نے ایک شاندار عزا خانہ بنوالیا۔ جو ریاست بھرتپور میں بلحاظ وسعت و آرائش اپنی نظیر آپ تھا۔

حکیم خادم حسین کے بعد ان کے بیٹے حکیم سید اصغر حسین مہاراجہ بھرتپور کے طبیب خاص مقرر ہوئے ان کو حضرت امام حسین علیہ السلام سے بے حد عشق تھا۔ حضرات ذاکرین کو باہر سے بلواتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ اور تکبیر تخلص فرماتے تھے۔ حکیم صاحب موصوف نے ۱۴ اگست ۱۹۰۴ء میں اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ ان کے چار بیٹے سید شمشاد حسین۔ سید مہدی حسن۔ سید آل حسن۔ اور سید اکرام حسین تھے

فیض مرحوم کے والد سید اکرام حسین کلیم ریاست بھرتپور میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ مرثیہ خوانی اور غزل گوئی میں سید شبیر حسین نسیم مرحوم کے شاگرد ہوئے اور عدالت بھرتپور میں سیشن جج کے پیشکار رہے۔

فیض مرحوم کے دادا سید اصغر حسین تکبیر۔ تایا غضنفر حسین عروج تایا سید مصطفیٰ حسین بدر۔ چچا سید موسیٰ رضا شاد اور والد سید اکرام حسین کلیم بھرتپور میں پایہ کے شاعر اور استاذ الاساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان بزرگوں کی صحبت اور روزانہ نشست میں علمی۔ ادبی، فقہی اصناف شعر و سخن۔ تنقید و تبصرہ پر گفتگو میں بیٹھنے اور درس حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا۔ بغایۂ مشاعروں میں شرکت ہوتی تھی۔ فیض مرحوم نے

ابھی شاعری شروع بھی نہ کی تھی کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں بھرتپور میں تباہ کن طغیانی (سیلاب) آیا۔ جس میں زراعت، مویشی، مکانات اور سینکڑوں انسان ہلاک ہو گئے اور پورے شہر کو غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ شہر کی بلند و بالا عمارتوں، مثلاً مساجد اور مندر میں باختلاف مذہب و ملت ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ ایسے حالات میں سادات کرام میں سے کوئی ایک متنفس بھی اپنے ناموس کو لے کر وہاں نہیں گیا۔ پانی شہر بھرت پور میں داخل ہوا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جہاں جہاں سادات کی آبادیاں تھیں پانی ان کے قریب بھی نہ پہنچا۔ اس وقت فیضؔ مرحوم کی عمر بمشکل تیرہ ۱۳ سال تھی کہ اس صورت حال سے متاثر ہو کر چند قطعات کہے۔ جو اس وقت موجود نہیں۔ مگر مفہوم یاد ہے۔ فرمایا کہ پانی کربلا کے بعد ایسا شرمسار ہوا ہے کہ اب سادات کے سامنے آتا ہوا جھینپتا ہے اور منھ چھپاتا ہے۔

بھرتپور میں ماہانہ مشاعرے اور مقاصدے ہوتے تھے جنمیں فیضؔ مرحوم ہمیشہ حصہ لیتے تھے۔ اکثر و بیشتر فی البدیہہ مشاعروں میں بھی حصہ لیا۔ سید موسیٰ رضا صاحب شادؔ اور تایا غضنفر حسین عروجؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ ابتدا میں غزل قصائد۔ سلام۔ نوحے وغیرہ کہے ۱۹۴۷ء میں کراچی آئے اور مرثیہ گوئی شروع کی اور جناب قائمؔ رضا نسیمؔ امروہوی سے فیض تلمذ حاصل کیا۔

کراچی میں ڈاکٹر یاورؔ عباس مرحوم اور "کل پاکستان فروغ مرثیہ" کی جانب سے نو تصنیف مرثیوں کی مجالس میں شرکت کر کے مومنین سے داد تحسین حاصل کی۔ کل ۷۴ مرثیے تصنیف کیے جن میں سے چند شائع ہو کر مومنین کرام تک پہنچ چکے ہیں۔

باقیات الصالحات میں علاوہ مراثی و قصائد کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو بحمداللہ سعادت مند اور برسر روزگار ہیں۔

فیضؔ ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء مطابق ۹ شوال المکرم ۱۴۰۰ھ بروز دوشنبہ بعمر انہتر سال بعارضۂ فالج اس جہان فانی سے کوچ کر کے مالک حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خداوند عالم مرحوم کو جوار ائمہ معصوم علیہم السلام میں جگہ جنت فرمائے آمین۔

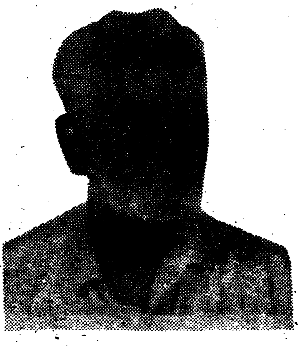

تاثرات و مقالات

حضرت فیض بھرتپوری کی یادگاری مجلہ کیلئے جن ادباء، شعراء، ناقدین اور صاحبانِ علم و دانش نے بہ عجلت ممکنہ اپنے مضامین، نظمیں اور مقالات ہمیں ارسال کیے ہم ان کے بے حد مشکور ہیں۔ ایسی تحریریں اور تاثرات اس باب میں شاملِ اشاعت ہیں —— ان تحریروں میں حضرت فیض بھرتپوری اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے ...

(ادارہ)

مدحتِ شہؐ کے مضامیں سے بھرا ہے سینا
دل کے آئینے پہ یہ پھول ہیں گویا مینا
کیوں جلیں غیر ملی مجھ کو جو چشم بینا
کس کا مقسوم ہوا کس کا مقدر چھینا

درِ حیدرؑ سے ملے ہیں، دُرِ مدحت مجھ کو
قاسمِ خلد نے بخشی ہے یہ قسمت مجھ کو

○ فیض بھرتپوری

پروفیسر کرّار حسینؒ

○

اساتذۂ فن کی تابندہ یادگار، فیضؔ بھرتپوریؒ

حضرت فیضؔ بھرتپوریؒ ایک عظیم انسان اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی رحلت سے ایسا قومی نقصان ہوا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں —— وہ اساتذۂ فن کی تابندہ یادگار تھے۔ ان کی ذات پرانی اقدار اور روایات کا ایسا پیکر تھی جس سے ہماری مخصوص تہذیب آشکار ہے۔ ان کا کلام ادبی محاسن اور فکر کے اعتبار سے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

خداوندِ تعالیٰ، مرحوم کو جوارِ اہلبیت میں جگہ عطا فرمائے!

تاثرات

پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم حمید تقوی

کربِ آگہی کا شاعر فیض بھرتپوری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہولناک اور خوں آشام المیہ اپنے دامن میں ہزارہا قیامت خیز سچے واقعات لیے ہوئے ہے۔ اس دور میں برصغیر کے مسلمان جن منقلب حالات سے دوچار ہوئے، ان کا احاطہ کرنا محال ہے۔ ہر طرف انتشار و خلفشار تھا اور ایک خون کا سیلاب تھا کہ امڈا چلا آتا تھا۔ جہاں روزنِ شب سے مہ و اختر برستے تھے، وہاں غم و اندوہ کی بھیانک تیرگی نے آزادی کے متوالوں کی صبحِ مسرت کو مصلوب کر دیا تھا ـــــ اگرچہ نخلِ آرزو بے ثمر تھا مگر ہر لمحہ سنگ بدست تھا۔ ہر ذی شعور اپنی ہستی کو اس طرح خاک میں ملتا ہوا دیکھ رہا تھا جیسے اشکوں کے گہر کو تپتا ہوا صحرا چاٹ رہا ہو۔ ایسی اضطرابی فضا میں جبکہ فرنگی جبر و استحصال اور ظلم و تشدد سے مسلمانانِ برصغیر بے کسی کے ہولناک دشت میں جھلسے ہوئے درختوں کی مانند نظر آتے تھے، اس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی جرأت و ہمت، صبر و استقامت اور مہر و وفا کا پرچم بلند کرے۔

میر انیس اور مرزا دبیر نے اقتضائے وقت کے تحت مرثیہ کو صرف مصائب تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس صنف میں موضوعات کے اعتبار سے خوشگوار اضافے کیے۔ شہیدانِ کربلا کے آہنی کرداروں کو اس طرح پیش کیا کہ دکھی انسانیت کو ڈھارس ملی۔ شجاعت و جرأت کا درس ملا اور ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار ہوا یعنی قومی شاعری سے قبل ان مرثیہ نگاروں نے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام اور ان کے جانباز رفقاء کے فقید المثال حریت انگیز اور ایمان افروز تذکروں سے نڈھال

قوم کو سہارا دیا ــــ میر انیس اور مرزا دبیر نے بطور خاص واقعات کربلا کو اس طرح پیش کیا کہ ہماری قومی شاعری کی روشن سمت نمائی ہوئی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرثیہ ہی سے متاثر ہو کر اپنی مشہور قومی نظم "مدّو جزرِ اسلام" کے لئے مسدّس کی ہیئت کا انتخاب کیا اور اس کے بعد علّامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز سے قومی شاعری کو فروغ دیا۔ اہل نظر پر مرثیہ کی تہذیبی، معاشرتی اور روحانی افادیت عیاں ہے۔

عصر حاضر میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، علّامہ جمیل مظہری، سیّد آل رضا اور صبا اکبر آبادی نے فنِ مرثیہ کے ارتقاء میں جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں، انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے ــــ قیصر بارہوی، ڈاکٹر سیّد صفدر حسین، یاور عباس، وحید الحسن ہاشمی، شاہد نقوی، امید فاضلی، ساحر لکھنوی، سردار نقوی، شاداں دہلوی اور سیف زلفی کا شمار معتبر مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے ــــ نئی نسل میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے دیکھتے ہی دیکھتے قابلِ ذکر مقام حاصل کیا ہے۔ مجھے ان سے بڑی توقعات ہیں۔ ان کے علاوہ سرفراز ابد، نیر اسعدی اور عارف امام بھی عمدہ مرثیہ نگار ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے!

جناب فیض بھرت پوری مرحوم کو فنِ شاعری میں مہارت حاصل تھی، اگرچہ انہوں نے غزلیں بھی کہیں مگر ان کی وجہ شہرت مرثیہ نگاری ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں ظلم و جبر کے المناک واقعات کو کربلا کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے ثبات و استقامت کی تلقین کی ہے۔ مظلومیت کے رخِ زیبا کی شفق رنگ سرخی قارئین کے لئے دل افروز ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی اور تہذیب کے آفاقی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے صحت مند معاشرتی فضا قائم کرنے کی سعی کامگار کی ــــ بالفاظِ دیگر ان کی مرثیہ نگاری واقعات کربلا کی روشنی میں سماجی شعور کی شارح ہوتے ہوئے ایک شائستہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی فکر میں ارضی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی عمل کے امتزاج سے ایسا مہذب رچاؤ پیدا ہوا جس کی بدولت انہوں نے ممتاز مقام حاصل کیا۔

فیض بھرت پوری مرحوم اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ایک اعلیٰ فنکار جب روحِ عصر کو اپنے افکار میں مقیّد کرتا ہے تو وہ حیات کی پیچیدگیوں اور بہت سی اجنبی اور بعض متضاد کیفیات کو اکائی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ کرب و انبساط کے داعیوں کو فکری پیمانے کے ذریعہ اس طرح

پیش کرتا ہے کہ چشمِ نگراں سے زیادہ روحِ انساں متاثر ہوتی ہے اور آگہی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کربِ آگہی کا زخم کسی دروازے کی طرح نہیں ہوتا ہے کہ جسے کسی طرح مقفل کیا جاسکے بلکہ یہ زخم تو آغوش کشا رہتا ہے جسے بصیرت کی صبا تر و تازہ رکھتی ہے اور اس کی شگفتگی سے شعور و ادراک کی رعنائیاں فزوں تر ہوجاتی ہیں ـــــــ فیض کی شاعری کربِ آگہی سے عبارت ہے۔ ان کا ذہنی سفر، کرب اور سنگینیٔ حالات کے شعور کے باوجود رجائیت کے مفہوم سے ہمکنار ہے۔ انہوں نے انسانی حقوق کی بازیافت، حیاتِ ابدی کے خوش نما اور دلآویز پیکر کے سرمدی عناصر کی جلوہ گری کے حوالے سے کی اور اس کا قابلِ ذکر ابلاغ بھی کیا۔ وہ عصرِ حاضر کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے احساس کی روشنی اور شعور کی بالیدگی کے سبب اپنے عصری انتشار و اضطراب کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایسی سمت نمائی کی ہے جو اخلاقی قدروں سے عبارت ہے۔ فکری توانائی اور ذہنی پختگی کی وجہ سے ان کے مرثیوں میں زندگی کی حقیقتیں بے ساختہ در آئی ہیں ـــــــ ان کی ژرف نگاہی اور عمیق تجربات سے ان کے مرثیے معاشرتی روابط کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔ مزاج کے طور پر وہ روایت پرست اور رجعت پسند ضرور تھے مگر ان کی طبیعت میں جدت طرازی اور روانی کی کمی بھی نہیں تھی ـــــــ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں جذبے کی فراوانی تھی مگر وہ اس خوبی کو مقصدیت سے برتر نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے جذبوں کو آفاقیت کی آنچ سے گرماتے ہوئے اپنے فن کو سنوارا ہے۔ ان کے مرثیے تطہیرِ نفس اور اوصافِ حمیدہ سے متعلق مضامین سے آراستہ ہیں اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیضی مرحوم نے اپنے افکارِ عالیہ سے تعلیماتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی ترویج و اشاعت میں گرانقدر حصہ لیا ہے۔

فیضی بحر تور کی بحیثیت انسان بھی اپنے اوصاف کے سبب مقبول رہے۔ محبت و یگانگت اور عجز و انکسار کی صفات ان کے خمیر میں داخل تھیں۔ ہر شخص سے بڑے خلوص سے مل کر دل میں جگہ پاتے تھے اور وضع داری کا انہیں ہمیشہ پاس رہتا تھا ـــــ میرے ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ میں نے انہیں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ایک عظیم انسان پایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی یادیں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے اٹھ جانے سے ہم ایک عمدہ شاعر اور مخلص انسان سے محروم ہوگئے۔

سید محمد تقی

اور — فیض بھرتپوری بھی ۔۔۔!

یہ سن کر میں دھک سے رہ گیا کہ فیض بھرتپوری انتقال کر گئے۔ دو چار دن نہ سہی، چلئے ماضیٔ قریب نہ سہی۔ ماضیٔ متوسط میں جب میں نے ان سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا تو وہ بجھے بجھے تو ضرور نظر آئے تاہم یہ بات تو میں سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ فیض صاحب رلتے ہی جلد ہی ہم سے جدا ہو جائیں گے وہ تو مسالموں اور مراثی کی محفلوں اور مجلسوں کی جان تھے۔ اب ان محفلوں کا کیا ہوگا۔ اب یہ کمی کیسے پوری ہوگی۔ مرثیہ کہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں جب کسی سے مرثیہ لکھنے کی خواہش یا اصرار کیا جاتا ہے فیض نے نظم کی مختلف اصناف میں اپنی فنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی

قدرت کلام کو ہر وہ شخص تسلیم کرے گا جس نے ان کے ادبی سرمائے کا سرسری سا جائزہ بھی لیا ہو۔ اعلیٰ ادب مسائلِ حیات و کائنات اور تجربوں کی نئی جہتیں دریافت یا محسوس کرنے کا نام ہے۔ فیضؔ کے یہاں نئے احساس کے دریافت کی یہ صلاحیت کس انداز میں ملتی ہے اس کی ایک جھلک مثلاً اس رباعی میں موجود ہے۔ جو حضرت علی اکبرؑ کی شان میں کہی گئی ہے۔ رباعی یہ ہے۔

کہاں ہے فیضؔ میں طاقت ثنائے اکبرؑ کی
ہوا نہ ہوگا زمانہ میں اس طرح کا جری
جہاں فرس سے گرے تھے وہاں سے خیمے تک
رگڑ کے ایڑیاں تاریخ کربلا لکھ دی

آخری مصرع آپ نے دیکھا کس نئی جہت سے کہا گیا ہے۔ احساس کے ان مختلف الابعاد مثالیں ان کے مراثی۔ نوحوں اور سلاموں میں بار بار ملتی ہیں۔ جو اس بات کی ضمانت دیتی ہیں کہ وہ معاشرے پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں جو مدتوں فیضؔ کی جودتِ تخیل کو خراجِ عقیدت پیش کرتا رہے گا لیکن میں ان مختصر سے معروضات کو ختم کرنے سے پہلے اُن کے لائق صاحبزادے سید باقر زیدی کے اس کارنامے پر ادبی حلقوں کی طرف سے شکریہ ادا کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جو انھوں نے حضرت نجم آفندی کے بارے میں ایک اینتھالوجی مرتب کر کے سرانجام دیا ہے۔ نجم آفندی ایک تہذیبی دور ایک ادبی عہد کا نام ہے اس لئے ان کی یاد کو زندہ رکھنا ایک معاشرتی فرض ہے جسے باقر زیدی نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ پورا کیا ہے۔ بزمِ نجم آفندی بھی قابلِ داد ہے کہ اُس نے اس مشن کی تکمیل کی۔ نجم کی یاد کو زندہ رکھنا ان سب کا فرض ہے جو تہذیب کی اعلیٰ قدروں سے محبت رکھتے ہیں اور جنہیں اس خاندان کی بارگاہ میں عقیدت اور مودت کا اعزاز حاصل ہے جو نسلِ انسانی میں خیر اور پاکیزگی کے سب سے بلند تر مرکز اور پناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

فیض بھرتپوری

صبا اکبرآبادی

○

جناب فیض بھرت پوری مرحوم و مغفور کے بارہ مرثیے "مراثی فیض" کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان پر پروفیسر منظور حسین شور، جناب طالب جوہری اور جناب ضمیر اختر لکھنوی نے اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس پر مزید اضافے کی بظاہر کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ جو کچھ ان حضرات نے لکھا ہے وہ تمام مراثی پر احاطہ کرتا ہے۔

——— اکبرآباد (آگرہ) کے شعراء بالعموم اپنی عقیدت کا اظہار سلام اور نوحے لکھ کر کیا کرتے تھے البتہ کچھ مخصوص حضرات مسدس مرثیہ بھی تصنیف کرتے تھے اور مخصوص مجالس میں پڑھواتے تھے ——— اس کے برعکس بھرسر اور ڈیگ اور بھرتپور خاص میں مرثیہ گوئی کا فن عام تھا۔

فیض بھرت پوری مرحوم بھی ایک ایسے ہی خاندان کے چشم و چراغ تھے جس میں مرثیہ گوئی کا فن رائج تھا، مگر فیض صاحب اس طرف بہت دیر میں متوجہ ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں پہلا مرثیہ تصنیف کیا جو بہت کامیاب ہوا۔ اس کے بعد ؏

سمندِ شوق پر اک اور تازیانہ ہوا

انہوں نے باقاعدہ مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی اور مولانا نسیم امروہوی سے تلمذ حاصل کیا۔ ان تمام مرثیوں کو دوازدہ آئمہ کی مناسبت سے بارہ مرثیوں کی صورت میں ان کے فرزند جناب جعفر زیدی نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا۔

یہ مرثیے فیض صاحب کی قوتِ کلام اور حسنِ عقیدت کے آئینہ دار ہیں جو مرثیے کے تمام اجزاء پر محیط ہیں۔ فضائل، گریہ، منظر کشی، جنگ، گھوڑا، تلوار اور ثنائی مضامین سے آراستہ ہیں ——— مجھے یقین ہے کہ یہ مرثیے اربابِ عقیدت میں ذوق و شوق سے پڑھے جائیں گے اور مقبولیت کا درجہ حاصل کریں گے۔

سید وحید الحسن ہاشمی

فیضؔ بھرت پوری کا فن

سنہ ۱۹۷۴ء کا ذکر ہے کہ میں کراچی کے رضویہ امام باڑے میں مرثیہ پڑھنے گیا کراچی کے سبھی مرثیہ گو مجلس میں شریک تھے نماز مغرب سے قبل مجلس ختم ہوگئی رات کو میں ایک عزیز سے ملنے انچولی گیا مکان کے ایک کمرے میں کوئی صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے اور مومنین انھیں داد سے نواز رہے تھے سب سے پہلی بیت جو مجھے سننے کو ملی یہ تھی -

لائی ہیں غیب سے اسرارِ ہدایت زینبؑ
کربلا میں ہوئی نازل وہ ہیں آیت زینبؑ

غیب سے اسرار اور ہدایت کا قافیہ آیت سن کر میں مجلس میں بیٹھ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صاحبِ منبر فیضؔ بھرتپوری ہیں سلام دعا کے بعد میں تو لاہور آکر بیمار پڑ گیا اور فیضؔ (مرحوم) اپنے مشاغل میں ایسے محو ہوئے کہ مجھے بھول گئے۔ پندرہ سال کے بعد مارچ سنہ ۱۹۸۹ء میں مرحوم کی حالت زیادہ خراب ہوئی میں ان کی عیادت کے لئے کراچی پہنچا مجھے دیکھا تو پہچان گئے اپنے پاس بٹھایا چائے پلائی مراثی فیضؔ جلد دوم کا ایک نسخہ عطا فرمایا اور اس نگاہ سے رخصت کیا گویا کہہ رہے تھے یہی آخری ملاقات ہے ان کے انتقال کی خبر نے دل پریشان اور ذہن پراگندہ کردیا سوچتا ہوں کراچی کی زمین نے کیسے کیسے گوہر نایاب اپنی گود میں جمع کرلئے۔
فیضؔ بھرتپوری زندہ شاعر ہیں ان کے کلام کی روانی دیکھ کر علی میاں کاملؔ لکھنوی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے وہی مصرعوں کی چستی وہی الفاظ کی بندش اور بیتوں کا وہی انداز۔ کامل لکھنوی مقتل میں حضرت عباسؑ

کی حالت کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں۔

غصّا تھا یہ کہ سرخ ہوا چہرۂ جری،
آیا غضب میں سروِ خرامان حیدری
فوجوں کے دست و پا میں پڑی ڈر سے تھرتھری
چشمِ حباب میں نہ رہی خوف سے تری
نعرہ کیا جو شیر زباں نے کچھار میں
گرداب ڈر سے بیٹھ گئی آبشار میں

اب ذرا فیضؔ مرحوم کے قلم کی نزاکت ملاحظہ ہو۔

تلوار چل رہی تھی جو فوجوں پہ سربسر
زخموں کے پھول کھلتے تھے گلنار جسم پر،
کٹ کٹ کے پھول ڈھالوں کے بکھرے اِدھر اُدھر
مقتل میں باغ کا تھا سماں تا حدِ نظر
دھوکا زمینِ دشت پہ تھا لالہ زار کا،
لطف آرہا تھا فصلِ خزاں میں بہار کا

میں نے فیضؔ مرحوم کا کلام بڑے غور اور بڑی احتیاط سے پڑھا ہے ان کے سارے کلام کا عطر اگر پیش کیا جائے تو یہ چار لفظ خوشبو کی طرح محسوس ہوتے ہیں (۱) انسان (۲) زندگی (۳) تحرّک (۴) درد۔

اگرچہ مرحوم نے انسان کے بارے میں کوئی مخصوص مرثیہ نہیں کہا لیکن انھوں نے جن انسانوں کا تذکرہ مرثیوں میں کیا ہے ان کے حالات ان کے خیالات اور ان کے کمالات پڑھ کر خود شاعر کے نظریئے کا اندازہ ہو جاتا ہے پیمبروں، اماموں، ولیوں، اور شہیدوں سے قطع نظر فیضؔ نے عام انسانوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً

مقابلہ اور مسابقت ایک ایسا فطری فعل ہے جس کی للک ہر شخص کے دل میں پائی جاتی ہے۔

یہ اک امنگ بھی جزوِ خمیرِ انساں ہے،
کہ ہر بشر سبقت کا عمل میں خواہاں ہے،

مقابلے کا یہ عمل انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لیجاتا ہے لیکن شاعر کو یہاں ایک خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ مقابلے کا عمل بدی میں بھی ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے آج بھی ریس کے گھوڑوں میں مقابلے ہو رہے ہیں آج بھی بڑی بڑی عمارتیں اور محل بنانے کے مقابلے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے روحِ انسانیت سسک رہی ہے فیضؔ اس منزل سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جذبۂ مسابقت بہتر ہے لیکن اس کا رخ خیر کی جانب ہونا چاہیئے اگر خیر میں مقابلہ ہوگا تو ذہن انسانی ارتقا پذیر ہوگا اور انجام بھی نیک ہوگا اور اگر شر میں مقابلہ ہوگا تو معاشرہ ذلت کی طرف رواں دواں ہوگا اور انجام بد ہوگا۔

مسابقت سے ترقی کا ذوق عام ہوا،
یہ ذوق وہ ہے بشر جس سے نیک نام ہوا

فیضؔ اچھے اور برے انسان کے بھی قائل ہیں برے لوگ وہ ہیں جو دنیا میں زندہ رہے اپنے لئے جیتے رہے اور اپنے لئے مر گئے ان کی ساری زندگی بے سود رہی اگر ان کا ایک بھی عمل یادگار ہوتا تو بعد کے آنے والے انھیں یاد رکھتے مگر انھوں نے کام کو اہمیت ہی نہ دی نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ان کے برعکس کچھ ایسے بھی اصحاب ہیں جو اگرچہ دولت مند نہ تھے ان کے ذرائع مسدود تھے ان کے وسائل زیادہ نہ تھے پھر بھی انھوں نے نیک عمل کئے عوام

کی برتری اور بہتری کے لئے اپنی جانیں دے دیں آج ساری دنیا ایسے لوگوں کی پرستار ہے اور ان کے نام چاردانگ عالم میں سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔

وہ مر گئے مگر اب ان کا کام زندہ ہے
یہ کام کی برکت ہے کہ نام زندہ ہے،

جناب حرؑ کے مرثیے میں فیض نے اچھے اور برے انسانوں کا بے مثال نقشہ کھینچا ہے جناب حرؑ نیکی کے نمائندے ہیں اور ابن سعد بدی کا پرستار نیک انسان فطرۃً آزاد ہوتے ہیں وہ فتنہ دباتے ہیں فتنہ برپا نہیں کرتے لیکن بدکردار انسان فتنہ جو اور فتنہ گر ہوتے ہیں وہ حرص وہوس کے اسیر ہوتے ہیں اور لوگوں کو دھوکا دینے سے باز نہیں آسکتے بدکردار انسان کتنا ہی امیرو کبیر اور با اثر ہوجائے مردِ حق پرست اور مردِ آزاد کو اپنے دام فریب میں نہیں لا سکتا۔ جناب حرؑ کہتے ہیں کہ میں اب حسینی کیمپ میں جارہا ہوں اگر تجھ میں دم ہے تو روک لے۔

ﮧ فتنہ گر کام نہیں چلنے کا اب دھوکے سے
مردِ آزاد بھی رکتے ہیں کہیں روکے سے
ﮧ نفس پرور کوئی انسان تو نہیں ہوسکتا
مال وزر حاصل ایماں تو نہیں ہوسکتا،

انسانی عظمت کے ساتھ فیض کے یہاں انسانی زندگی کا بھی ایک تصور ہے ان کے مطابق زندگی کھیل نہیں اسکی ایک غرض ہے یہ بیکار نہیں خلق ہوئی دنیا میں زندگی اپنی بقا کے لئے کوشاں ہے فیض موت کے لئے زندگی اور زندگی کے لئے موت میں بہت فرق محسوس کرتے ہیں ان کے خیال میں ہر شخص بقائی زندگی کے لئے اپنا دل اور

اپنا دماغ جلا رہا ہے۔

یہ زندگی میں تنازع جو ہے بقا کے لئے
دماغ لڑتے ہیں تکمیل مدعا کے لئے

دنیا میں ہر آدمی کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اپنی بقا کے لئے کوشاں ہے اس دوڑ میں کروڑوں انسان شریک ہیں یہی جدو جہد دراصل ارتقا کی جانب پہلا قدم ہے۔

یہ اہتمام ہی وہ ارتقا کا زینہ ہے،
جو زندگی میں حصول بقا کا زینہ ہے

دنیا کو سمجھانے کے لئے فیض نے زندگی کی تین منزلیں ترتیب دی ہیں جن میں منزل پیری بہت اہم ہے پیری ہی کے بعد انسان کی اصل زندگی اور موت کا فلسفہ معلوم ہوتا ہے پیری کے بعد آدمی مٹی میں دفن ہو جاتا ہے مگر اس کے کارنامے اس کے افکار اسے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتے ہیں۔

ہے زندگی کے لئے لعل بے بہا پیری
کہ بچپنا تو ہے آغاز انتہا پیری!!!

شباب بھی زندگی ہی کا ایک رخ ہے مگر فیض شباب کو گمراہ کن اور خودسر قرار دیتے ہیں۔

یہ دم کے ساتھ ہے وہ جزوِ زندگانی ہے
وہ خودسری کی بزرگی کی یہ نشانی ہے۔

تمام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فیض عقیدتاً کربلا نواز ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کربلا فیض کے فلسفۂ زندگی کا ایک حصہ ہے کربلا انھیں اس لئے عزیز ہے کہ یہاں ان کے فلسفۂ حیات کی تعبیر ملتی ہے فیض نے زندگی میں موت کے بہت سے کرشمے دیکھے ہیں لیکن موت میں زندگی کے آثار انھیں صرف

اور صرف کربلا ہی میں ملے ۔ کربلا والے مرثیئے میں کہتے ہیں ۔

زندوں کو جس زمین پہ نہ دم بھر اماں ملی
مُردوں کو اس میں زندگیِ جاوداں ملی

فیض حسینؑ اور حسینؑ والوں سے واقف ہیں حسینؑ نے کربلا میں ۔ زندگی کا فلسفہ ہی تبدیل کردیا تھا حسین کا یہ نعرہ تھا کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے فیض نے اسی نعرے کو اپنایا اور تمام کلام میں انکا یہی عقیدہ جاری وساری ہے ۔ یہی نظریۂ زندگی مولا علیؑ کی محبت کے سلسلے میں مضمر ہے انھیں علیؑ سے اس لئے محبت ہے کہ علیؑ کی زندگی تو د ان کے قول کے مطابق کامیاب زندگی تھی ۔ فیض یہ چاہتے ہیں علیؑ کے ماننے والے بھی ایسی ہی زندگی بسر کریں جیسی زندگی مولا علیؑ نے بسر کی ۔ فیض کو جمود سے نفرت ہے انھوں نے کسی جامد شے کی تعریف نہیں کی وہ چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی بوجھل ہو کر نہ رہ جائے حرکت کائنات کے ذرہ ذرہ میں پائی جاتی ہے اگر زندگی تغیر پذیر نہ رہی تو دنیا سے مٹ جائیگی اور اس کی جگہ کوئی دوسری شے لے لیگی گویا حرکت زندگی کا نام ہے اور جمود موت کا ۔ فیض نے اس سلسلے میں کوئی واضع اصول وضع نہیں کئے لیکن کتاب کے ہر صفحے پر ایسے الفاظ ایسے محاورے اور ایسی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں جنھیں دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھیں حرکت سے خاص دلچسپی ہے اور حرکت زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے ذیل میں چند اشعار دیئے جارہے ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ شعوری یالاشعوری طور پر فیض حرکت پسند ہیں ۔

- گھوڑے بھڑک بھڑک کے یکایک جو پھر پڑے
  کتنے سوار ٹھوکریں کھا کھا کے گر پڑے
- تیرنے والوں کو ساحل سے لگا دیتا ہے
  ڈوبنے والوں کو آغوش میں لے لیتا ہے

آپ کی ہو جو اجازت تو کھلے سر نکلوں
جلتے خیمے ہی میں جل جاؤں کہ باہر نکلوں

جس سمت باگ اشہب خامہ کی موڑ دی
ہر پنجہ کش کی بڑھ کے کلائی مروڑ دی ،

آتے نہیں اگر مری امداد کے لئے
پھر میں نجف کو جاتی ہوں فریاد کے لئے

دم بدم آیۂ نصرت کو جو وجد آنے لگا
شوق میں رایت اسلام بھی لہرانے لگا

سن کے یہ حکم ید اللہ جو توسن پہ چڑھے
مچ گیا شور کہ ہٹ جاؤ علیؑ رن پہ چڑھے

در کو جھٹکا جو دیا جن و بشر کانپ گئے
رن سے جبرئیل بہت دور تھے پر کانپ گئے

واں بڑی جنگ ہوئی تب در خیبر اکھڑا،
یاں زباں ہونٹوں پہ پھیری کہ لشکر اُلٹا

اُوپر کی مثالوں میں بھڑک بھڑک ، ٹھوکریں کھا کھا ، گر پڑے تیر نے ڈوبنے ، نکلوں ، جلتے خیمے ، چلی جاؤں ، باہر نکلوں ، موڑ دی ، مروڑ دی ، آتے ، جاتی ہوں ، وجد آنے لگا ، لہرانے لگا ، چڑھے شور مچ گیا ، ہٹ جاؤ ، رن پہ چڑھے ، جھٹکا ، کانپ گئے ، پر کانپ گئے ، جنگ ہوئی ، اکھڑا ، زباں پھیری ، لشکر الٹا وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں حرکت پائی جاتی ہے اسی قبیل کے ہزارہا الفاظ کا استعمال شاعر کے نظریۂ فن اور نظریۂ زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے پتہ چلا ہے کہ مرحوم کی زندگی بھی مجاہدانہ تھی اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے جب تک کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ جاتا تھا۔

ہمیں مرثیہ گویوں میں ایسے شاعر کم ملینگے جن کی زندگی اور فن میں تصادم ہو نہ دوری اس لئے بے دھڑک کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی زندگی فن اور فیض کا فن زندگی تھا۔

زندگی اپنے پہلو میں کچھ درد کی کیفیت بھی رکھتی ہے وہ درد جو انسان کو یاس یا نا امیدی کی طرف لیجاتا ہے اس کا تعلق بڑی شاعری سے ہے لیکن ایک درد وہ ہے جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس درد میں جاہ و جلال ہے تمکنت ہے اور سب سے بڑی بات حق کی پاسداری ہے اگر درد میں سچائی ہے تو دوسرا انسان مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا فیض نے اپنے غم کو غم آل محمدؐ میں مدغم کر لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں غم کی جتنی وارداتیں بیان کی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انیسؔ کی طرح انھوں نے انکا مشاہدہ کیا ہے۔

حیات انسانی میں کم سن پسر کا داغ اٹھانا قلعہ خیبر کے اٹھانے کے برابر ہے فیضؔ نے ایک شش ماہے بچے کے غم میں ماں باپ کی جو حالت ہوئی اسکا اظہار بڑی دردمندی سے کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ شاعر کے سامنے گذرا ہے۔

بس اسی فکر و تردد میں کئے گردن خم
خیمے کی سمت بڑھے جاتے تھے سلطان امم
ناگہاں سوچ تھاں کو کھ جلی کا عالم
رک گئے راہ میں پیچھے کو ہٹے سات قدم
دل پکارا کہ بس اب یاں سے نہ گھر جائینگے
پھر یہ سوچا کہ نہ جائیں تو کدھر جائیں گے
حرکت دل کی ہوئی تیز رُکے شاہ امم
کبھی خیمے کو کبھی لاش کو دیکھا بہم

تھا تصور کے تلاطم میں عجب کچھ عالم،
آگے بڑھ جاتے تھے پھر پیچھے کو ہٹتے تھے قدم
لاکھ صدموں میں یہ صدمہ نہ سہا جاتا تھا۔
نہ چلا جاتا تھا آگے نہ رہا جاتا تھا،،

درد ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں جو تھوڑا بہت غم مرثیے میں آیا ہے وہ شاعروں کی آپ بیتی ہے جسے انہوں نے جگ بیتی بنا دیا ہے۔ نسیم امروہوی نے علیؑ اکبر کی موت اور لاش اُٹھانے کے موقعے پر جناب عباسؑ کا ذکر یوں کیا ہے۔

عباسؑ تم فرات پہ سوتے ہو چین سے
اکبرؑ کی لاش اُٹھ نہیں سکتی حسینؑ سے

فیض بھرتپوری نے اسی موقع کی درج ذیل بیت کہی ہے۔

ہے کمر پہ یہ جواں لال کا لاشا بھائی
لیکے تابوت پسر جاتا ہوں تنہا بھائی

اسی طرح جناب زینبؑ کے سامنے ان کے دونوں بیٹوں کی لاشیں رکھی ہیں اور وہ مندرجہ ذیل درد بھرے الفاظ ادا کر رہی ہیں۔

چھوڑ کر یاں مجھے غربت میں کہاں جاتے ہو آہ
خادمہ جان کے لے لو مجھے اپنے ہمراہ
دل سے خدمت میں شب و روز کرونگی واللہ
دین اسلامؐ میں کوتاہئ خدمت ہے گناہ
کیوں خفا مجھ سے ہو کیوں دل میرا تڑپاتے ہو
جس نے دکھ جھیل کے پالا اسے رلواتے ہو

بعض حضرات یہ سمجھینگے کہ اس قسم کے اشعار تو ہر مرثیہ کے آخر میں ہوتے ہیں مرثیے کا آخری جزو بین ہوتا ہے اس لئے تمام مرثیہ گو اس حصے

میں بینیہ انداز اختیار کرتے ہیں یہ صحیح ہے مگر فیضؔ کے یہاں صرف بیانیہ انداز میں درد جلوہ گر نہیں ہوتا بلکہ ان کے مرثیوں میں انسانی درد اور قومی درد بھی پایا جاتا ہے فیضؔ محبِ حسینؑ والوں کے افعال اور اعمال پر نظر کرتے ہیں تو ان کے دل پر زبردست چوٹ لگتی ہے کتنے افسوس کا مقام ہے کہ مرثیہ گو شعرا ثواب کی خاطر مرثیہ کہتے ہیں لیکن اپنے مرثیوں میں اپنے ہم عصروں پر چوٹیں کرتے ہیں نہ ان کی مجالس میں شرکت کرتے ہیں نہ دوسروں کو شریک ہونے دیتے اس مقام پر فیضؔ کا درد الفاظ کی شکل میں یوں نمودار ہوتا ہے۔

نگاہ عدل سے دیکھیں بغور اہل نظر،
مسابقت میں یہ باتیں نہ ہوں تو ہے بہتر
عروج مرثیہ گوئی اگر ہے پیش نظر،
تو ایک دوسرے کے مرثیئے سنیں آکر،
زباں سے کچھ نہ کسی کے خلاف گروہ کے کہیں
ہم ان سے بڑھ کر کہیں اور وہ ہم سے بڑھ کر کہیں
ملیں جو دل تو دلوں میں اک انقلاب آئے
بہار مرثیہ گوئی بہ آب و تاب آئے،
وہ دور نیک بہ تائید بوتراب آئے
اُبھر کے گوشۂ مغرب سے آفتاب آئے
یہ نظم کوئی حکومت نہیں جو ختم ہوئی،
یہ مرثیہ ہے نبوت نہیں جو ختم ہوئی،

میں نے فیضؔ بھرتپوری کا یہ ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا ہے اُمید کرتا ہوں کہ دوسرے احباب جو مجھ سے زیادہ فیضؔ کے نزدیک رہے ہیں فیضؔ کے فن اور انکی شخصیت پر خامہ فرسائی کرینگے۔ زندگی نے ساتھ دیا تو مرحوم کے بارے میں کچھ اور باتیں اہل نظر کے سامنے پیش کروں گا۔

حجۃ الاسلام علامہ سید رضی جعفر نقوی

آہ تاجدارِ اقلیم شعر و سخن حضرت فیض بھرت پوریؒ

تاجدار اقلیم شعر و سخن۔ مداح اہلبیت جناب سید فرزند حسن "فیض بھرت پوری" علی اللہ مقامہٗ اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم اردو ادب کے لئے ایک ایسا مایۂ ناز سرمایہ تھے جن پر محفل شعر و سخن برسہا برس گریہ کناں رہے گی۔ کیونکہ ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں برسہا برس میں منصۂ شہود پر آتی ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مرحوم اُن ہی "دیدہ ور" ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی کا نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ عروسِ ادب کے گیسوؤں کو سنوارتے ہوئے گزرا ہے۔

آپ ہندوستان کی مشہور ریاست بھرت پور کی معزز شخصیت جناب سید اکرام حسین کلیم بھرت پوری کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا اصلی نام سید فرزند حسن تھا لیکن دنیا بھر کے صاحبان علم و دانش آپ کو "سید فرزند حسن" کے نام سے بہت کم جانتے تھے اور "فیض" کے نام سے نہ صرف برصغیر میں آپ کی شخصیت صف اول کے شعراء میں جگمگاتی نظر آتی ہے بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی آپ کے قدردانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور یقیناً یہ سب کچھ "فیض" ہے اُس خاندانِ رسالت کا جسکی مدح و ثنا کو آپ نے اپنے لئے متاعِ حیات قرار دیا اور نہ صفحۂ ہستی پر قدم رکھنے والے کروڑوں اربوں افراد کی طرح آپکا نام بھی

تاریخ کی گرد میں چھپ جاتا۔ لیکن چونکہ آپ نے اپنی شخصیت کو اُس "چشمۂ فیض" میں جذب کر دیا جو حیاتِ جاوداں کا مالک ہے اس لئے جبتک آپکی تخلیقات سے اربابِ علم و دانش فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ آپکا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔

یوں تو آپ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں گرانقدر جواہر پارے چھوڑے ہیں لیکن "مرثیہ" کے باب میں آپکا انداز سب سے منفرد نظر آتا ہے۔

آپ کے مرثیوں کا پہلا مجموعہ "مراثیٔ فیضؔ" کے نام سے تقریباً بیس برس قبل شائع ہوا جو شہزادہ علی اصغر، جناب ابوالفضل العباس، جناب حُر، اور سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے حالات پر مشتمل مراثی کا مجموعہ ہے لیکن ان مرثیوں کی اشاعت سے قبل آپ نے "مُعبری" کے اُن شہدائے راہ خدا کا مرثیہ تحریر فرمایا، جو ۱۹۶۳ء کے المناک سانحہ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اُس دورِ آمریت میں جب زبانوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے اور کسی کو حکومت وقت کی طرف سے ان شہدا کا نام لینے کی بھی اجازت نہیں تھی، جناب فیضؔ بھرپوری نے نہایت جرأت و شجاعت کے ساتھ ایک ایک شہید کا نام اُس مرثیے کے اندر شامل کیا۔ جو تاریخ ظلم "گنج شہیداں" کے نام سے شائع ہوا۔ فرماتے ہیں۔

تاریخِ ظلم لکھ کر رہے یہ بھی یادگار
اشکِ غمِ حسین سے دل کا دُھلے غبار
سینہ زنی سے چاک گریباں ہو تار تار
جانِ نبی کے غم میں نہ دل کو رہے قرار

اس داستانِ غم کے بیاں میں وہ زور ہو
آہ و فغاں کا گنجِ شہیداں میں شور ہو

آپ نے اس مرثیہ کے اندر حالات کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ تمام واقعات کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔
شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر میں جناب میر انیس کی تعریف و توصیف کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ۔

دوسرے شعراء کسی واقعہ کی صرف منظر نگاری کرتے ہیں، لیکن جناب میر انیس اس منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا سننے والوں کو خود اس معرکۂ کارزار میں پہونچا دیتے ہیں۔

اور فیض صاحب کے اس مرثیے کے متعدد بند اسی خصوصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

سادات بھوکے پیاسے تھے عشرہ کا روز تھا
ہر شخص تھا حسین کے غم میں پریشاں
پڑھتا تھا کوئی نوحہ کوئی کرتا تھا بُکا
اس وقت ظلم کی ہوئی ، ناگاہ ابتدا

فطرت حسد نے عقل کچھ ایسی بگاڑ دی
تخریب کار قوم نے بستی اجاڑ دی

آگے چل کر فرماتے ہیں

تھے سب وہ گلبدن چمن مصطفےٰ کے پھول
ان کا لہو بہا کے ، عمل ہوگا کچھ قبول؟
پھر کیا کہو گے حشر میں پوچھیں گی گر بتول
کیوں مارا بے گناہوں کو اے فرقۂ جہول

روز جزا جو حق کی عدالت میں جاؤ گے
جس کے ہو کلمہ گو اُسے کیا منہ دکھاؤ گے

اس مرثیے کے اندر آپ نے بھیری کے اس المناک سانحہ میں شہید ہونے والے اُن تمام جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کے نام اشعار کا جز بنا دیئے ہیں جن کے اسمائے گرامی آپ کو موصول ہو سکے۔ اس لحاظ سے یہ مرثیہ "واقعہ بھیری" کی ایک منفرد تاریخ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

آج سے دس برس قبل ۱۹۹۰ء؁ (۱۴۱۰ھ) میں آپ کے مرثیوں کے مجموعہ "مراثی فیض" کی دوسری جلد منظر عام پر آئی۔ جو "۱۲" مرثیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی ان

کی اہلبیت سے عقیدت و محبت کی ایک ادا ہے کہ پہلا مجموعہ "۵" مرثیوں پر مشتمل تھا، دوسرا "۱۲" مرثیوں پر اور کیوں نہ ہو۔ جب کہ آپ کی ساری زندگی کائنات کی مقدس ترین ۵ ہستیوں اور بارہ اماموں کی مدح و ثنا میں صرف ہوئی ۔جیسا کہ فرماتے ہیں ۔

مدحتِ شہ کے مضامین سے بھرا ہے سینہ
دل کے آئینہ پہ یہ پھول ہیں گویا مینا
کیوں جلیں غیر، ملی مجھ کو جو چشمِ بینا
کس کا مقسوم لیا ؟ کس کا مقدر چھینا
درِ حیدر سے ملے ہیں دُرِ رحمت مجھ کو
قاسمِ خلد نے بخشی ہے یہ قسمت مجھ کو

اور پھر ہر مرثیے میں مضامین کو ایسی سادگی اور چاشنی کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے گویا ایک آبشار ہے جو ہلکی لہروں کے ساتھ گر رہا ہے اور پورے ماحول کو خوشگوار بنا رہا ہے۔ ایک جگہ پانی کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

مختلف نام ہیں پانی کے سبب ہی حسبِ محل
یہ فضاؤں میں ہے شبنم تو فلک پہ ہو بادل
خاک پر ہو تو ہے زم زم کہ نہیں اس کا بدل
چرخ پر ہو تو ہے کوثر کہ جو صد رشکِ عسل
ایک وہ آب ہے رحمت کی جو بوچھار میں ہے
ایک وہ ہے جو یداللہ کی تلوار میں ہے

مرحوم کے فرزندانِ لائق سے بجا طور پر امید کرتا ہوں کہ وہ ان کے تمام مراثی کو شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں گے۔ پروردگارِ عالم فیض بھرتپوری کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جناب تابش دہلوی صاحب

فیض بھرتپوری

مرثیہ نگاری میں نئی آواز

دورِ جدید میں جن حضرات نے مرثیہ کی صنف کو زندہ رکھا ان میں افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی، نسیم امروہوی، نجم آفندی، سید آل رضا جوش ملیح آبادی اور صبا اکبرآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو مرثیہ پیارے صاحب رشید تک واقعاتِ کربلا اور ان کے متعلقات تک محدود تھا۔ پیارے صاحب رشید نے بہار اور ساقی نامہ کا اضافہ ضرور کیا لیکن موضوع کے اعتبار سے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی اور انیس اور دبیر نے مرثیہ کو جس عروج پر پہنچایا تھا اُس سے آگے نہ جا سکا اور اس طرح مرثیہ کی صنف میں جمود پیدا ہو گیا۔ لیکن ان حضرات نے روحِ شہادتِ عظمیٰ کے اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں کو ایک نظریہ اور ایک

تحریک کے طور پر پیش کر کے مرثیہ نگاری میں نئے امکانات کا رجحان پیدا کیا اور اس طرح مرثیہ کی صنف میں ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ان حضرات کے اثرات کو آنے والی مرثیہ نگار نسل نے بھی قبول کیا اور ان کا اتباع آج بھی جاری ہے۔ ان شعراء میں سردار نقوی، ڈاکٹر یاور عباس، اثر جلیلی، فیض بھرتپوری، امید فاضلی، ہلال نقوی، شادان دہلوی، اور مختار فاروقی شامل ہیں۔ ان حضرات نے بھی موضوعاتی مرثیہ کہکر اس صنف کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ ترقی کے امکان بھی پیدا کئے ہیں۔ فیض بھرتپوری شاعر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے دادا سید اصغر حسین زیدی بصیر بھرتپوری اور ان کے والد سید اکرام حسین زیدی کلیم بھرتپوری بھی مرثیہ نگار تھے اس لئے قدرتی طور پر فیض بھرتپوری بھی مرثیہ گوئی کی طرف راغب ہوئے انھوں نے ۲۶ مرثیے کہے ہیں۔

ان مرثیوں میں انھوں نے شہادت عظمیٰ کی روح کو مدِّ نظر رکھا ہے اور واقعات کربلا کے تہذیبی اور اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان مرثیوں میں زبان و بیان کی تمام خوبیاں نمایاں ہیں اور فیض بھرتپوری کو جو بات دوسروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ ان کا ابلاغ کا سیدھا سادھا طریقہ ہے جس سے عام آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا انھوں نے عوامی جذبات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایسے طرز کے مرثیے کہے ہیں کہ مرثیہ کے فنی پہلو بھی مجروح نہیں ہوئے ہیں اور تاثیر کی گرفت بھی کمزور نہیں پڑی ہے۔ ان مرثیوں میں بعض تشبیہات اور استعارے ان کے اپنے ہیں اور یہ اختراع مرثیہ گوئی میں ان کے لئے منفرد مقام کی ضمانت ہے۔ یقین ہے کہ یہ مرثیے قبول عام کی سند حاصل کریں گے اور فیض بھرتپوری کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہوں گے۔

ظفر جونپوری:

فیض بھرتپوری
بحیثیت مرثیہ نگار

فیض بھرت پوری کا تعلق اُس خاندان سے ہے جس میں شعر و سخن کی محفلیں خوب جمتی تھیں اور مشاعرے خُوب ہوا کرتے تھے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ عزاداری میں غیر معمولی انہماک کی وجہ سے رثائی ادب کو بڑی اہمیت حاصل تھی مرثیہ گوئی۔ مرثیہ خوانی۔ مسالمہ، نوحہ و ماتم کا بڑا زور تھا اس فضا میں رہ کر فیض بھرت پوری شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ فطری صلاحیتیں ابھرنے لگیں ابتدا غزل گوئی سے ہوئی مشاعروں میں آنا جانا شروع ہوا۔ شاعری کا اعتبار بڑھا مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ شہرت قدم چومنے لگی، گھر کے ماحول نے رثائی ادب کی طرف مائل کیا۔ سب سے پہلے مصرع طرح پر سلام کہا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کچھ دنوں بعد مرثیہ کہا جسے سراہا گیا۔

فیض بھرتپوری منکسر المزاج اور حقیقت پسند تھے وہ بے جا ناز کے قائل نہیں تھے چنانچہ انھوں نے اساتذہ سے اصلاح لینے کو بڑی اہمیت دی اگرچہ وہ محتاج اصلاح نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ البتہ اُنکی زندگی کے آخری چند سال ایسے گزرے کہ کسی استاد کو دکھائے بغیر مرثیہ پڑھا اور خوب خوب داد لی۔ بعد میں بھی کسی گوشے سے اعتراض کی آوازیں بلند نہیں ہوئیں۔

ظاہر بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے کہ کامیاب غزل گوئی جس کا حلقۂ اثر مذہبی ادب کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے، کا سلسلہ ختم کر دیا جائے اور محدود فضا میں اپنے کو سمیٹ لیا جائے لیکن یہ فیصلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ فیض بھرت پوری لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو دینی ادب کے لئے مخصوص کر دیا ارباب نقد و نظر اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرثیے کے لئے مسدس کتنا موزوں ہے اور وہ اس سے بھی واقف ہیں کہ مسدس کی اَستخوان بندی کتنی مشکل ہے۔ چار مصرعوں کا ہم آہنگ اور پھر بیت کے ساتھ انصاف برتنا بڑا دماغ سوز عمل ہے اس کے ساتھ ایک بند کا رشتہ دوسرے بند سے بڑی اہمیت کا حامل ہے خانہ پُری کی بات کچھ اور ہوتی ہے لیکن ایک ایک لفظ کا خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تو ہوا مرثیہ کا ظاہری حُسن۔ اس کا ایک باطنی حُسن بھی ہوتا ہے جو مرثیے میں جمود پیدا ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ حرکت کو برقرار رکھتا ہے

فیض بھرت پوری، حتی الامکان ان تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ اپنی تخیل کی پرواز سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی ہے۔ اُن سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ سنگِ بنیاد مرثیہ نگاروں کی صف میں در آئیں، فضول ہے، ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ اس اعتبار سے جب ان کے مرثیوں کو دیکھا جاتا ہے تو اسکو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ارتقائی عمل جاری ہے، سرد نہیں پڑا ہے۔

فیض بھرت پوری، رنگِ جدید میں مرثیہ کہتے ہیں۔ موضوع کا انتخاب بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ جدید ہونے کے باوجود ان کے مرثیوں میں قدیم رنگ کا عکس نظر آتا ہے۔ جو قابلِ داد ہے۔ ان کے مراثی کا ایک مجموعہ "مراثی فیض" کے نام سے چھپا ہے اس میں کل نو مرثیے ہیں۔ چند مرثیوں کا عنوان پیش خدمت ہے۔

(۱) شاہدِ نظم کا زیور ہے ثنائے حیدر۔ (۲) باعثِ رونقِ گلزار جہاں ہے پانی۔
(۳) یہ زندگی میں تنازع جو ہے بقا کے لئے (۴) باعثِ تقویتِ قلبِ پدر ہے فرزند
(۵) معدنِ فیض کا تابندہ گہر ہے ایثار۔

فیض بھرت پوری اپنا تشخص برقرار رکھتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں فضا کا تقدس سنجیدگی کو برقرار رکھتا ہے اور پروان چڑھتا ہے ایک بہت ہی اہم پہلو جو اُن کے مرثیوں کے لئے طرۂ امتیاز ہے، وہ ہے اخلاص جس کی جلوہ گری لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہے اُن کے کمال کا جلوہ وہاں بھی نظر آتا ہے، جہاں وہ بیانیہ انداز میں تنوع پیدا کرتے ہیں۔

ان کی چند مثالیں :۔ حضرت علی علیہ السلام کی توصیف میں فرماتے ہیں۔

سلسلہ جن کا ہے بے واسطہ پیغمبر سے
مدح کے ملتے ہیں موتی مجھے اُن کے دَر سے
میرے مضمون کو یہ توقیر ملی سرور سے
بڑھ کے رضواں نے چنے پھول جو منہ سے برسے
گل بداماں ہو نہ کیوں شاہد گل کار سخن
فیض ہیں دُرِ نجف کا دُرِ شہوارِ سخن

جنگ کی جنگ کا منظر رنگِ قدیم میں۔

گرم تھا موت کا بازار عدو تھے ششدر
اس کا سر اُڑ گیا دھڑ اس کا، کٹی اس کی کمر
کوئی سالم نظر آیا نہ میان لشکر
ڈھیر تھے لاشوں کے میدان میں تا حدِ نظر
راستے بند ہوئے خوں کی روانی کے لئے
رہ گیا جسم کے لہو رن میں نشانی کے لئے

آخری مصرع کی بلاغت قابل صد ستائش ہے۔

امامِ حسینؑ کی شان میں جو مرثیہ ہے اس کا ایک بند ۔

صبحِ ازل ہے چاکِ گریبانِ کربلا
شام ابد ہے گوشۂ دامانِ کربلا
حبل المتیں ہے زلفِ پریشانِ کربلا
صحرائے معرفت ہے بیابانِ کربلا۔
ہر ذرہ اس زمیں کا جو ایمان پناہ ہے
خونِ حسین کی عظمت کا گواہ ہے

اس بند میں رنگِ قدیم کو رنگِ جدید نے دبا لیا ہے۔

پانی کے موضوع پر بند ملاحظہ ہو۔

باعثِ رونقِ گل زارِ جہاں ہے پانی
عنصرِ زندگیِ کون و مکاں ہے پانی
گھر ہے آنکھوں میں اور آنکھوں سے نہاں ہے پانی
روح بن کر تنِ گیتی میں رواں ہے پانی

پھر نہ نباتات نہ حیوان، نہ انساں ہوتے
یہ نہ ہوتا، تو چمن، دشت و بیاباں ہوتے

خالص نظم کو، الفاظ کے انتخاب نے مرثیے کا آہنگ دیا۔

اس مرثیے کا ایک اور رنگ۔

اس حقیقت سے ہیں اربابِ حقیقت آگاہ — پیاس میں پیاسے کو پانی کی فقط ہوتی ہے چاہ
کتنے خود دار تھے مظلوم کے ساتھی واللہ — تشنگی میں بھی نہ ڈالی رُخِ باطل پہ نگاہ
ہے یہ فطرت کہ طلب کرتا ہے پیاسا پانی
شہ کے بچوں نے بھی غیروں سے نہ مانگا پانی

آخری مصرع پر غور کیجئے کہ کربلا والے کتنے غیرت مند تھے۔

تنازع للبقا پر ایک بند۔

مقابلے میں صف آرا ہوئے جو اہلِ زمن — سبھی کے سینوں میں تکمیلِ کار کی تھی لگن
اب ان میں جو سبقت لے گئے تھے صاحبِ فن — بیاضِ فن کی وہ بستی بسا چکے مدفن
وہ مر گئے، مگر اب اُن کا کام زندہ ہے
یہ کام کی برکت ہے کہ نام زندہ ہے

اتنے وسیع موضوع کو کس خوبی سے حدود میں رکھا گیا ہے۔

جناب علی اکبر کی شان میں مرثیے کا ایک بند:

آنکھیں رہتی ہیں جو نقل و حرکت کی نگراں — مشکلیں کرتے ہیں حل، آتا ہے حدودِ امکاں
اسکی طفلی ہی میں اٹھتا ہے یہ دل میں ارماں — حسنِ اخلاق میں ہو جائے ابھی سے یہ جواں
باپ، دادا سے بھی ہر بات میں افضل ہو جائے
بشریت کی شریعت میں مکمل ہو جائے

کتنا فطری جذبہ کس خوبصورتی سے نظم ہوا ہے

جناب حبیب ابن مظاہر کی شان میں

ملا جو حضرتِ شبیرؑ کا حبیب پیغام — چلے یہ گھر سے نکل کر، خدا کا لے کر نام
قضا کے شوق میں منزل پہ بھی کیا نہ قیام — سفر کی مٹ گئی کلفت نظر جب آئے امام

اے فیض حسینؑ نے پیٹا لیا جو سینے سے
نبیؐ کی ان کو مہک آگئی پسینے سے

ایثار کے عنوان پر مرثئے کے چند بند

معدنِ فیض کا تابندہ گہر ہے ایثار — نخلِ گل زارِ سخاوت کا ثمر ہے ایثار
وقت کی قید نہیں، آٹھ پہر ہے ایثار — راہِ عقبٰی کے لئے زادِ سفر ہے ایثار
کر کے ایثار جو ہستی سے گزر جاتے ہیں
کس طرح کیجئے باور کہ وہ مر جاتے ہیں

شام ہی جسکی نہیں ہے، وہ سحر ہے ایثار — جو نہ مرجھائے کبھی وہ گل تر ہے ایثار
صرف کرنے سے جو بڑھتا ہے وہ زر ہے ایثار — ہے یہ اخلاص تو معراجِ بشر ہے ایثار
حسبِ احکامِ شریعت ہے ارادہ اس کا
جذبۂ خدمتِ مخلوق ہے جادہ اس کا

ان کی ہی ذات سے ایثار نے پائی معراج — یہ وہ ہستی ہے، تعارف کی نہیں جو محتاج
ہفت اقلیم کے ہیں ہیچ، ان کی نگاہوں میں یہ تاج — اب بھی دیتا ہے ہر اک صاحبِ ایثار خراج
کب یہ ایثار کسی شاہِ زمانہ نے کیا
جو خدیجہؓ نے اور اولادِ خدیجہؓ نے کیا

فیض بھرتپوری نے مرثیہ نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا - ان کے مصرعوں میں فکر بھی ہے ۔ سوز و گداز بھی ہے۔ وہ رنگ قدیم کا احترام کرتے ہیں اور رنگ جدید کو حدود میں رکھنے کے قائل ہیں۔ وہ دوسروں کی فضیلت کا احترام کرتے ہیں ان کے مرثیے حدود سے خالی نہیں ہوتے۔

وہ قلم کی جولانیاں بھی دکھاتے ہیں ۔ اور صبر کرکے حدود کی باتوں پر دادِ صبر بھی دیتے ہیں۔ ان کے مرثئے کو پڑھئے تو ایک طرح کی تسکین حاصل ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ مظلوم سے محبت کا جذبہ ابھر کر آدمی کو انسان بنا دیتا ہے ۔

سردار نقوی

"حضرت فیض بھرتپوری"

فیض بھرت پوری مرحوم سے میرا تعارف اردو مرثیے کے حوالے سے ہے۔ وہ ایک خوش فکر اور خوش بیان مرثیہ گو شاعر تھے جن کے بارہ مراثی کا ایک مجموعہ مراثی فیض کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کراچی میں مرثیہ گوئی کے احیاً اور استحکام کی تحریک میں ایک فعال اور مستحسن کردار ادا کیا ہے۔

میں جب ۱۹۵۸ء میں کوئٹہ سے کراچی منتقل ہوا تو اس وقت کراچی میں تحت اللفظ مرثیہ خوانی کے چار بڑے مراکز قائم تھے۔ ان میں سب سے قدیمی مرکز انجمن حسینیہ ایرانیاں تھا لیکن ڈاکٹر سید یاور عباس (مرحوم) کے مکان واقع فردوس کالونی ناظم آباد میں منعقد ہونے والا سلسلہ مجالس سب سے اہم اور مقبول مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ڈاکٹر سید یاور عباس ہی کے زیرِ اہتمام نو تصنیف مراثی کی مجالس کا ایک سلسلہ امام بارگاہِ رضویہ کالونی کراچی میں منعقد ہوتا تھا۔ مرثیہ کی مجالس کا ایک اور اہم مرکز جامعہ امامیہ ناظم آباد میں قائم تھا جس کے سرپرست شاعرِ آلِ محمد حضرت نسیم امروہوی (مرحوم) تھے لیکن اس سلسلہ مجالس کے انتظام و انصرام میں فیض بھرتپوری کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ہر سال جامعہ امامیہ کے سلسلۂ مجالس میں اپنا نو تصنیف مرثیہ پیش کرتے تھے اور یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ تک جاری رہا پھر جب حالات کی ناسازگاری کے نتیجہ میں جامعہ امامیہ کا سلسلہ بند ہو گیا تو فیض بھرتپوری صاحب ڈاکٹر سید یاور عباس (مرحوم) کے سلسلۂ مجالس میں شریک ہو گئے اور یہ شرکت اور تعلق آخر تک قائم رہا۔ اس کے

علاوہ انھوں نے دیگر احباب کے ساتھ مل کر جعفر طیار سوسائٹی میں ایک نئے سلسلۂ مجالس کی داغ بیل ڈالی۔ غرض وہ مختلف عنوانوں سے مرثیہ کے فروغ وارتقاء کے لئے سعی کرتے رہے۔

جہاں تک فیض بھرتپوری مرحوم کی مرثیہ گوئی کا تعلق ہے اس میں ایک انفرادیت اور وقار پایا جاتا ہے۔ ان کے مراثی کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی پر شاعر آل محمد حضرت مولانا نسیم امروہوی کے اثرات کافی نمایاں ہیں

ان کے مرثیوں میں حسنِ خیال کے ساتھ ساتھ حسن زبان پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مرثیوں میں عقیدے کی مرکزیت اور اہمیت پر خاطر خواہ توجہ دیتے ہیں، مدح کے مضامین ہوں یا رثا کے پہلو ان کے انداز بیان میں رنگ نسیم کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک موقعہ پر وہ خود اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

و

ایک تو خود برکت، مرثیہ گوئی کی قدیم — دوسرے بھر مرے استاد کا فیضِ تعلیم
کیوں رہوں چپ، وہ حقیقت ہوں فرزند کلیم — جمن فیض ہے پروردۂ الطافِ نسیم

پھول چنتا ہی گزر جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ الجھا ہوں نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

مرے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے کہ فیض بھرتپوری کی مرثیہ گوئی کا محرک اور محور کوئی عارضی یا ذاتی مفاد نہیں تھا بلکہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ "مرثیہ ہوتا ہے فردوس بریں کا منشور" ممکن ہے بعض بزعم خود جدت پسندان کے اس انداز نظر کو قدامت پرستی پر محمول کریں۔ ایسے لوگوں سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ حقیقت کے افہام و ابلاغ کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اور جیسے جیسے انسان کا ذوقِ نظر ترقی کرتا جاتا ہے وہ اس بات کا قائل ہوتا جاتا ہے کہ۔ دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم اور فیض صاحب کی یہی بصیرت اور عقیدت ہے جو ان کے مراثی کو گہرائی اور توانائی اور وقار و اعتبار عطا کرتی ہے۔

(۲) دیں نے فریاد جو کی اپنی حفاظت کے لئے
کربلا آگئے شبیر بھی نصرت کے لئے

فیض مرحوم نے مرثیہ گوئی کو ذاتی شہرت یا حصولِ جاہ و منصب کے لئے نہیں بلکہ اُسے ایک مخلصانہ عبادت سمجھ کر وسیلۂ آخرت قرار دیا۔ یہ بند میں ارشاد فرماتے ہیں

ایک حقیقت سب کا جو چھپاؤں میں حضور
مرثیہ بہرِ ستائش نہیں مجھ کو منظور
یہ عقیدہ ہے میرا اور یہی حق بھی ہے ضرور
مرثیہ ہوتا ہے فردوسِ بریں کا منشور
ایک بیت بھی جو مقبولِ ائمہ ہوگی
حشر کے دن وہی بخشش کا تتمہ ہوگی

مدح و منقبت کے مقام پر یہ بند حضرت امیر المومنین کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک شاہکار حیثیت رکھتا ہے۔

وارثِ علمِ نبی خلق پیمبر حیدرؑ
اشجع و بت شکن غازی و صفدر حیدرؑ
ملزمِ علم و عمل ساقیٔ کوثر حیدر
لوزِ رب شیرِ عرب فاتح خیبر حیدرؑ
فتح مشکل ہو تو ایک آیۂ نصرت میں علی
نصرتِ حق کے لئے فتح کی صورت ہیں علی

فیض مرحوم نے مرثیہ کے بین و بکا کے مقامات میں بھی نئی ترکیبوں کا اضافہ کیا اور موجدانہ اسلوب کے ساتھ آپ نے دردِ کربلا کو بیان کیا ہے مثلاً

واحسرتا یہ آلِ بشیر و نذیر ہے
عباس سے دلیر کا کنبہ اسیر ہے

میری دُعا ہے مرحوم فیض بھرت پوری کو وہ اجرِ جزیل ملے جو مداحِ اہل بیت کرنے والوں کا نصیب ہے اور دبستانِ مرثیہ ان جیسے صاحبِ اخلاص دردِ منش اور فکر اور ہستیوں کا جولان گاہ بنا رہے۔

علامہ سید جاوید جعفری

فیض مرحوم

میں نے فیض (مرحوم) کو دیکھا بھی، پڑھا بھی، سنا بھی، اور انھیں اپنی مجلس سنتے ہوئے پایا بھی یہ مرحوم اپنی شخصیت کے اعتبار سے سادگی تکلف سے عاری درویشانہ بود و باش کا مرقع تھے جبکہ اپنی فکر اور فن کے اعتبار سے وہ یقیناً مرثیہ جدید کے لکھنے والوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

آپ کے مراثی میں جو سب سے نمایاں عنصر ایک پڑھنے والا موجود پاتا ہے وہ آپ کے اشعار کا بے ساختہ پن ہے۔ مرثیوں کی بیتیں خاص طور پر سہلِ ممتنع کا رنگ لئے ہوتی ہیں فیض صاحب کا ایک خاص فن الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں میں استعمال کرنے سے متعلق ہے اور میرے نزدیک اس انداز کلام میں کوئی دوسرا نام نہیں جو ان کے ردیف میں جگہ پا سکے مثلاً یہ شعر دیکھئے ؎

مثلِ سلفِ فساد کے گُرگان کو یاد تھے
ابنِ زیاد سے بھی ستم میں زیاد تھے

فیض (مرحوم) کے کلام کے اجزائے ترکیبی عرفانِ رب، حب اہل بیتِ اطہار، نیکی و بدی اور فلسفہ خیر و شر کے امتزاج کا نمونہ ہیں۔ فیض مرحوم اپنی شاعری میں میر کا سا انداز لئے ہوتے کبھی ایک فلسفی کے روپ میں نظر آتے ہیں اور کبھی غالب کی سی حکیمانہ شاعری کرتے ہیں ایک معلّم ناصح کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔

یاور حسین ؔ یاور اعظمی

آہ فیض صاحب مرحوم

ہائے یہ ہماری چمکتی دمکتی دنیا بظاہر کتنی حسین و خوشنما اور بباطن کتنی مجسمہ فریب ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک معلوم نہیں اس میں کتنی ہی بستیاں آباد ہوئیں اور پھر اجڑ گئیں کتنی پرشکوہ انجمنیں قائم ہوئیں اور بیک چشم زدن نذر طاق نسیاں ہو گئیں کیسے کیسے مایۂ ناز ادیب و فقیہہ پیدا ہوئے اور موت کے سرد ہاتھوں نے انھیں اپنی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔ البتہ باوجود اس کے کہ وہ نظروں سے نہاں ہو گئے وہ اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت اب تک زندہ ہیں اور ہماری اس علمی دنیا کو اسی طرح روشن کر رہے ہیں جس طرح اپنی زندگی میں روشن کئے ہوئے تھے دور کیوں جایئے آپ اس سلسلے میں دنیائے علم و ادب کے صنف مرثیہ گوئی ہی پر ایک نظر ڈال لئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جناب ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ممتاز مرثیہ گو شاعر جناب سید قائم رضا نسیم امروہوی مرحوم تک ایک سے ایک بزرگوار مایۂ ناز مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے جو آسمان مرثیہ گوئی پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ایسے چمکے کہ اُن کے کلام کی چمک دمک سے حلقۂ شاعری بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ جناب فیض بھرتپوری مرحوم بھی ایسے ہی پرشکوہ مرثیہ گو حضرات کی صف اول میں شامل ہیں میری اُنکی پہلی ملاقات جامعہ امامیہ ناظم آباد کراچی کے نو تصنیف مراثی کی مجالس میں ہوئی

یہ عشرۂ نو تصنیف مراثی جناب مولانا سید قائم رضا صاحب نسیم امروہوی مرحوم اور فیض صاحب نے مل کر قائم کیا تھا۔ اس عشرۂ مجالس میں منتخب مرثیہ گو حضرات اپنا اپنا مرثیہ بارگاہ حسینی میں پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے تھے اور ہم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں کا نام بھی انھیں منتخب مرثیہ گویوں میں شامل تھا چنانچہ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک بہ وجوہات نامعلوم مولانا موصوف نے اس عشرۂ مجالس کو بند نہ کر دیا

اب ہمارے سامنے اک لمحۂ فکر یہ تھا کہ ہم دونوں اپنی مرثیہ گوئی کو ختم کر دیں یا پھر کوئی دوسری صورت اختیار کریں جس سے ہماری مرثیہ گوئی باقی رہے اور ہم اس ثواب سے محروم نہ ہو سکیں چنانچہ ہمارے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ کیوں نہ ہم خود ایک ایسا ہی نو تصنیف مرثیوں کا عشرہ قائم کر لیں جس میں ہم خود بھی مرثیے پڑھیں اور دیگر منتخب اور مشہور مرثیہ گو حضرات کو دعوت فکر دیں چنانچہ اس سلسلے میں جناب فیض صاحب مرحوم نے بنیادی کردار ادا فرمایا اور جناب بیدار نجمی حیدرآبادی مرحوم جناب نفیس صاحب فتحپوری مرحوم اور جناب ظفر جونپوری صاحب سلمہ کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح ایک نئے عشرۂ نو تصنیف مجالس کی بنیاد پڑ گئی۔

اب اس کے بعد دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ یہ مجالس کب اور کہاں ہوں چنانچہ ہم نے یہ طے کیا کہ یہ مجالس میرے گھر پر جعفر طیار سوسائٹی میں برپا کی جائیں اس لئے کہ یہاں اثنا عشری آبادی ہے اور یہاں کے لوگ بھی بے حد با ذوق ہیں۔ وقت کے لئے یہ طے پایا کہ بعد عشرۂ ماہ محرم آٹھ ربیع الاوّل تک ہر روز جمعہ کو یہ مجلس ٹھیک نو بجے شروع کی جائے تاکہ اس سے کسی دوسرے عشرے کا ٹکراؤ نہ ہو سکے۔

اب رہا ان مرثیہ گو حضرات کا انتخاب جنھیں اس عشرہ میں پڑھنے کی دعوت دی جائے چنانچہ یہ ذمہ داری بھی جناب فیض صاحب مرحوم نے اپنے ذمہ لی اور انھیں کے انتخاب اور تجویز کے مطابق لوگوں کو دعوت کلام دی گئی اور بحمد اللہ انہیں لوگوں کے تعاون سے یہ عشرہ اب تک قائم ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ یہ عشرہ اسی طرح ان کی یادگار بن کر ہمیشہ قائم و دائم رہے آمین ثم آمین

جناب فیض بھرتپوری صاحب مرحوم خدا ان کو غریق رحمت کرے بڑی خوبوں کے پیکر تھے۔ نہایت خلیق اور بردبار آدمی تھے جس سے دوستی کی اُسے حتی الامکان اس وقت تک نبھایا جب تک اس کا باقی رکھنا ناممکن نہ ہو گیا۔ صنف شاعری اور خصوصاً مرثیہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مدح آئمہ علیہ السلام میں لاتعداد قصیدے نوحے اور سلام تصنیف فرمائے جو ہمارا قومی سرمایہ ہیں یوں تو وہ ہر صنف شاعری پر عبور کامل رکھتے تھے لیکن مرثیہ گوئی و نیز مداحیٔ اہلبیت ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

یوں تو ان کا ہر مرثیہ اپنی جگہ بے نظیر ہے مگر ان کا وہ مرثیہ جو انھوں نے "پانی" کے عنوان پر لکھا ہے ان کی علمیت اور فن شاعری کی دلیل ہے۔ آپ کلام میں باغ و بہار اور گفتگو میں سنجیدہ تھے۔ محفل میں پرمذاق اور مجلس میں ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ وہ فنا فی الحسین اور مداح اہلبیت کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بحیثیت انسان وہ ایک عظیم المرتبت انسان تھے۔ وہ بات کے دھنی اور دُھن کے پکے تھے۔ وعدہ وفائی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپ نے اس قائم کردہ عشرے میں ناسازیٔ طبع کے باوجود ہمیشہ ہر مجلس میں وقت کی پابندی کے ساتھ شریک ہو کر زینت مجلس ہوتے رہے۔ آہ کل وہ ہم میں ایک بزرگ ایک دوست اور ایک شاعر اہلبیت کی حیثیت سے شامل تھے اور آج ہم ان کے ایصال ثواب کی مجلس بپا کر رہے ہیں۔ ہم دعاگو ہیں کہ پروردگار عالم ان کو مداحیٔ اہلبیت و مرثیہ گوئی امام حسین علیہ السلام کے صلے میں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں قریب ائمہ علیہم السلام عطا فرمائے و نیز ان کے قائم کردہ عشرے کو قائم و دائم رکھنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے

آمین ثم آمین

مرحوم نے اپنی زندگی میں کتنے ہی شاگرد پیدا کئے جن میں جناب میر اسعدی سلمۂ کا نام سر فہرست ہے۔ خدا ان کو زندہ سلامت رکھے اور اپنے استاد مرحوم کا نام روشن کرنے اور ان کے صحیح جانشین ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

شاداں دہلوی

بیادِ فیض مرحوم

حضرت فرزند حسن فیض بھرتپوری بھی رخصت ہو گئے۔ کلاسیکی مرثیہ کہنے والا ایک اور اہم شاعر کم ہو گیا۔ فیض صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی لیکن تنگنائے غزل غالباً بقدرِ شوق نہ ہونے کے سبب ادھر توجہ کم رہی اور مرثیہ کہنا شروع کیا اور تقریباً ربع صدی تک بڑی کامیابی کے ساتھ مرثیہ کہتے اور پڑھتے رہے۔ موضوع مقرر کرکے بھی مراثی کہے اور جس موضوع پر مرثیہ کہا اس موضوع کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سکا انصاف کیا۔ کلاسیکی مرثیے کا شوق انہیں اپنے استاد محترم شاعر آل محمد نسیم امروہوی سے ملا۔ فیض صاحب حبِ ذات کے مریض نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ذات کی تشہیر کیلئے مرثیہ کبھی نہیں کہا ہمیشہ واقعات کربلا اور مقصد کربلا کی تشہیر کیلئے مرثیہ کہا اور اس سلسلے میں انہیں نہ کبھی ستائش مجلس کی تمنا ہوئی نہ صلۂ دنیا کی پرواہ۔ اسے حاصل عبادت اور توشۂ آخرت سمجھ کر مرثیہ کہتے رہے حسین اور اولادِ حسین کے حال کے مرثیے بھی کہے اور انصارِ حسین اور اعوانِ حسین کے مرثیے بھی کہے۔ ان کے کردار اور جذبۂ نصرت کو اجاگر کیا۔ گذشتہ نصف صدی میں شاید منظر عظیمی مرحوم کے بعد فیض صاحب کو اِس سلسلے میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۶۳ء میں محترمی ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے مطب میں ہوئی۔ اور اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایام عزا میں یہ ملاقاتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ انھیں مرثیے اور عزائے حسین سے جو محبت تھی وہ انکا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ کراچی میں جامعہ امامیہ میں۔ آپ نسیم امروہوی کے قائم کردہ عشرے میں

ہر سال مرثیہ نوتصنیف پڑھا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کوئٹہ میں بھی قیام بسلسلہ ملازمت رہا۔ ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کی تحریک پر اثر جلیلی صاحب نے کوئٹہ میں مرثیہ نوتصنیف کا عشرہ قائم کیا۔ میں بھی ہر سال مرثیہ پڑھنے کوئٹہ جاتا تھا۔ محترم اثر جلیلی مرحوم کے مکان پر قیام رہتا تھا۔ فیض صاحب کوئٹے کی شدید ترین سردی میں تشریف لاتے تھے۔ اثر جلیلی صاحب کے مکان پر گھنٹوں محفل جمی رہتی۔ موضوع گفتگو عموماً ادب مرثیہ اور مجلس ہی تھا۔ اس کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے۔ جامعہ امامیہ کا عشرہ جب بند ہوگیا تو ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے قائم کردہ عشرہ میں ہر سال مرثیہ نوتصنیف پیش کرتے تھے اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ گذشتہ برس ان سے مرثیہ پڑھنے کی گذارش کی گئی۔ طبیعت کافی ناساز تھی۔ علاج کی غرض سے امریکہ جانے کا پروگرام بن رہا تھا اسلئے معذرت کرلی۔ امریکہ سے واپس آئے مگر طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہ ہوسکی۔ فالج کا حملہ ہوا۔ آغا خان ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ میں عیادت کیلئے ہسپتال گیا۔ کچھ افاقہ ہوا تو گھر واپس آگئے۔ اکثر وبیشتر انکی خیریت ان کے داماد رضوی صاحب جو اسٹیٹ بینک میں میرے ساتھی ہیں معلوم کرلیتا تھا۔ آخر وہ رخصت ہوگئے اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون ان کے سوئم کی مجلس میں ان کے فرزند سے مرثیہ سنا۔ فیض صاحب بہت یاد آئے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ انکے شاگردوں میں عزیزم نیر اسعدی کو ایک اہم اور نمایاں خصوصیت حاصل ہے۔ اس نوجوان میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ فیض صاحب نے ان پر محنت بہت کی ہے اور ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ نیر ایک عالم گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ خدا انکی عمر دراز کرے اور فیض مرحوم کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

امید فاضلی

فیض بھرت پوری

زندگی اور شاعری میں یکسانیت اندنوں کم بلکہ بہت کم نظر آتی ہے یعنی شخصیت اور شاعری میں تضاد نہ ہو، شاعر جو کچھ لکھ رہا ہے وہی اس کا عقیدۂ اخلاق اور انسانی اقدار ہوں۔

اس قحط الرجال کے دور میں فیض بھرتپوری اعلیٰ انسانی اقدار اور اچھی شاعری کے اجماع کی بہترین مثال رہے ہیں۔ بزرگوں کا احترام مشرقی روایات اور اسلامی اصولوں سے محبت، برابر والوں سے حسنِ سلوک اور چھوٹوں پر شفقت دوستوں کے کام آنا اور دشمنوں کے لئے عفو و درگزر سے کام لینا یہ وہ خصوصیات تھیں جو حضرت فیض بھرتپوری صاحب میں یکجا ہوگئیں تھیں۔ آج انھیں مرحوم کہتے ہوئے جی دکھتا ہے انھوں نے غزلوں سے شاعری کی ابتدا کی ہوگی جو شاعری کے لئے ضروری ہے مگر یہ سب کچھ چھوڑ کر مراثی مناقب اور سلام یعنی ملی شاعری کے لئے خود کو وقف کر لیا ہے ہر چند کہ کلاسیکی طرز فکر کے شاعر تھے مگر جدید شعرا اور جدید شاعری کے بھی مداح تھے بعض مرثیے تو ایسے اصلاحی اور نئے موضوعات پہ لکھے ہیں جو شاید وہی لکھ سکتے تھے کاش کہ میسر پاس اس شدید علالت اور پریشانی کے عالم میں اتنا وقت میسّر آسکتا کہ چند بند بھی مثالاً پیش کر سکتا۔ بہر حال ایسے لوگ اب کہاں رہے۔ اور بس اسی مصرع پہ اکتفا کروں گا

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ابن الشہید سید محمود الحسن رضوی

"فیض بھرتپوری ایک منفرد مرثیہ نگار"

ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم نے کیا خوب تحریر فرمایا "امام حسینؑ کو شہادت کے لئے مدینہ سے کربلا جانا پڑا اور شہادت کو ادبی وفنی مرتبہ حاصل کرنے کے لئے عرب وایران ہوتے ہوئے ہندوستان آنا پڑا۔ عجب کیا کہ یہ ادبی سفر اس خواہش کا پرتو ہو جو امام حسینؑ نے یزید سے کی تھی کہ اگر تجھے میری ذات وقیام سے اندیشہ ہے تو مجھے ہندوستان چلا جانے دے، حالات نے امامؑ کو ہندوستان نہ آنے دیا مگر شہید اعظم کی یہ خواہش قدرت بھی نہ رد کر سکی جسمانی طریقہ پر نہ سہی ایک دوسری شکل میں ایک نئے انداز سے یہ جذبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سرزمین ہند اس برگزیدہ ہستی کے نزول اجلال سے محروم رہی مگر اس کا تذکرہ جس شدومد کے ساتھ یہاں ادبی لحاظ سے ہوا وہ کچھ کم اہم نہ تھا یہ فخر نہ عرب کو نصیب ہوا نہ عجم کو عربی وفارسی سب منہ دیکھتی رہیں۔ اردو نے معرکہ سر کر لیا اور فاتحانہ انداز سے سر اٹھا کر ان زبانوں سے کہا کہ میرے تاج میں ایک ایسا کوہ نور ہے جو میری امتیازی حیثیت کا سبب بن جاتا ہے میں نے واقعات کربلا کو جس آب وتاب، لطافت وادبیت کے ساتھ پیش کر دیا۔ وہ میری حیات کو ابدیت سے ہمکنار کرنے کے لئے کافی ہے" بعض ادبی مورخوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان میں جو اشعار سب سے پہلے کہے گئے وہ واقعات کربلا وشہادت امام حسینؑ سے متعلق تھے یعنی مرثیہ اصناف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے"۔ اکثر ادبی مورخین نے برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے برج کا علاقہ اضلاع آگرہ (اکبر آباد) متھرا اور ریاست بھرتپور پر مشتمل ہے جہاں برج بھاشا کا راج تھا اس سرزمین نے اردو کی ماں بن کر اسے اپنی آغوش میں پرورش کیا۔ ابتدائی دور میں اس علاقہ میں عشرہ محرم میں "ڈھے روئے" جاتے تھے یعنی علاقائی زبان میں واقعات کربلا بیان کر کے رونے کے رواج کا سراغ ملتا ہے۔ بقول امام

بابو سکسینہ" اردو کو فروغ اکبر کے زمانے میں ہوا اور شاہجہاں کے دور میں تکمیل کو پہنچی اور اب زبان اس قابل ہوگئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام کر سکے۔ ترقی اور درستی و اصلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب بھی جاری ہے" اس اعتبار سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کو فروغ برج بھاشا کی سرزمین یعنی اکبر اعظم کے دارالخلافہ فتحپور سیکری، اکبرآباد و نواح اکبرآباد میں نصیب ہوا محمود مخمور صاحب اپنی مشہور تالیف روح نظیر میں رقم طراز ہیں کہ "نظیر کی زبان اکبرآباد کی خالص زبان ہے اور یہی ٹکسالی اردو ہے آگرہ میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ نظیر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نظیر کی زبان کو لکھنؤ دہلی کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ کسی ضرورت میں ان مقامات کی زبان کی دست نگر ہے چونکہ نظیر متقدم اور بہت پرانے زمانے کے شاعر ہیں اس لئے یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی زبان جنس عالی ہے اور دیگر مقامات کے مدعیان زبان کی زبانیں اس کی انواع۔ یہ بین ہے کہ دہلی لکھنؤ کے اساتذۂ متاخرین نے آنکھ کھول کر جس زبان کو دیکھا وہ نظیر کی زبان تھی پس اسی کو مصفیٰ قرار دے کر اس میں ترمیمیں اور اصلاحیں کیں اس لئے لکھنؤ اور دہلی کی زبانیں اکبرآباد کی قدیم زبان کی ارتقائی شکلیں ہیں لہٰذا نظیر کی زبان کو خاندان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اردو شعراء میں ولی اور بنی نوع انسان میں حضرت آدم کو ہے" تاریخ ادب کے مؤلف ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے نظیر کو اردو کا شیکسپیئر قرار دیا ہے۔ گو نظیر نے باقاعدہ مرثیے نہیں کہے لیکن نعت سرور کائنات تعریف پنجتن پاک منقبت مولا علیؑ اور معجزہ حضرت عباس میں صدہا اشعار کہے ہیں۔

معجزہ حضرت علی علیہ السلام کے طویل مخمس کے پانچ مصرعے ملاحظہ ہوں۔

شیر خدا کے عدل کی یہ دیکھ رسم و راہ — خلقت تمام واں کی پکاری یہ واہ واہ
انصاف ایسا چاہیئے اے شاہ دین پناہ — حامی و منصف اور نہیں کوئی تم سا شاہ
ہے ختم تم پہ عدل و حمایت کا کاروبار

منقبت کے پانچ مصرعے

علی کی دوستی میں جو مرے گا — اسی کو باغ جنت میں ملے گا
علیؑ کے بغض میں جو جان دے گا — وہ ملعون دوزخ اندر یوں جلے گا
کہ جیسے آگ پر جلتا ہے خاشاک

حضرت عباسؑ کے ایک معجزہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کے آخر کے دعائیہ پانچ مصرعے

یا علی عباسؑ غازی صاحب تاج وسریر — سب کے تم مشکل کشا ہو کیا غریب کیا امیر
جان و دل سے اب تمہارے نام کا ہو کر فقیر — یہ غلام روسیہ اب جس کو کہتے ہیں نظیر
آپ کے فضل و کرم کا یہ بھی ہے امیدوار

مرزا اختر حسین صاحب اختر اکبرآبادی "انجمن" میں شائع شدہ اپنے مضمون "حقائق شعر و سخن" میں فرماتے ہیں کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں عہد مغلیہ میں اردو نے جنم لیا قصر اردو کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اردو عدم سے عالم وجود میں آئی۔ اردو کے نام سے زمانہ کے کان پہلی مرتبہ آشنا ہوئے اردو شاعری نے دیدہ زیب لباس پہن کر دنیا کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔۔۔۔۔۔ اس سرزمین سے شہنشاہ اقلیم سخن میر تقی میر، ناخدائے علم و فن مرزا اسد اللہ خان غالب، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا جان جاناں مظہر، میاں نظیر، مرزا حاتم علی مہر، مرزا عنایت علی ماہ، حضرت بلیغ، گلزار علی اسیر، غلام محمد ربانیقا اللہ بقا، شیخ شرف الدین، مضمون، شیخ بلاقی ندر، غلام محمد خاں باطن، نبی بخش حقیر، مرزا اعظم علی اعظم، مرزا قیصر حسین قیصر، مرزا آغا علی آغا، ذاکر حسین ثاقب، محمد حسین قمر، حیات جاودانی لیکر دنیا سے روشناس ہوئے انھیں استادانِ باکمال نے اردو کو آراستہ و پیراستہ کیا انھیں اساتذہ ماسبق نے فن شعریت میں اپنی بوقلمونیوں سے طرح طرح کی گلکاریاں کیں، انہی کے فیضان علوم سے اردو شاعری پروان چڑھی اور درجہ کمال کو پہنچی انھیں نباضان عالم نے صنف شاعری کو اوج کمال تک پہنچایا یہ معمارانِ شاعری اپنے وقت کے بلند پایہ اساتذہ تھے اہل زبان تھے۔

حضرت نجم آفندی اکبرآبادی مرحوم و مغفور نے "دارالادب اکبرآباد" کے عنوان سے ایک طویل نظم سپرد قلم کی جس کے چند بند نذر قارئین ہیں۔

اے دیارِ آگرہ اے ہند کے دار الادب   بیدل و بے نظیر و بے مثال و منتخب
مدفن شاہ جہاں اردو کی خلقت کا سبب   تجھ سے ملتا ہے جہاں میں نسلِ اردو کا نسب
کیوں نہ ہو آفاق میں پھر تیری ہستی لاجواب
چھانٹ لے جب تجھ کو اکبر کی نگاہِ انتخاب

ہیں زبانوں پر تیری رونق کے افسانے بہت   شمع رو تھے سینکڑوں تجھ میں تو پروانے بہت
بس ڈھلے جوبن پہ بھی نکلیں گے دیوانے بہت   بن گئے ہیں تیرے میخانے سے میخانے بہت
خوبیاں سب مٹ چکیں بس نام باقی رہ گیا
بانٹ کر سب جام خالی ہاتھ ساقی رہ گیا

تھے نظیر و جرأت و مضمون کیا کیا من چلے   کس سے پنہاں ہیں لقانے جو دکھائے ولولے
وہ ہمارے میر و غالب تیری گودی کے پلے   لکھنؤ دلی کے جن کے نام سے سکے چلے
جانِ جاناں حضرت مظہر تھے جانِ آرزو
شاعروں کے قبلہ و کعبہ تھے خانِ آرزو

دورِ اول میں کوئی مضمون سے بہتر نہ تھا   آرزو سے دورِ ثانی میں کوئی بڑھ کر نہ تھا
میر کا دورِ سوم میں ایک بھی ہمسر نہ تھا   دورِ چہارم میں کسی کو فوق جرأت پر نہ تھا
درحقیقت رشکِ عرفی فخرِ طالب ہو گیا
دورِ پنجم میں تو غالب کل پہ غالب ہو گیا

سب پہ ظاہر ہے فصیح ذی شرف کا علم و فن   تھا بلیغ و قیصر و آغا سے کیا لطفِ سخن
تھی رہا کی ذات گویا ایک شمعِ انجمن   بھول سکتا ہے رئیس خوش بیاں کا بانکپن
کیوں نہ ہوتا تجھ پہ صدقے ہر گھڑی ہر بار چاند
فیض مہر و ماہ سے تجھ کو لگے تھے چار چاند

دلی میں حضرت طالب دہلوی کے زیر صدارت ایک مشاعرہ میں مفتون صاحب نے یہ مصرعہ پڑھا ؎   زبانِ اردو ہے دلی و لکھنؤ کے لئے

تو اس کے جواب میں حضرت نجم آفندی اکبر آبادی نے اسی مشاعرہ میں برجستہ جواب دیا

زبان میر کی ہے میر آگرہ کے لئے
مقام فخر ہے دہلی نہ لکھنؤ کے لئے

آگرہ دہلی لکھنؤ کی برتری کی بحث سے قطع نظر (کیونکہ اردو کی ترقی و ترویج کے یہ مراکز مختلف ادوار میں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے ہیں مثلاً میر آگرہ میں پیدا ہوئے بڑھے پلے بھرتپور میں ملازمت کی دہلی میں رہے اور پھر لکھنؤ گئے) یہ حقیقت ہے کہ اکبرآباد و نواح اکبرآباد کے شعراء شروع سے آج تک شجر اردو کی آبیاری کرتے رہے ہیں جناب فیض بھرتپوری کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ فیض صاحب کی جنم بھومی بھی وہی ہے جو اردو کی ہے۔ آپ نے بھی اردو کے اس گہوارے میں پرورش پائی جس میں میر، نظیر، آرزو، غالب، بزم، نسیم، نجم سیماب اور صبا جیسے مسلم الثبوت اساتذہ نے پائی۔

زبان و بیان کی ترقی و ترویج میں سب کا حصہ ہے تاہم تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانانِ ہند کی علمی فکری اور علیگڑھ یونیورسٹی سے ابھرنے والی سیاسی نشاۃ ثانیہ میں اس نواح کی سادات نے بڑھ چڑھ کر بڑی ہی وقیع خدمات انجام دی ہیں جس کا صحیح اندازہ "مقالات سرسید احمد خاں" میں شائع ہونے والی اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس میں مدرستہ العلوم (جو علیگڑھ یونیورسٹی بنا) کے قیام کے لئے مشہور شہروں کو چھوڑ کر علی گڑھ کو منتخب کرنے کی دیگر وجوہات کے ساتھ سرسید احمد خاں یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ "یہ شہر آگرہ متھرا اور بھرتپور کے علاقے کی سادات کی بستیوں کے قریب ہے جن کے رئیس شیعہ ہیں ان تمام لوگوں اور اولاد سے بھی زیادہ توقع ہے کہ یہ سب نہایت دل سے اس مدرسہ کے حامی اور سرپرست رہیں گے یہ خاص صفت جو میں نے علی گڑھ کی نسبت بیان کی اور جس کو بہت اعلیٰ اور مقدم سمجھتا ہوں میں نہایت مضبوطی اور تقویت سے کہہ سکتا ہوں کہ تمام اضلاع شمال و مغرب میں کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔ پس ان وجوہات سے علی گڑھ کو دارالعلوم بنانے کے لئے عمدہ مقام تجویز کیا ہے"۔ جہاں تک مرثیہ گوئی کا تعلق ہے اس صنفِ سخن کی سلاطین دکن کے مذہبی شغف سے ابتدا ہوئی اور شاہان اودھ کی سرپرستی میں لکھنؤ میں عروج حاصل کیا لیکن اکبرآباد و نواح اکبرآباد کے سادات و مومنین بھی شاہی سرپرستی نہ ہونے کے باوجود اپنے مذہبی جذبات کے اظہار میں کسی

سے پیچھے نظر نہیں آتے۔ اس نواح کے قدیم مرثیہ گویوں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور میر تقی میر قابل ذکر ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے بھی معصومین کی شان اور واقعات کربلا پر صدہا اشعار کہے ہیں۔ ماضی قریب میں حضرت شبیر حسین نسیم بھرتپوری مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں جن کے لاتعداد شاگردوں مثلاً سید آل حسن نکہت، سید سجاد حسین نوید، منشی نذر خاں ناز، سید محمد مسیح معجز، سید حمیدالحسن قتیل، لالہ تھومل ظریف، سید رضا حسین ضیا، منشی جانکی پرشاد شاد، نواب احمد علی خاں رنگین، حافظ فصیح الدین رسا، منشی برج بہاری لال تمنا، سید ابرار حسین تپاں (موصوف نے اپنے استاد کا دیوان مرتب کر کے شائع کرایا) منشی عبدالرزاق بہار، محمد عبدالعزیز انجم، سید امیر حیدر نجیب، منشی سید مصطفیٰ حسین بدر وغیرہم کا تذکرہ افسر امروہوی صاحب نے "سہ ماہی اردو" جلد ۴۹ ۱۹۷۳ء میں شائع شدہ مضمون فیضانِ انیس میں کیا ہے۔ اپنے اسی مضمون میں موصوف نے حضرت نسیم بھرتپوری کے شاگرد سید حمیدالحسن قتیل پہرسری کے لاتعداد شاگردوں مثلاً سید ذاکر حسین اثر امروہوی، سید غلام حیدر ارماں اجمیری، سید اختر حسین تاب، سید علی عباس تسکین، ڈاکٹر بجے نرائن ساغر، میر سخاوت علی سخی لکھنوی، ملا واحدی کے برادر نسبتی سید احمد سعید دہلوی، آغا مہدی حسن شفق، مہدی حسن صبا، منشی طالب علی خاں طالب جے پوری، سید حمیدالحسن عیش رسولپوری، سید ابوالحسن گلچیں، منشی عترت حسین مائل بہادر پوری، منشی محفوظ علی بریلوی کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اس نواح کے سادات میں مرزا دبیر سے متاثر دو عظیم مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں جن کی علمی حیثیت مسلم تھی خان بہادر، سید اولاد حسین رضوی مداح، مصنف "زاد سبیل آخرت"، منظوم مبارک تضمین "ہفت بند کاشی" اور سید وزیر حسین رضوی مصنف "ذوالقرنین چہل مجلس زاد القربا" وغیرہ۔ جناب فیض بھرتپوری نے اپنے ایک مضمون "بھرتپور کی تاریخ مرثیہ گوئی" میں بھرتپور کے مشہور مرثیہ گو شعرا حضرت نسیم بھرتپوری اور حضرت قتیل پہرسری کے علاوہ سید باقر حسین زیدی باقر، سید مصطفیٰ حسین رضوی بدر، سید علی ناصر جعفری نسیم، سید آل نبی جعفری ثمر، مرزا حیدر حسین حیدر، سید موسیٰ رضا رضوی شاد، مرزا غضنفر حسین عروج، سید اکرام حسین کلیم، سید فضل رسول رضوی فضل، سید محمود الحسن جعفری محمود وغیرہم کا اجمالی تذکرہ کیا ہے۔

تشکیل پاکستان کے بعد کراچی میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا سلسلہ شروع ہوا حسینیہ ایرانیان ڈاکٹر یاور عباس کے دولت کدہ، جامعہ امامیہ امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں ایام عزا میں ہفتہ وار تعطیل کے دن نو تصنیف مرثیہ پڑھے جانے لگے دیگر دبستانوں کے مرثیہ گو حضرات کے علاوہ سادات نگر متھرا اور بھرتپور سے متعلق مرثیہ گویوں نے بھی ان مجالس میں نو تصنیف مرثیے پیش کیے جن میں سید محمد جعفری، سید حامد رضا نقوی ظریف (جنہوں نے ظریف جلیپوری کے تخلص سے شہرت پائی جبکہ موصوف کا وطن قصبہ اول ضلع متھرا تھا اور بسلسلہ ملازمت جلیپور میں مقیم تھے) اسی طرح قمر صاحب مرحوم نے خوشنگ آبادی تحریک ہے حالانکہ وہ تقسیم ہند تک بھرتپور سے مربوط رہے) سید علی اطہر جعفری اطہر، سید علی اصغر اصغر کو سامعین نے خوب خوب سراہا پروفیسر سید فرحت مظفر جعفری نے انجمن احباب حیدری بھرتپور کے زیر اہتمام شہدائے بھرتپور ۱۹۴۷ء کے ایصال ثواب میں منعقد ہونے والی سالانہ یادگار مجالس میں مسلسل پانچ نو تصنیف مرثیہ پیش کیے فیض صاحب بھرتپوری تو جامعہ امامیہ میں منعقد ہونے والے عشرہ کے بانی تھے روح رواں تھے اور ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ بڑی آن بان سے پڑھتے تھے۔

فیض صاحب نے عزاداری سید الشہدا کے روح پرور ماحول میں آنکھ کھولی آپ کا تعلق بھرتپور شہر کے ایک عزادار خاندان سے تھا جہاں مجالس میں عام طور پر تحت اللفظ مرثیہ خوانی ہوتی تھی آپ کے والد بنیکار اکرام حسین صاحب ایک اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے لیکن اکثر اپنے استاد حضرت نسیم بھرتپوری کے مراثی پڑھتے تھے آپ کے دادا سید اصغر حسین بصیر اور والد سید اکرام حسین کلیم" بھی شاعر تھے۔ نیز دیگر اعزا اقربا اور احباب کو بھی شاعرانہ ذوق تھا بقول فیض صاحب جناب نے ۱۳ سال کی عمر میں غزل گوئی شروع کر دی تھی لیکن بیگم صاحبہ کے طنز پر عقبیٰ سنوارنے کے خیال سے سلام کہنا شروع کئے اور کراچی میں پہلی مرتبہ سید علی اطہر جعفری مرحوم اطہر کے اصرار پر ۱۹۶۳ء میں مرثیہ کہا اور حسینیہ ایرانیان میں پڑھا لیکن شاعرانہ چشمک کے نتیجہ میں آئندہ سال جب آپ کو اس عشرہ میں مرثیہ خوانی سے محروم رکھا گیا تو آپ نے ۱۹۶۴ء میں جامعہ امامیہ میں عشرہ قائم کیا جو ۱۹۷۶ء تک بڑی کامیابی سے جاری رہا لیکن مولانا نسیم امروہوی سے اختلافات کے نتیجہ میں ختم ہوگیا۔

فیض بھرتپوری شاعر مودت ہیں وہ شاعر اہلبیت میں شیعہ پیدا ہوئے۔ موصوف محبت اہل بیت کے پیکر تھے حب اہل بیت اور عزاداری سید الشہداء ان کی گھٹی میں شامل تھی انھوں نے تعزیہ داری کے مخصوص غیر پیشہ وارانہ ماحول میں پرورش پائی لہٰذا جو کچھ کہا اسی جذب و کیف کے عالم میں ڈوب کر کہا فیض صاحب کے قطعات سلام مرثیہ سب اسی جذبہ سے مملو ہیں موصوف نے کئی مرثیے کہے اور خوب کہے ان کا انداز پرکشش کلام میں روانی اور زور پایا جاتا ہے آپ نے اپنے مرثیوں میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں زبان و بیان میں بلا کی سادگی اور بے ساختہ پن ہے جناب فیض نے رزم کے گوشوں اور واقعات پر خاص توجہ دی۔ آپ کا ہر مرثیہ جوش ایمانی مذہب سے محبت اور عزاداری سید الشہداء سے والہانہ عقیدت کا مظہر ہے لیکن جو جذبہ آپ کو دیگر مرثیہ گو شعراء سے ممتاز کرتا ہے وہ ہے عزاداران امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت و محبت۔ اس اعتبار سے آپ تمام مرثیہ گویوں میں منفرد ہیں اس لئے کہ آپ اردو کے وہ واحد مرثیہ نگار ہیں جس نے ان عزاداران حسینؑ کا مرثیہ کہا ہے جنھیں صرف اس لئے شہید کر دیا گیا کہ عزاداران حسین تھے۔

جناب فیض بھرتپوری نے بھٹی خیرپور کے حادثہ پر وہاں کی مسجد میں واقع ایک دار العلوم کے تربیت یافتہ مخالفین عزاداری کے ظلم و بربریت کا شکار ہونیوالوں کے غم میں ایک مرثیہ کہا جس کا نام تاریخ ظلم گنج شہیداں" ہے موصوف نے شہدائے کربلا کے عکس میں شہدائے بھٹی کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور اس روایتی عصبیت اور شیعہ دشمنی پر آنسو بہائے ہیں جو محبان اہل بیت کے خلاف جاری ہے۔ سادات کی تباہی و بربادی اور ان پر ظلم و جبر کی تاریخ نئی نہیں۔ بنو امیہ نے اعلان رسالت کے ساتھ دشمنی رسولؐ اور اہل بیتؑ کا جو سلسلہ شروع کیا وہ آج تک جاری ہے شعب ابو طالب میں بنو ہاشم کا محصور ہونا دانے کو ترسنا اور کسی مسلمان کا حضور سرور کائناتؐ کی امداد نہ کرنا حضرت ابو طالب اور جناب خدیجۃ الکبریٰ کی رحلت کے بعد حضورؐ کا بنو امیہ کے معاندانہ رویہ کے تحت مکہ سے ہجرت کرنا ختمی مرتبتؐ حضرت علیؑ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ بدر، احد اور صفین یہ سب اسلام اور خاندان رسولؐ سے ان کی مخالفت بغض و عناد کی نمایاں تاریخی حقیقتیں ہیں، واقعہ کربلا اور اس کے بعد واقعہ حرا یعنی مدینہ کی بے حرمتی قبر رسول

اور خانہ کعبہ بنو امیّہ کی پنجتن پاک اور اسلام دشمنی کے وہ واقعات ہیں جنہیں دنیا کبھی نہ بھلا سکے گی ائمہ معصومین پر ظلم و تشدد مختلف ادوار میں علمائے حق کا قتل ناحق ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ بنی اُمیہ نے دشمنی اہلبیت و محبانِ اہل بیت کا یہ سلسلہ شروع کیا۔ اور بنی عباس نے اس پر بھرپور عمل جاری رکھا اور یہ سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے۔ جب بھی موقع ہاتھ آتا ہے اہل بیت کی محبت اور واقعہ کربلا کی تشہیر کے جرم میں شیعہ قابل گردن زدنی قرار پاتے رہے ہیں۔ جناب فیض نے اس حقیقت کو اس طرح اپنی ایک بیت میں بیان کیا ہے۔

تھا حکم عام رہنے نہ دو ان کو چین سے
مارو اسی کو جس کو ہے نسبت حسینؑ سے

محبتِ اہل بیت میں وہ کون سا ظلم ہے جو سادات و مومنین نے برداشت نہ کیا ہو ان کے خون کے گارے بنائے گئے زندہ دیواروں میں چنے گئے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کئے گئے ہزاروں کی تعداد میں قتل ہوئے جلاوطن ہوئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے مگر پھر بھی شکر رب کیا اس تاریخ ظلم کو فیض صاحب نے اسی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

اکثر کو قید ظلم میں زہر دغا دیا — آب رواں میں بعضوں کا لاشہ بہا دیا
کتنوں کو قصر ظلم کے نیچے دبا دیا — ایسے بھی چند تھے جنھیں زندہ جلا دیا

سادات جب نہ یوں بھی زمانے سے کم ہوئے
ایجاد پھر تو سینکڑوں ظلم و ستم کئے

لوٹا جلایا قتل کیا سر قلم کیا — کچھ وہ بھی تھے کہ دیس نکالا جنھیں ملا
جائز تھا بیکسوں پہ ہر اک ظلم ناروا — شکوے سے پھر بھی لب نہ ہوئے ان کے آشنا

کتنے وہ تھے جو کوفہ و شام و دمشق میں
بالائے دار چڑھ گئے مولا کے عشق میں

ان دو بندوں میں فیض صاحب نے تاریخ ظلم سمو دی ہے اس کے بعد وہ ٹھیٹری کے واقعہ کی طرف آتے ہیں اور اس ظلم کی داستان بیان کرتے ہیں۔

اس دور میں بھی آیا ہے اک ایسا انقلاب　　جس کا نہیں جہاں میں بجز کربلا جواب
ہل چل پڑی وہ چال چلے خانماں خراب　　ٹیڑھی جو فطرتیں تھیں تو کج رو تھے ناصواب

مثل سلف فساد کے گرگان کو یاد تھے
ابن زیاد سے بھی ستم میں زیاد تھے

سادات بھو کے پیاسے تھے عشرے کا روز تھا　　ہر شخص تھا حسینؑ کے غم میں برہنہ پا
پڑھتا تھا کوئی نوحہ کوئی کرتا تھا بکا　　اس وقت ظلم کی ہوئی ناگاہ ابتدا

فطری حسد نے عقل کچھ ایسی بگاڑ دی
تخریب کار قوم نے بستی اجاڑ دی

ٹھیڑی میں عزادارانِ حسین کے ساتھ ۱۳۸۲ عاشور کے دن جو غضب ڈھایا گیا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ان سوگواروں کا قصور کیا تھا یہی نا کہ ماتم کرنا چاہتے تھے اور ٹھیڑی کے ایک مومن کے گھر جا کر صف ماتم بچھانا چاہتے تھے مسجد سے حملہ ہوا مسجد خانہ کعبہ کی شبیہ ہے جو جائے پناہ ہے اس کی حرمت کے سب ہی قائل ہیں لیکن دشمنان عزاداری نے مسجد کی سرزمین کو فساد کے لئے منتخب کیا۔ فیض صاحب کی بیت ملاحظہ فرمایئے۔

جائے پناہ جائے فسادات ہو گئی
مسجد خدا کی مقتل سادات ہو گئی

ٹھیڑی کے خونچکاں سانحہ میں سو کے قریب سادات و مومنین کام آئے جن میں زیادہ تر کڑیل جوان اور کچھ بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ ان مرنے والوں نے بڑے حوصلے اور مردانگی سے بانیانِ فساد کا مقابلہ کیا۔ شیعہ اسلام کی خاطر جان دینے اور نامِ حسینؑ پر مر مٹنے کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں۔ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ موت برحق ہے۔ ایک نہ ایک دن ضرور آنی ہے۔ محبتِ اہل بیت میں مرنے والا شہید ہوتا ہے۔ وہ کبھی نہیں مرتا۔ فیض صاحب نے شیعانِ ٹھیڑی کے عظیم حوصلے، بے خوفی اور جذبۂ شوق شہادت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

تھی جن کے دل میں الفتِ اسلام جلوہ گر　　سینہ سپر وہ ہو گئے نامِ حسینؑ پر
نمرودِ وقت تھے جو مقابل میں سربسر　　شعلوں سے لڑ گئے یہ حسینی نڈر بن کر

کہتے تھے ہم کسی سے بھی ڈرتے نہیں کبھی
جو یوں شہید ہوتے ہیں مرتے نہیں کبھی

ایسے تھے کچھ کہ بیاہ کے قابل تھے مہ جبیں تھے آمدِ شباب کی منزل میں کچھ حسیں
کچھ پیر تھے مثال حبیب امام دین بچے الٹ الٹ کے پڑھے اپنی آستیں
ٹکرائے موت سے شہ صفدرؑ کے نام پر
اکبرؑ کے نام پر، علی اصغرؑ کے نام پر

یہ ایک حقیقت ہے کہ دشمنانِ اہل بیت اطہار کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ عزائے حسینؑ بند ہو جائے۔ غم حسینؑ کی مجلسوں، جلوسوں اور دیگر مراسم عزاء پر پابندی لگادی جائے تاکہ غم حسینؑ کے ان مظاہروں کو دیکھ کر تاریخ سے ناواقف عوام الناس کے ذہنوں میں یہ سوالات نہ ابھر سکیں کہ کربلا جہاں بقول یاس یگانہ چنگیزی اسلام ڈوب کر پار اتر گیا' اس کی داستان کیا ہے؟ وہاں کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیونکر ہوا؟ امام حسینؑ کون تھے؟ کس خاندان کے چشم و چراغ تھے؟ ان کے دادا کون تھے؟ ان کے نانا کون تھے؟ ماں کون تھیں؟ باپ کون تھے؟۔ انہوں نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی؟ ان کے افکار و نظریات کیا تھے؟ عمل اور کردار کیا تھا؟ وہ کیا چاہتے تھے؟ ان کا مدمقابل کون تھا؟ وہ کس خاندان سے تھا؟ اسلام کے خلاف اس خاندان کا رویّہ کیا تھا؟ اس کے ماں باپ کون تھے اور کیا تھے؟ اس کے دادا اور دادی نے اسلام کے خلاف کیا کردار ادا کیا؟ خود اس کے عادات واطوار اور اشغال کیا تھے؟ اس نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی؟ اس کی نیت اور ارادے کیا تھے؟

ان سوالوں کے جوابات سے حق اور باطل کا فرق سمجھ میں آتا ہے۔ فریقین کے بزرگوں کے کارنامے سامنے آتے ہیں۔ کردار و عمل کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یزید اور اس کے خاندان کے معتقدین کیسے برداشت کرلیں کہ ان کے ممدوحین کے سیاہ کارناموں سے پردہ اٹھے اور سادہ لوح مسلمان' سچائی سے واقف ہو کر ظالموں سے اظہار برأت اور علیحدگی اختیار کرلیں۔ عزاداری کی مخالفت کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ رسول اور اہل بیت رسولؐ کے مخالفین کی شخصیات اور اعمال کے تقابل کی کوئی صورت پیدا نہ ہو ورنہ پڑھی لکھی روشن خیال نسل حق و باطل کی تمیز کرنے لگے گی۔ ادھر عزاداری حسینؑ کا مقصد و منشاء ہی یہ ہے کہ حق اور طاغوت کا مسلسل موازنہ ہوتا رہے اور مسلمانوں کو یہ بتایا جاتا رہے کہ قرآن کس کے ساتھ ہے اور کن لوگوں سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ معرکۂ حق و باطل ابتدائے آفرینش سے چلا آتا ہے۔

اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

فیضؔ صاحب اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ باوجود انتہائی کوششوں اور روایتی شیعہ دشمنی کے عزاداری بند نہ ہو سکی۔ درج ذیل بند میں موصوف نے اس دعوے کو بڑی گھن گرج کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

آٹھوں پہر ہیں یہ اسی کوشش میں مبتلا ہو جائے بند نوحہ و ماتم حسینؑ کا
ہیں منبرِ رسولؐ پہ کہتا ہوں برملا یہ کیا ہیں یہ تو ان کے بڑوں سے نہ ہو سکا
دنیا کا غم نہیں، غمِ سرورؑ کا داغ ہے
روشن ہے آندھیوں میں بھی ایسا چراغ ہے

فیضؔ صاحب کی شاعری میں عزاداری سے والہانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ موصوف اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ جان جائے لیکن غمِ حسینؑ اور عزاداری باقی رہے۔ وہ اس عزم و ارادہ کا اظہار کرتے ہیں کہ شیعہ نسل در نسل قربانیاں پیش کرتے رہیں گے لیکن اپنے اس حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں کہ عزاداری ترک کر دیں۔ فیضؔ صاحب اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتے ہوئے کس تیکھے انداز میں باطل کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اظہار کرتے ہیں ؎

کیا ہم کو قتل کرنے سے سادات ہوں گے کم پھر اپنی نسل آئے گی مر جائیں گے جو ہم
جادے سے حق کے ہٹ نہیں سکتے کبھی قدم جب تک ہے اپنے دوش پہ عباسؑ کا علم
باطل مٹا کے ظلم و ستم کو اجاڑ کے
دم لیں گے حال کا درِ خیبر اکھاڑ کے

فیضؔ صاحب غمِ حسینؑ کی آفاقیت و ہمہ گیری کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ وہ غم ہے جس میں ہر قوم شریک ہے۔ خواص و عوام سب ہی مختلف انداز میں اس غم میں شریک ہوتے ہیں۔ اکثر کربلا کے پیاسوں کے نام پر سبیلیں لگاتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں نامِ حسینؑ سننا گوارہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نابکاروں کو جو نواسۂ رسولؐ سے رنجش رکھیں انہیں یزید ہی کہا جا سکتا ہے۔ مرحوم اپنے اشعار

میں بار بار اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ غم حسینؑ کو دوام نصیب ہے۔ نیز یہ کہ اسے جتنا دبانے کی کوشش کی گئی، اسے اتنا ہی فروغ حاصل ہوا۔ دیکھئے موصوف نے اس حقیقت ابدی کو کس سلیقے سے بیان کیا ہے:-

ہر قوم ہے شریک غم شاہ تشنہ کام   کتنی جگہ سبیلیں لگاتے ہیں خاص و عام
قدرت کے ہاتھ جس کی اشاعت کا ہے نظام   فانی ہے کائنات اور اس غم کو ہے دوام
کچھ وہ بھی ہیں جو بیٹھ نہیں سکتے چین سے
یہ سب یزید چلتے ہیں نام حسینؑ سے

ایک بیت میں فرماتے ہیں کہ:-   ماتم ہوا نہ بند شہ مشرقین کا
غیروں کے دل پہ اب تو ہے سکہ حسینؑ کا

ایک دوسری بیت میں مخالفین عزاداری کی ناکامیوں اور فروغ عزا کو یوں پیش کرتے ہیں:-

اس ظلم سے مراد دلوں کی نہ پاؤ گے
ابھرے گا غم حسینؑ کا جتنا دباؤ گے

فیض صاحب نے اس مرثیہ میں عظمری کے ظالموں کے خلاف اپنے بھرپور جذبات کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ مخالفین عزاداری اور دشمنان اہل بیت کی تاریخ کے آئینے میں بھیانک شکلیں بھی دکھائی ہیں۔ الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال، سلاست اور فن شاعری کے کمال کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:-

بدنام، بدلگام، بدانجام، نابکار   بدعہد، بدنگاہ، بدافعال، بے وقار
بدبخت، بدقماش، بداخلاق، کج مدار   بدکار، بدسرشت، بدآئین، بدشعار
ابلیس وقت سے جو انہیں ساز باز ہے
اس کی طرح سے ان کی بھی رسی دراز ہے

اس سلسلہ میں ایک اور بیت میں جو آمد، بیساختگی اور الفاظ کی بندش پر قدرت کی بھی ایک اچھی مثال ہے، فرماتے ہیں:-

سفاک ہیں یزید بدانجام کی طرح
کالے ہیں اور سیاہ ہیں ہندہ کے دل شام کی طرح

فیض صاحب کا یہ مصرعہ ؎ "دنیا میں نسل اب بھی ہے باقی یزید کی"..... حقیقت کی طرف نشاندھی کرتا ہے۔ بقول حضرت جوش ملیح آبادی ؎

نام یزید داخلِ دشنام ہوگیا

اس لئے آج کوئی بھی مسلمان خود کو یزید کی نسل سے ظاہر نہیں کرتا۔ اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یزید کی نسل معدوم ہوگئی لیکن ایسا نہیں۔ حسینؑ کے غم کے مظاہروں کی مخالفت اور عزادارانِ حسینؑ پر مظالم کا انداز بتاتا ہے کہ یزید کی نسل باقی ہے۔

فیض صاحب نے جہاں اس مرثیے میں تاریخی حقائق کے اظہار میں خوبصورت تشبیہات اور استعاروں کا بھرپور استعمال کیا ہے، وہاں آپ کے اشعار اخلاقی، ناصحانہ اور عبرت آموز بھی ہیں۔ ان میں مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ سوجھ بوجھ، بصیرت اور عمیق فکر کی نشاندھی بھی ہوتی ہے اور موصوف کی عزاداریٔ سید الشہداؑ سے بے پناہ عقیدت کا اظہار بھی۔ محاسن کلام کے ساتھ ایک خاص انداز جس نے اس مرثیہ کو انفرادیت کی خلعت عطا کی، وہ یہ کہ فیض صاحب نے ٹھٹھری میں شہید ہونے والوں میں سے ۷ کے نام اس مرثیہ میں اس خوبصورتی سے نظم کیے ہیں کہ وہ مصرعوں کا جز اور مرثیہ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اگر خطِ جلی میں نہ لکھے جائیں تو کوئی بھی قاری انہیں شہدا کے نام نہیں سمجھ سکتا۔ یہ فیض صاحب کی قادر الکلامی کی بہترین مثال ہے۔ فیض صاحب کا ایک علمی کارنامہ بڑا عظیم ہے۔ مثلاً ٹھٹھری میں شہید ہونے والوں میں ایک نام بچل ہے جو سندھ میں بڑا مقبول ہے۔ اس نام کو استعمال کرتے ہوئے کیا خوبصورت مصرعہ کہا ہے ؎

کہتا ہے دل کہ نار سے بچ چل سوئے امام

دیگر چند شہدا کے نام ہیں: حق، عزیز، یوسف، صاحب دین، نازل، حبیب، حیدر۔
اب درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

حق کے عزیز یوسف یثرب کے جاں نثار ایماں کی اصل صاحب دیں فخر روزگار
ایسے کریم بخشش دیں اونٹوں کی جو قطار نازل ہوئے ہیں مدح میں آکے یہ افتخار
احمد بہ فیضِ حق جو حبیب خدا ہوئے
حیدر بھی دو جہاں کے مشکل کشا ہوئے

اسی طرح شہدائے ٹھٹھری کے دو ناموں خادم حسین اور محب حسین کو کس خوبصورتی سے اس بیت میں نظم کیا ہے ؎

سرمایہ قوم کا دل فطرت کا چین تھے
خادم حسین کے تھے محب حسین تھے

شہید ہونے والوں میں ایک کا نام جھنڈا تھا۔ درج ذیل بیت میں اس نام کو کس سلیقہ اور معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے:

دم ختم سے ان کے زور گھٹا کاذبین کا
جھنڈا اگرا ہے کفر کی سرحد میں دین کا

فیض صاحب نے اس مرثیہ میں تمام شہدائے ٹھٹھڑی کے ناموں کا ذکر بھی کر دیا اور مرثیہ کو بوجھل بھی نہیں ہونے دیا۔ یہ ان کا ایسا منفرد ہنر ہے کہ مرثیہ نگاری کی ارتقائی تاریخ میں اس شعری ہنرمندی کی مثالیں خال خال ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض صاحب ناموں کو ان کی معنویت کے علاوہ ان کی شخصی صفات کے ساتھ شعر میں موزوں کرنے کی صلاحیت کے معاملے میں دیگر شعراء سے ممتاز ہیں۔ وہ نام کی معنویت کو شخصیت سے نہ ضم ہونے دیتے ہیں نہ شخصیت کو نام کی صفات سے الگ کرتے ہیں اور جہاں جہاں یہ نام مجازاً استعمال ہوتے ہیں، اہلِ بیت اور دیگر اصل ناموں سے غلط ملط نہیں ہوتے۔ یہ یقیناً حرف و الفاظ کی ایسی صناعی ہے جو فیض بھرتپوری کو بطور خاص قدرت نے ودیعت کی تھی۔

فیض صاحب کا یہ ورثہ اگر نوجوان شاعروں تک پہنچ کر زندہ رہا تو منظوم تاریخ نویسی کا فن یقیناً ترقی کر سکتا ہے جو نثری تاریخ سے زیادہ انسانی یادداشت میں محفوظ رہنے اور آئندہ نسل تک منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ——— بہرحال فیض بھرتپوری نے اس مرثیہ میں ٹھٹھڑی کے واقعہ کو بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ موصوف اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ بھرت پور سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے جہاں تخلیق پاکستان کی پاداش میں مسلمانوں اور بالخصوص سادات و مومنین کا بڑے پیمانے پر قتل عام ہوا تھا ——— لیکن جب پاکستان میں سادات و مومنین کے خلاف مسلمان رجعت پسندوں کا اسی قسم کا انتہا پسندانہ رویّہ دیکھا تو تڑپ اٹھے۔ یہ مرثیہ اسی ظلم و تشدد کے خلاف ایک کرب انگیز چیخ ہے۔ مملکتِ پاکستان میں جو معتدل مزاج اور ترقی پسند برادرانِ اہلِ سنت کے دوش بدوش شیعانِ حیدرِ کرار کی کاوشوں کے طفیل معرضِ وجود میں آئی معمولی معمولی بہانوں اور حیلہ سازیوں سے عزادارانِ حسینؑ کا قتلِ عام اور اس کا تسلسل ٹھٹھڑی کے بعد ۱۹۷۸ء میں علی بستی گولیمار اور سنہ ۱۹۸۳ء، سنہ ۱۹۸۴ء میں پے در پے لیاقت آباد (لالوکھیت)، گل بہار (گولیمار) اور سادات کالونی، فیڈرل بی ایریا میں لاتعداد سادات و مومنین کی شہادت، ان کی املاک کی تباہی و بربادی شعائرِ اسلام امام باڑوں، تبرکاتِ عزا، مساجد اور کلام پاک کی بے حرمتی پھر دیگر

ـــــ شہروں میں اس کا اعادہ اور بانیانِ ظلم کے خلاف کسی کارروائی کا نہ ہونا، حکومت کی سرد مہری کی وجہ عزاداری اور عزادارانِ امام حسینؑ سے روایتی دشمنی کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کے دشمن پاکستان مخالف امویت کے عشق میں مبتلا رجعت پسند تحریکِ پاکستان کے دوران اپنی شکست و رسوائی کا بدلہ محبانِ اہلِ بیتِ رسولؐ سے لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں وقفہ وقفہ سے ان خونچکاں واقعات کی تکرار کیا عزادارانِ حسینؑ کو سوچنے پر مجبور نہیں کرتی؟ کہ ظلم و بربریت کے اس تسلسل کو کس طرح روکا جائے۔ اس تشدد پسند طبقہ کا علاج کیا ہے؟ گذشتہ واقعات شاہد ہیں کہ شیعانِ حیدرِ کرار کی بزعم خود عقل و دانائی اور عبقریت انہیں محفوظ نہ رکھ سکی ـــــ کیا صرف داستانِ مظلومیت بیان کرنے سے حسینیت کے خلاف یزیدیت اپنی جفا کاریاں ترک کر دے گی؟ ـــــ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں کمزور کو عزت سے جینے کا حق نہیں ملتا۔

فیض بھرتپوری نہ صرف یہ کہ خاندانی عزادار، مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے بلکہ خود کو شبیرؑ کے "مستانوں" میں شمار کرتے تھے جیسا کہ ایک بیت میں فرمایا ؎

ہے رقم نام جو شبیرؑ کے مستانوں میں
کیوں نہ ہو؟ ہوش سنبھالا ہے عزاخانوں میں

عزاداریٔ سیدالشہداءؑ، فیض صاحب کے شعور ہی میں نہیں بلکہ تحت الشعور میں پائی جاتی تھی وہ عزاداری کے ایسے علاقے اور روایتی ماحول کے پروردہ تھے جہاں اسے عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ جہاں کی مراسمِ عزا، اخلاصِ عمل کا مظہر تھیں۔ جہاں عزاداری کی مخالفت کا خارجی انداز اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھا وہاں داخلی طور پر بزعم خود مصلحینِ قوم اور پیشہ ور ذاکرین کو بھی وہ فروغِ عزا میں ایک رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ فیض نے "تبرک" کے عنوان پر ایک مرثیہ کہا، جس کا مطلع ہے ؎

مجھ کو سب خسروِ اقلیمِ سخن کہتے ہیں ؎

اس مرثیہ میں جو ۱۲ بندوں پر مشتمل ہے، فیض صاحب نے تقسیم تبرک کی اہمیت اور افادیت پر بحث کی ہے۔ نیز خود ساختہ علاماؤں کے انداز، کردار اور علمی کم مایگی پر بھرپور طنز کیے ہیں۔ اس مرثیہ میں فیض صاحب نے بڑے سلیقے سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ گریہ ایک فطری عمل ہے۔

فیض صاحب تبرک کو مجلس کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ وہ اس

نظریہ کے حامی تھے اور حق بجانب بھی کہ مجلس عزا میں بچوں کی شرکت کا بہت بڑا سبب تبرک کا حصول ہوتا ہے۔ تبرک کے شوق میں مجلس میں بچوں کی شرکت کی افادیت یہ ہے کہ اس طرح وہ دینی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے۔ آداب و علم مجلسی سے واقف ہو جاتے ہیں۔ حفظ مراتب کا خیال رہتا ہے۔ دینی مسائل اور تاریخ اسلام کا علم ہوتا ہے۔ کردار سازی ہوتی ہے ___ مجلس ایک مکتب علمی ہے جس میں شرکت سے بہت سی کام کی باتیں کانوں میں پڑ جاتی ہیں۔ بچپنے کے تاثرات تمام عمر یاد رہتے ہیں ___ جو زندگی کو بنانے سنوارنے میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بیت میں تبرک کی افادیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

طفل مجلس میں تبرک کے لئے آتے تھے
چند جملے ہی سہی کان میں پڑ جاتے تھے

اور تبرک تقسیم نہ کرنے کے مضر اثرات کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔

کر کے شرکت جو تبرک یہ نہیں پائیں گے
طفل پھر کس لئے مجلس میں بھلا آئیں گے

فیضی صاحب کا یہ یقین محکم تھا کہ مجالس میں تبرک کی تقسیم ضروری ہے تاکہ اس شوق میں بچے مجلسوں میں شرکت کے عادی ہو سکیں اور جب ابتدائی عمر میں وہ اس کے عادی ہو جائیں گے تو عمر بھر یعنی عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس عادت میں پختگی پیدا ہو جائے گی اور پھر تبرک کے بغیر بھی اس مکتب علمی سے وابستگی برقرار رہے گی۔

عمر کے ساتھ ہی بڑھتا تھا جو بچوں کا شعور
خود بخود ہوتا تھا احساس تبرک کافور

تبرک کی تقسیم میں کمی کی وجہ موصوف نے یہ بتائی ہے۔

شیر مادر کی طرح ہضم یہ کر جاتے ہیں
اب تو علامہ تبرک کی رقم کھاتے ہیں

فیضی مرحوم کا خیال تھا کہ جو رقم تبرک پر خرچ ہونی چاہئے تھی اور جس کشش میں بچے مجلس میں شریک ہو کر علم دین حاصل کرتے تھے۔ وہ پیشہ ور ذاکر و مول

کر لیتے ہیں۔ اس طرح بچے مجالس میں شریک نہیں ہو پاتے جس سے تبلیغ دینی متاثر ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے جس پر مختلف آراء ہو سکتی ہیں تاہم تبرک کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر اس میں انا کی تسکین، ذاتی شہرت اور عصبیت کو دخل نہ ہو تو یہ بچوں کے ساتھ عزاداری سے بے بہرہ اغیار کو بھی قریب لائے، مجالس عزا میں شرکت کرتے اور اس طرح حق آگاہی اور تبلیغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض صاحب عزاداری کے معاملہ میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے۔ جس رخ سے بھی عزاداری متاثر ہوتی نظر آتی ان کا یہ احساس شعری صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ موصوف عزاداری میں اخلاصِ عمل کے قائل تھے، اس لئے پیشہ ورانہ ذاکری کے نہ صرف سخت مخالف تھے بلکہ ایسے دور میں جبکہ ان پیشہ ور ذاکرین اور ان کے عقیدتمندوں کا طوطی بول رہا ہو، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا لیکن مرحوم فیض صاحب نے اپنے اس مرثیہ میں بڑی جرأت مندی اور حوصلہ سے خود ساختہ علاماؤں پر بھرپور وار کیے ہیں ـــــ یوں تو فیض صاحب سے قبل بھی شعراء عظام نے اپنے اشعار میں ان خود ساختہ ذاکرین کی پیشہ ورانہ ذہنیت اور علمی کم مائیگی سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں:

عشرۂ ماہِ محرم عید ہے ان کے لئے

حضرت نجم آفندی اکبرآبادی نے ارشاد فرمایا:

تقریر کا آج کوئی معیار نہیں
منبر پہ جسے چاہے بٹھا دے ملت

حسین اعظمی نے فرمایا:

بڑھ گئی ہے اس قدر بوجہلیت اس دور میں
جس کو دیکھو وہ نظر آتا ہے علامۂ یہاں

جناب فیض بھرتپوری نے نسبتاً سخت لہجہ میں علمی معیار کے گر جانے اور خود ساختہ قسم کے علاماؤں کے کردار پر طنز کیا ہے:

دین کے علم کا کچھ ایسا گرا ہے معیار — دھم سے جس طرح گرے ریت کی کوئی دیوار
عالموں میں ورقِ سادہ کا ہوتا ہے شمار — ملتا جلتا سا ہے بوجہل سے ان کا کردار
خود ستائی کی عبا جہل کا عمامہ ہے
جس کو دیکھو وہی اس دور کا علامہ ہے

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ منبر کا تقدس اور وقار جاتا رہا ہے۔ ذاکرین کا یہ عالم ہے کہ کچھ تو ایسے ہیں جن کی کوئی علمی حیثیت نہیں بلکہ صحیح معنوں میں لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا۔ خود کو ریسرچ اسکالر کہلواتے ہیں اور زیبِ منبر ہوتے ہیں اور کچھ رٹے رٹائے جملوں، چرب زبانی اور شعلہ بیانی کے طفیل "علامہ" کہے جانے لگے ہیں۔ اکثر کی دینی علوم سے واقفیت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ۱۰ صحیح حدیثیں عربی میں لکھ کر اردو ترجمہ اور ۱۰ آیات قرآنی صحیح اعراب کے ساتھ لکھ کر ترجمہ کردو تو نہ کرسکیں گے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو صحیح تلاوت بھی نہیں کرپاتے۔ اکثر کے متعلق علماء کی رائے ہے کہ وہ تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ علمِ حدیث، فقہ اور تاریخ سے واجبی سی واقفیت ہے۔ جہاں تک کردار کا تعلق ہے وہ عیاں راچہ بیاں! اس قدر داستانیں ہیں کہ کچھ نہ کہنا ہی مناسب ہے۔

یہ قوم کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ ہمارے بیشتر علماءِ کرام اور ذاکرین جنھیں قرآن و سنت کا محافظ، قوم و ملت کا نگہبان، تبلیغِ دینی کا ذمہ دار اور قوم کی تشکیلِ سیرت کا معمار ہونا چاہئے تھا، پیشہ ور ذاکرین کر جنگِ زرگری میں مبتلا ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں بندر روڈ، کراچی پر کچے مکان اور پکے ایمان کا نعرہ لگانے والے علماؤں پر طعنہ زن مولوی صاحبان بھی اندرون و بیرونِ ملک پیشہ ورانہ ذاکری کے طفیل پختہ مکانوں، جائیدادوں اور گاڑیوں کے مالک ہو چکے ہیں۔ ایمان کا حال خدا بہتر جانتا ہے کہ پختہ مکانوں کے حصول کے بعد کچا ہوگیا یا پختہ رہ گیا —— فیض صاحب عزاداریٔ سید الشہداء میں معمولی سی تصنع اور بناوٹ کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ذاکریں خواہ وہ سوزخواں ہو، مرثیہ خواں ہو، سلام پڑھتا ہو یا نوحہ خواں ہو، ایثار و قربانی کے جذبہ کی کارفرمائی دیکھنا چاہتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے اسلام کو بچانے کی خاطر بھرا گھر لٹا دیا اور وہ عظیم قربانی پیش کی جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی اور ان کے نام لیوا اور برائے نام عاشقانِ حسینؑ اس عظیم قربانی کو حصولِ ثواب کے بجائے منفعت کا ذریعہ بنالیں، یہ صورتِ حال مومنین کے لئے باعثِ تشویش اور نجی محفلوں میں گفتگو کا موضوع رہی ہے —— لیکن فیض صاحب نے اخلاقی جرأت سے کام لیا اور اسے نظم کرکے اشاعت فرمادی —— دو بیت اور ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

پیسہ لے لے کے مجالس جو پڑھا کرتے ہو
کیا یونہی اجرِ رسالت کا ادا کرتے رہو ؟

اجر گر لے لیا یاں، حشر میں کیا پاؤ گے
میں سمجھتا ہوں کہ دھتکار دیے جاؤ گے

○

ہیں دھواں دار تقاریر میں یہ سب ہوشیار
ان کو علامہ نہ کہیئے کہ یہ سب ہیں فنکار

فیض صاحب کو چونکہ عزاداری حسین میں گہری دلچسپی تھی اور وہ خود بھی ذاکر تھے، مزید یہ کہ نوعمری سے مرثیہ خوانی کرتے رہے تھے چنانچہ انہیں ذاکرین کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا اور وہ ان کے انداز سے بخوبی آگاہ تھے۔ لہٰذا تلخ حقائق پر مبنی اپنے تاثرات کا وہ بڑی بے باکی سے اظہار فرماتے رہے جو ہمارے لیئے لمحۂ فکریہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ بھی سوچا ہے کبھی تو نے انا کے بیمار   سر پہ ہر وقت ترے بھوت ہے شہرت کا سوار
ہے تصنع پہ تیری زیست کا کل دارومدار   خوش عقیدے کو دکھاوے سے بھلا کیا سروکار
مال و حشمت کو، نہ عالم کو، نہ وہ جاہل کو
پنجتن دیکھتے ہیں صرف خلوصِ دل کو

نوحہ خوانوں کا بھی اس دور میں دیکھا یہ چال   مفت کے مال کو گردانتے ہیں اکل حلال
اس بری رسم کی دنیا میں نہیں کوئی مثال   سوزخواں بھی تو بڑھانے لگے اب دستِ سوال
ناروا فعل کا ہر شخص ہی دلدادہ ہے
کسبِ زر کے لئے خودساختہ یہ جادہ ہے

بنتِ حوّا نے بھی اب پاؤں نکالے ایسے   مجلسیں پڑھنے کے، کرتی ہیں طلب یہ پیسے
یہ سمجھ کر کہ یہ حقدار ہیں اس کی جیسے   کسبِ زر کے یہ نکالے ہیں طریقے کیسے
رٹ کے مجلس یہ امیروں میں تو پڑھ لیتی ہیں
عذر سو طرح کے مفلس سے یہ گھڑ لیتی ہیں

فیض صاحب کی نظر میں پیشہ ور ذاکروں کی علمی حیثیت بھی مشکوک ہے۔ وہ انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سامعین میں پڑھے لکھے حضرات بھی ہوتے ہیں، لہٰذا منبر پر لایعنی باتیں بیان کرنا جن میں بغض وحسد

اور ریاکاری بھی شامل ہو، سامعین کو کیسے متاثر کر سکتی ہیں۔ نیز یہ کہ ذاکر کا کردار مثالی نہ ہو تو سننے والوں پر وہ کیسے اثر انداز ہو سکتا ہے؟

ذیل کے دو بند قابلِ غور ہیں:

اس طرح کرتا ہے منبر سے روایات بیاں
جس سے ہے بغض و حسد، کبر و ریا صاف عیاں
ذاکرِ شبیرؑ یہ سمجھ کر بخدا کھول زباں
کچھ پڑھے لکھے ہیں مجلس میں ترے آئے ناداں
ذہن میں سامع کے مطلق نہ جگہ پاتی ہے
ایسی تقریر تو سر سے ہی گذر جاتی ہے

پیروِ پنجتنِ پاک مجھے یہ تو بتا!
ان کے گھر میں بھی کوئی عیش کا ساماں دیکھا
باعثِ فخر تھا ان کے لئے فقر و فاقہ
ترک کی دنیا اور اسلام پہ کی جان فدا
صدقِ دل سے تو مگر پیروِ شبیرؑ نہیں
یہ سبب ہے کہ بیاں میں ترے تاثیر نہیں

اسی طرح ایک بیت میں پیشہ ور ذاکرین کے قول و فعل کے تضاد کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

قول اور فعل میں تکرار نظر آتی ہے
ساری تقریر ہی بیکار نظر آتی ہے

درج بالا مثالوں سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ فیض صاحب تمام ذاکرین کے متعلق ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ وہ ایسے ذاکرین سے بھی واقف تھے جو ذاکری کو ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ہمہ وقت بلا معاوضہ ذاکری میں مشغول ہیں۔ فیض صاحب ماضی اور حال کے ایسے ذاکرین کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں ؎

قابلِ دید تھا یہ ذاکرِ شبیرؑ کا کردار
نہ تصنع نہ بناوٹ نہ تجارت درکار

○

گوہرِ اشک یہ دیتے تھے بطور سوغات!
ان کے اعمال میں لکھتے تھے فرشتے حسنات

اور کچھ دیکھے ہیں ایسے بھی جہاں میں ہو محسن
سن کی کچھ قید نہیں ہے وہ جواں ہوں کہ مسن
ذکرِ شبیرؑ میں مشغول ہیں ہو رات کہ دن
دست کش قوم سے اجرت کے ہیں یہ سب محسن

مجلس شاہِ شہیداں یہ پڑھا کرتے ہیں
ذکرِ شبیرؑ کا یہ مفت کیا کرتے ہیں

— دراصل فیض صاحب یہ چاہتے تھے کہ ذاکرین کرام بلامعاوضہ خدمات انجام دیں تاکہ تبلیغ حسینی ہو سکے۔ ان کا انداز ایسا ہو کہ سامعین متاثر ہوں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا تذکرہ واقعات کی روشنی میں صحیح انداز سے کیا جائے تاکہ سامعین کے ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے اور ان میں عظمتِ کردار کی جھلک پیدا ہو سکے۔ خود ذاکرین عمل کے ایسے نمونے پیش کریں کہ ان کو سننے اور دیکھنے والوں میں بھی ذوقِ عمل پیدا ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ مبلغین کے الفاظ سے نہیں بلکہ کردار سے لوگ متاثر ہوتے رہے۔ ہر مذہب و ملت کے فروغ میں ان کے مبلغین کے کردار کو بڑا دخل رہا ہے۔ ہمارے ذاکرین کی حیثیت بھی ایک مبلغ کی ہے۔ عوام انہیں بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار کے نہیں صرف گفتار کے غازی ہیں تو بدظنی لازمی ہے۔ ہمارے ذاکرین کے گفتار و کردار کے اس تضاد نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ تبلیغ عزا متاثر ہوئی۔ غیروں کو متاثر کرنا تو درکنار خود اپنوں میں عجیب قسم کا ردِّ عمل پیدا ہو رہا ہے اور قوم جو یوں ہی اقلیت میں ہے، دو حصّوں میں بٹ گئی ہے۔ محراب و منبر کی تقسیم اور ان میں آپس کی چپقلش اور جنگِ زرگری کے نقصانات ہمارے سامنے ہیں۔ نوجوانوں کو بھی یہ حضرات اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر کے ان کی صلاحیتوں کو ضائع کرتے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کا تقاضہ یہ ہے کہ سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کیا جائے — فیض صاحب اس صورتِ حال سے حد درجہ پریشان ہو کر آخر میں صدائے استغاثہ بلند کرتے ہیں ؎

یا حسنؑ ابنِ علیؑ یا شہِ بطحا مدد دے | ذکرِ شبیرؑ بھی اب بکتا ہے آقا مدد دے
طفل گمراہ ہوئے جاتے ہیں مولا مدد دے | یہ مرض ہو گیا ہے عام مسیحا مدد دے

صبحِ امید کی اب شام ہوئی جاتی ہے
ساری تبلیغ ہی ناکام ہوئی جاتی ہے

مخالفت میں خصوصاً مخالفتِ عزاداری میں اموی اور نجدی ذہنیت کے حامل افراد رونے کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ اثباتِ گریہ میں فیض صاحب نے بڑے مضبوط دلائل پیش کیے ہیں۔ ناظرین درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں ؎

تذکرے ظلم کے شبیرؑ پہ جب ہوتے ہیں   یہ سبب ہے کہ غمِ شاہؑ میں ہم روتے ہیں
جاگتے رہتے ہیں دن رات نہیں سوتے ہیں   پیٹتے ہیں سر و سینے کو بھی جاں کھوتے ہیں
نوحہ خوانی کے سبب چشم ہماری نم ہے
ہے عجب بات کہ اغیار کو اس کا غم ہے

ان سے کہتے نہیں ہم گریہ و ماتم کے لئے   غم ہمارے لئے ہے اور ہیں ہم غم کے لئے
گوہرِ اشک بنے دیدۂ پرنم کے لئے   شرط گریہ کی ہے پیدائشِ آدم کے لئے
جو کوئی بعد ولادت نہیں رو پاتا ہے
ایسے مولود کو مُردوں میں گنا جاتا ہے

نوجواں، طفل، ضعیف اور قوی روتے ہیں   شاہ و درویش بھی محتاج و غنی روتے ہیں
انبیاءؑ، جنّ و ملک اور ولی روتے ہیں   مختصر یہ ہے کہ دنیا میں سبھی روتے ہیں
جان کو ہجر میں حوّا کی ہیں کھونے والے
سرِ فہرست تو آدمؑ ہی ہیں رونے والے

معترض! بعد ولادت ترے روئے اجداد   تو بھی رویا ہے یہ ماں باپ کو ہوگا ترے یاد
بے خبر! گریہ و زاری میں ہے انساں کا مفاد   سنّتِ حضرت آدمؑ ہے یہ کیا الحاد
منکرِ گریہ بہانے کا عبث جویا ہے
کون ہے ایسا جو دنیا میں نہیں رویا ہے
تذکرہ گریہ کا واللہ ہے قرآں میں بہم   ہجرِ یوسفؑ میں رہے دیدۂ یعقوبؑ بھی نم
روئے ہیں لاشۂ حمزہؑ پہ رسولِ اکرم   حضرت نوحؑ بھی روئے ہیں جہاں میں پیہم
خالی خولی ہی سا اسلام کا دم بھرتے تھے
کیا یہ حضرات بھی بدعت پہ عمل کرتے تھے

شرم کر شرم، ارے دشمنِ دین و ایماں   انبیاءؑ تک پہ تجھے ہوتا ہے بدعت کا گماں
یہ اگر اس میں ملوث ہیں تو پھر دین کہاں   تذکرے ان کے ہیں قرآں میں عیاں را چہ بیاں
مستعد ہو گیا تو نار میں جانے کے لئے
اپنے اسلاف کے ایماں کو بچانے کے لئے

فیض صاحب جیسا کہ آپ کے مرثیوں سے ظاہر ہے، اخلاص عمل میں یقین رکھتے تھے۔ عزائے سیّد الشہداءؑ اگر خلوصِ نیّت سے برپا کی جائے تو وہ معجزے رونما ہوتے

ہیں کہ انسان انگشت بدنداں و حیران رہ جاتا ہے۔ فیض صاحب نے ایسے ہی ایک چشم دید واقعہ کو نظم کیا ہے جس کے دیکھنے والے ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بھرتپور میں بارش نہ ہونے کی بناء پر جب ہندو اور مسلمان اور دیگر اقوام کی دعائیں اور کوششیں ناکام اور بے سود ہو گئیں تو پھر محبتِ اہل بیت میں سرشار حسینیوں نے علم کے ساتھ کربلا جا کر ماتم کیا۔ دو رکعت نماز پڑھ کر بارگاہِ احدیت میں دعا کی اور ماتم اس وقت تک جاری رکھنے کی نیت کی جب تک بارش نہ ہو جائے۔ کربلا کے پیاسوں کے نام پر دعا کا اثر تھا کہ ابرِ رحمت جوش میں آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا۔ ہندو اور مسلمان سب متاثر اور کربلا والوں کے شکر گزار تھے۔ اس واقعہ کو فیض صاحب نے کس خوبصورتی سے نظم کیا اور محبتِ اہلبیت کے جذبے کا بھرپور انداز میں اظہار کیا جو آپ کے کلام کی خصوصیت ہے۔

جنگ کو فتح کیا شاہؑ نے بے سر ہو کر
قطرۂ پانی نہ پیا مالکِ کوثر ہو کر
فیض بارش کے لئے شیعوں نے ماتم جو کیا
ابر بھی رویا شریکِ غمِ سرورؑ ہو کر

شیعوں کو ملا فیض یہ کس کے گھر سے
عزت ہوئی حاصل یہ علیؑ کے در سے
صدقے میں حسینؑ ابن علیؑ کے اے فیض
گر ابر کو حکم دیں تو پانی برسے

فیض صاحب مرحوم کے کلام کے نمونے بتا رہے ہیں کہ ایک مرثیہ گو شاعر بڑی محنتا و کاوش کے بعد مرثیہ گوئی تک پہنچتا ہے۔ مرثیہ گوئی کے لئے اعلیٰ اقدار کی ترجمانی سے اخلاقیات کے کمال سے شناسا ہونا اور انسانی تہذیب و تطہیر کے طریقے اور انداز سے باخبر ہونا ضروری ہے کیونکہ مرثیہ نے اردو شاعری کو وہ مضامین اور مقام عطا کیے ہیں جو شاعری کی کوئی دوسری صنف اسے نہ دے سکی۔

فیض صاحب محبِ اہل بیت تھے اور قولِ معصوم ہے کہ:
مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ فَقَدْ مَاتَ شَهِيدًا

اور یوں بھی ہے

علم کی شمع کو روشن جو کیا کرتے ہیں
زندہ رہتے ہیں ہمیشہ وہ کہاں مرتے ہیں

آغا محمد اصغر صاحب

آہ فیض بھرتپوری

میں نے ۱۹۴۸ء میں جب پرنسس اسٹریٹ کے مرکزی حکومت کے اسکول میں (جو اب گورنمنٹ سکینڈری اسکول کوتوالی بلڈنگ کہلاتا ہے) ملازمت کی ابتداء کی تو وہاں میرے شریک کار جناب ارشاد حسین زیدی بھی تھے۔ ان کا قیام بھی حیدری کیمپ میں تھا۔ ان کے ہمراہ جب کیمپ میں جانا ہوا تو فیض صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک وہ صرف سلام، نوحے، قطعات، غزل اور رباعی کہتے تھے اس کے بعد مسلسل ان سے رابطہ رہا۔ اور ان کے فرزند اکبر باقر زیدی اسی ناطے میرے گھر پڑھنے آتے رہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ فیض صاحب اس "قرض" کو بھی اُتار دیں گے۔ اور میرے بڑے بیٹے آغا نیّر سلمہ کو اپنی شاگردی میں لے کر اس کی شاعرانہ استعداد میں چار چاند لگائیں گے۔

۱۹۸۱ء کے بعد فیض صاحب سے اس نئے سلسلے میں اکثر ملاقات رہی۔ اگرچہ میرا تدریسی مضمون ریاضی رہا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ ادب سے لیا دیا سا ہی لگا رہا ہے لیکن اہلبیت کی محبت جس کلام میں رچی بسی ہو تو اس کی داد کون نہ دے گا؟ فیض صاحب اکثر غریب خانہ پر منعقدہ مسالمہ، محفلِ نعت و دیگر مواقع پر شریک ہوتے اور اپنے کلام سے ہی نہیں محظوظ نہیں کیا بلکہ صدارت بھی فرمائی۔ ان کے کئی مراثی میری نظر سے گذرے۔ کشمیر، دہلی میں مومنین کے خون کی ارزانی نے فیض صاحب کو خون کے آنسو رلائے اور اس سے متاثر ہو کر جو مرثیہ انہوں نے کہا ہے کہ اس میں شہداء کے ناموں کو اس روانی اور کہنہ مشقی سے اشعار میں سجایا ہے کہ وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۸۹ء کو اہلبیت کا شاعر عاشق حسین اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا ۔ آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

سیّد شہنشاہ حسین شفق اکبر آبادی

○

آہ فرزند حسن فیض...

مرحوم اس حیثیت سے میرے بھائی تھے کہ ان کو میری حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں۔ اس قریبی رشتے کے علاوہ مرحوم کے والد مرحوم سیّد اکرام حسین صاحب زیدی المتخلص بہ کلیمؔ، میرے والد مرحوم سیّد شجاعت رضوی کے کسی رشتے سے ماموں زاد بھائی تھے۔

فیضؔ صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات، پاکستان قائم ہونے کے بعد کراچی میں ہوئی۔ اس وقت ان کے فرزند اور ایک دختر ان کے ہمراہ تھیں ــــ فیضؔ صاحب رشتے میں میرے خورد اور عمر میں مجھ سے چار سال بڑے تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں اور میں ۱۹۱۵ء میں اس دار فانی میں آئے جبکہ ان کی زوجہ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئیں جو میری حقیقی چچازاد بہن تھیں ــــ فیضؔ صاحب مرحوم مع اہل و عیال اور میرے عم مرحوم اپنے اہل و عیال اور چچا اکرام صاحب کلیمؔ مرحوم، ہندوستان سے کراچی پہنچنے کے بعد پرانا حاجی کیمپ میں قیام پذیر تھے جبکہ رنچھوڑ لین، کراچی میں سندھی مہاجنوں کے ایک متروکہ دھرم شالے میں مستقل قیام کا موقعہ خوجہ حضرات کے توسط سے مل چکا تھا۔ بہرحال بہت جلد وہ وقت آگیا کہ راج کوٹ مہاجن کرویا واڑی، حیدری کیمپ کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس میں اعزاء آکر آباد ہو گئے جن میں بطور خاص عم محترم سیّد ہدایت علی صاحب مع اہل و عیال، عم محترم مرحوم سیّد اکرام حسین صاحب کلیمؔ، برادران محترم سیّد ارشاد حسین صاحب ارشادؔ دہلوی (فیضؔ صاحب مرحوم کے چچازاد بھائی، اور میری ایک دوسری چچازاد بہن کے شوہر) مع اہل و عیال، برادرم سیّد انعام حسین صاحب نویدؔ (فیضؔ صاحب مرحوم کے توام برادر) مع اہل و عیال، برادرم سید فرزند حسن صاحب فیضؔ بھرت پوری مرحوم مع اہل و عیال وغیرہ آکر آباد ہو گئے۔ یہ حیدری کیمپ بعد میں 'حیدری منزل' کے نام سے موسوم اور رجسٹرڈ ہو گیا۔

اب ان اعزاء کے ساتھ فرصت کے اوقات میں میری اکثر نشست رہتی تھی اور اب معلوم ہوا کہ ہمارا خاندان ایک کثیر تعداد شعراء کا حامل ہے اور یہ سلسلہ بہت پرانا ہے ـــــ والد مرحوم کی ننہال کا سلسلہ مرزا فصیح سے جاکر ملتا ہے جس میں بزم آفندی، نجم آفندی وغیرہ تک شامل ہیں۔ فہرست شعرائے خاندان بہت طویل ہے جس کے ذکر کا اس وقت موقع اس لئے نہیں کہ ذکر صرف فیضت کا مقصود ہے۔

مرحوم زودگو اور خوش گو شاعر تھے۔ مرثیہ، سلام، مناقب، مدحیہ قطعات وغیرہ کے علاوہ مادہ ہائے تاریخ نکالنے میں بھی قدرت حاصل تھی۔ مرحوم نے مطبوعہ کلام کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام کا بھی بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

بحیثیت انسان ایسی شخصیت تھی کہ پاس بیٹھ جاؤ تو اُٹھنے کو جی نہ چاہے۔ گفتگو دلکش، لہجہ پرکشش، گفتگو میں مسکراہٹ کی مسلسل آمیزش، طبیعت شگفتہ، طنز و مزاح کے رنگ میں بھی دلکشی ـــــ اگرچہ اولاد پر کبھی کوئی تشدد دیکھنے میں نہیں آیا مگر اس پر رعب اتنا کہ بچے اپنی کسی اشد ضرورت کو بھی باپ سے براہِ راست ذکر کرتے ڈرتے اور موقع پر ماں کا سہارا لیتے ـــــ طبیعت میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بے طلب بھی لوگوں کی مدد اس طرح کرتے کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے، خاص انداز تھا۔

والدین کے انتقال کے بعد بھی ان کے عزت و احترام میں ذرا فرق نہ آنے دیا اور یہی طبیعت مرحوم کی اولاد کو ورثہ میں ملی ہے۔ خوش قسمت تھے اس معاملہ میں کہ اپنے چاروں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کے فرض ادا کرکے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں سب کو گود میں کھلا لیا ـــــ فالج کا حملہ ہوا، سات ماہ صاحبِ فراش رہ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا مگر آخری وقت یعنی فالج کے حملے سے قبل تک مثالی صحت کے حامل رہے۔ ایسی صحت کہ باوجود مجھ سے عمر میں چار سال بڑے تھے، لوگ ان کو مجھ سے عمراً بھی چھوٹا سمجھتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد سے جب بھی ان کا خیال آیا ہے مسکراتا ہوا چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ بہت کچھ ابھی لکھنا باقی ہے مگر اختصار کے پیش نظر اس مصرعہ کے ساتھ مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

راہی جہانگیرآبادی

میرے روحانی ایمانی اور ادبی برادر معظم و محترم و مکرم بھائی فیض صاحب فیض بھرتپوری رحمتہ اللہ علیک سلام علیک رحمتہ اللہ و برکاتہ

آپ محبت محمد و آل محمد صلعم اور اسی محبت میں حیات جاوید سے ایسے ہمکنار ہوئے کہ اب قیامت سے پہلے آپ ملنے والے نہیں۔ آپ کو وہ دن تو یاد ہوگا جب میں کراچی میں اب سے پچیس برس پہلے نو وارد اور تنہا تھا اور نگاہیں کسی ادبی کہنہ مشق فنکار و شفیق فیض رساں مخلص ہمدم کی تلاش میں تھیں۔ آپ ہی کی نگاہِ فیض نے مجھے عزت بخشی اور گلے لگا کر پیار اور محبت سے مجھے اپنا روحانی ایمانی ادبی برادر خورد بنا کر مواخات کا شرف و اعزاز عطا فرمایا اور جذبۂ خلوص قول و عمل سے میرے ہمدم و ہم نوا رہے۔ اس پچیس سال کے عرصے میں آپ نے جتنے بھی مرثیے لکھے سب سے پہلے میرے ہی سامنے عیب جوئی کے لئے پیش فرمائے میں کجا آپ کی خاک پا۔ میری کیا بساط مگر آپ کی محبت اور روحانی رشتہ اور جذباتِ خلوص جسکے اظہار کی طاقت نہیں رکھتا۔ شکایت ہے کہ آپ جوارِ رحمت میں ابدی سکون پاکر مجھے پھر تنہا چھوڑ گئے۔ میں آپکا چھوٹا بھائی کس کو

تعزیت دوں جبکہ میں خود اپنے ہی کو تعزیت کا حقدار سمجھتا ہوں۔ آپ کی یاد نے تڑپایا تو آپ ہی کی مراثی فیض جلد دوئم پڑھنے لگا۔ مرثیہ نمبر تین کے مطلع کے بند کا چوتھا مصرعہ پڑھا ہی تھا کہ بخدا کسی طاقت غیبی نے مجھے میرا دل پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا کہ یہی تو مصرعہ ہے جو فیض صاحب بھرتپوری مرحوم نے اپنی تاریخ وفات پر لکھا ہے۔ اس وقت علامہ رضی جعفر صاحب قبلہ مدظلہ العالی مجتہد العصر میکدہ پر تشریف فرما تھے۔ میں اس غیبی طاقت کے جھنجھوڑنے پر مصرعے کے حروف کا حساب لگائے بغیر علامہ صاحب قبلہ سے مخاطب ہوا کہ دیکھیے دربار خداوندی میں فیض صاحب بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ کی مقبولیت کہ ان کی وفات کی تاریخ کے سلسلہ میں خود ان ہی کا شاندار مصرعہ نکل آیا۔ میں نے یہ بات علامہ صاحب قبلہ سے کہہ تو دی مگر دل ہی دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر حساب لگانے پر میری بات غلط ہو گئی تو کیا ہوگا۔ مگر دل ہی دل میں خدا کے حضور منت بھی مان لی۔ اب جو حساب لگایا تو ایک مرتبہ دو مرتبہ تین مرتبہ حساب لگا کر جائزہ لیتا رہا ہر مرتبہ ۱۹۸۹ء ہی نکلتا رہا۔ علامہ صاحب قبلہ بھی حیران ہو کر دعائے مغفرت کرنے لگے اور انھوں نے بھی مرحوم کی مقبولیت کی داد دی۔

کیا کم شرف ہے یہ کہ علیؑ کا غلام ہوں

سنہ ۱۹۸۹ء

فیض بھائی آپ یہ مصرع کہتے نہ کہتے حضرت علیؑ علیہ السلام کی غلامی کا شرف تو آپ کو حاصل ہی تھا۔ مگر مصرعہ بتا رہا ہے کہ یقیناً حضرت علی علیہ السلام نے بھی آپکو اپنی غلامی میں قبول فرمایا ہے۔ فیض بھائی ایک مومن دوسرے کی شفاعت کریگا آپ تو مقرب بارگاہ عباس نامدار جنت ہو ہی گئے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو شفاعت کے وقت اسی طرح یاد رکھیے گا جس طرح آپ نے زندگی میں اسکو گلے لگا کر عزت و ہمت افزائی فرمائی تھی۔ میں تاحیات آپ کو یاد کروں گا۔ بس پھر تنہا رہ گیا

پروفیسر سید فرحت مظفر جعفری

آہ فیضؔ مرحوم

برادرم محترم سید فرزند حسن زیدی صاحب المعروف فیض بھرت پوری نہ صرف میرے لیے عمر میں بزرگ تھے بلکہ انکے حقیقی چھوٹے بھائی برادرم پروفیسر سید محمد علی زیدی صاحب میرے کلاس فیلو تھے۔

فیض صاحب کا مقام مرثیہ گوئی میں جدید اور کلاسیکل مرثیہ کی اصناف میں ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے اصناف سخن کی نہ صرف خدمت کی ہے اور امامؑ عالی مقام سے اپنی عقیدت کے اظہار میں اس صنف کو نہایت خوبصورتی اور چابکدستی سے برتا ہے بلکہ روائتی علامتوں، تشبیہات، استعارات میں نئے نئے اضافے کئے ہیں جو انتہائی قابل قدر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں بڑی قد آور شخصیتوں کے اسمائے گرامی ہیں اور ذاتی کرب اور آفاقی کرب کے اظہار کے لئے ان بزرگوں نے اپنے فن کے اظہار کے لئے اپنی بھرپور کوششیں کی ہیں لیکن مرثیہ گوئی کے فن کو ہمیشہ مذہب اور محبت امام سے جدا کرکے دیکھنے اور سمجھنے والے کم رہے ہیں۔

ایسے میں بھرت پور کی سرزمین سے جناب فیض بھرتپوری نے اپنی شخصیت اور فن کی انفرادیت اور فن کی جدیدیت اور روایتوں میں نہ صرف ایک حسین پل تعمیر کرکے اپنی حیثیت منوائی ہے بلکہ اپنے آہنگ سے لوگوں کو چونکا بھی دیا ہے۔ اپنی شاعرانہ اور فنی صلاحیتوں سے اردو زبان کی نہ صرف مسلمہ خدمت کی ہے بلکہ اسے آگے بڑھانے کی سعادت بھی حاصل کی۔

فیض بھرت پوری صاحب کے مرثیوں میں اس فن کی اعلیٰ قدروں کی عکاسی بھی ہے زبان کا لوچ بھی اور جدید تقاضوں کی بھرپور نمائندگی بھی۔

میں خود ایک تک بندیے ہوں لیکن کبھی کبھی تنقیدی مضامین پڑھتا یا لکھتا ہوں بہرحال میری رائے اہم ہے یا نہیں۔ فیض صاحب کا کلام بے شک زندہ رہنے والا ہے اور نہایت اہم ہے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

فیض بھرتپوری

حضرت مولانا حافظ عبدالباری صدیقی فاضل فقہ وتفسیر (ایم اے۔ (اسلامیات) لائبریری سائنس

حضرت فرزند حسن فیض بھرتپوری کا شمار ذی علم شعراء میں ہوتا تھا۔ آج بھی انکا کلام ان کی فنکارانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ فیض مرحوم نے ابتداء میں غزلیں بھی کہیں۔ مگر انھوں نے جلد ہی مذہبی شاعری کی طرف خصوصی توجہ دی۔

بحیثیت نعت گو ہم ان کے ذکر کے بغیر جدید نعتیہ شاعری پر گفتگو نہیں کرسکتے ہیں عشق سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم و آلِ اطہار کی مؤدت سے انکا دل معمور تھا اس لئے وہ نعت و منقبت و مرثیہ نگاری کے لئے وقف ہو گئے

نہ صرف یہ کہ وہ علم عروض کے ماہر تھے اور اعلیٰ شاعر تھے بلکہ ان کا یہی اختصاص تھا کہ وہ اہل دل بھی تھے اس طرح انکی شاعری میں زبان و بیان کے اعلیٰ محاسن بھی پائے جاتے ہیں اور ذکر و عقیدت کا معیار و انداز بھی قابل صد ہا ستائش ملتا ہے۔ ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کو نظم کرنے کا مقصد ان کے نزدیک یہی تھا کہ ذواتِ مقدسہ کے کرداروں کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کیا جائے۔

فیض بھرتپوری نے بحیثیت مرثیہ نگار قابل ذکر شہرت پائی۔ گریہ و بکا کے ساتھ ساتھ ان کے مرثیوں میں رزم و بزم کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کو عبادت سمجھتے ہوئے اپنا شعار بنایا۔ چونکہ جذبہ صادق تھا اس لئے ا سے مرات سے وہ فیضیاب ہوئے۔ پاکستان اور بھارت ہی کیا۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں انکے مرثیے پڑھے گئے اور پسند کئے گئے۔

وہ مدایت کے علمبردار رہتے ہوئے اپنی شاعری اور اپنے کردار کے سبب سب میں مقبول رہے۔

وہ ایک نیک طینت، پاک باطن اور منکسر المزاج و عالی ظرف فنکار تھے۔ اتنی شہرت کے باوجود بھی ان میں کمال درجہ عاجزی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں فیض مرحوم کی ذات اساتذہ کہن کی یادگار تھی وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انکی رحلت سے اہل علم اشکبار ہیں وہ ایک بلند پایہ مرثیہ نگار بھی تھے اور اعلیٰ اقدار کے علمبردار بھی

خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔

ہائے فیض بھرت پوری (مرحوم)

۱۹۸۹ء

الحاج ضمیر اختر نقوی

ہماری گنگا جمنی تہذیب قابلِ احترام لکھنوی ثقافت کے نمائندے ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ وہ تہذیبی رنگ و نور مدھم پڑتا جا رہا ہے اور شہر کراچی شہر ظلمات بنتا جا رہا ہے اس ظلمت کدے میں اب چار آدمی بھی ایسے نظر نہیں آتے جنہیں صاحبانِ علم کہا جائے۔ ہماری اس شاہکار تہذیب کے ایک نمائندے فیض بھرت پوری بھی تھے۔ ان کی شاعری لکھنوی شاعری کا تسلسل تھی۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے حسینؑ کی مداحی کو ایک ادبی تحریک بنا دیا۔ اس تحریک میں اب تک سینکڑوں شاعروں نے حصہ لیا اور [illegible] امر کر گئے کیونکہ تحریک زندہ و جاوید ہے اس لئے اس سے منسلک ہو جانے والا بھی ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ موت مداحِ اہلبیتؑ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ اس کی کیا مجال ہے انہیں زندہ شاعروں میں ایک ہمارے فیض صاحب بھی ہیں۔ لہٰذا ہر وہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کا کلام ان کے مرثیے، سلام، قصائد، رباعیات جب بھی پڑھے جائیں گے جہاں بھی پڑھے جائینگے۔ اس وقت اس محفل میں فیض صاحب کی موجودگی سے کوئی انکار نہ کر سکے گا۔ فیض صاحب سے ہمارے دیرینہ مراسم تھے جب بھی ملے خلوص سے ملے۔ ادبی گفتگو شروع ہوتی تو وقت کا پتہ بھی نہ چلتا کہ وقت کیسے گذر گیا۔ جس محفل میں جس مجلس میں آنے کے لئے میں نے دعوت دی تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ جب بھی میں نے یہ کہا کہ کسی کو لینے کے لئے بھیج دوں تو منع کر دیا۔ مقررہ وقت پر انہیں ہمیشہ موجود پایا۔ علمی گھرانے سے تعلق تھا صاحب حیثیت تھے لیکن غرور نام کو نہ تھا۔ جب ملے خندہ پیشانی سے ملے۔ گفتگو جب بھی کرتے

ایک ایسا تہذیبی رچاؤ اور شگفتگی کہ بات سُننے کو دل چاہے اور دل نہ گھبرائے۔ بعض لوگ بات کرتے ہیں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ لیکن ان کی باتوں میں دل لگتا تھا لہجے میں ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے کسی پرسکون ندی کی لہریں۔ یہ ساری خصوصیات ان کے فنِ خواندگی میں بھی تھیں۔ جب وہ منبر پر مرثیہ پڑھتے تو ایک ایک لفظ ان کی زبان سے یوں ادا ہوتا جیسے غنچے چٹک رہے ہوں۔ ادائگی ایسی کہ ہر اشارے پر یہ محسوس ہوتا کہ پھولوں سے لدی ڈالی بادِ صبا کے جھونکوں سے جنبش میں ہے شاعری کا کیا بیاں ہو خوب خوب مرثیے کہے اور اچھوتے عنوانات پر کہے۔ جب بھی نو تصنیف مرثیہ کہتے تو مجلس میں پڑھنے سے بہت پہلے مرثیے کے چند بند مجھے ضرور سناتے تھے مداحیِ علیؑ میں انہیں کمال حاصل تھا اور یہ کمال اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک معرفت نہ حاصل ہو جائے۔ ان کے ایک مرثیے کے دو بند پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں علیؑ کی معرفت حاصل تھی۔ کہتے ہیں

جو محمدؐ کا معلم وہی استادِ علیؑ
یادِ حق یادِ نبی یادِ نبی یادِ علیؑ
کون دنیا میں نہیں طالبِ امدادِ علیؑ
خود محمدؐ نے دمِ جنگ پڑھی نادِ علیؑ

اب تو ثابت ہے کہ یہ غالبِ ہر غالب ہیں
حق کے مطلوب ہیں اور ابنِ ابی طالبؑ ہیں

جس نے مرحب سے نمودار کو مارا وہ علیؑ
جس کو ہر شخص نے مشکل میں پکارا وہ علیؑ
جس کو احمدؐ نے کہا آنکھ کا تارا وہ علیؑ
جس پہ اللہ نے تارے کو اتارا وہ علیؑ

جس سے خورشید سرِ شام دوبارہ چمکا
جس سے زہراؑ کے مقدر کا ستارہ چمکا

ریاضت علی شائق
(دہلی)۔ (۲۹ مئی ۱۹۸۹ء)

نذرِ فیض

"لغت ہی لغت" کے مصنف برادرِ محترم جناب نیرؔ علی نیرؔ سے یہ جان کر نہایت ہی مسرّت ہوئی کہ وہ اپنے استادِ محترم حضرت فیض بھرتپوری کی یاد میں ان کی شایانِ شان ایک مجلّہ شائع کرنے کے لئے کوشاں ہیں جن کا حال ہی میں ۱۵ مئی ۸۹ء کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ لیکن اس بات کا افسوس رہا کہ کاش میں صرف ایک ہفتہ قبل کراچی حاضر ہوا ہوتا تو برِصغیر کے اس عظیم مفکّر اور شاعرِ اہلبیتِ اطہار کا دیدار نصیب ہو سکتا تھا جس کا سینہ اہلبیتؑ کی محبت

محبت سے پُر تھا۔

جہاں تک فیض بھرتپوری کے فن کے متعلق کچھ کہنے کا تعلق ہے تو یہ سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہوگا۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں جس نے ہر موضوع سخن پر کثرت سے طبع آزمائی کی ہے بلکہ قوم کے ایک سچّے ہمدرد اور بہی خواہ بھی تھے۔ اہلبیتؑ کی بے پناہ محبت کے علاوہ محبانِ اہلبیتؑ کی محبت بھی ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کا اظہار ان کے ایک ایک مصرع سے ہوتا ہے۔ اور امیر مینائی کا شعر ان پر صادق آتا ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت فیض بھرتپوری کی رحلت سے اردو ادب خصوصاً رثائی ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔ لیکن حضرت فیض مرحوم نے بیش گرانقدر تخلیقات کا جو کثیر ذخیرہ ورثہ میں چھوڑا ہے وہ قوم کا عظیم ترین سرمایہ ہے۔ ان کا ایک ایک شعر آسمانِ ادب پر تیرِ تاباں اور ماہِ درخشاں کی طرح جلوہ افروز ہوکر ہماری رہنمائی کرتا رہیگا۔ علاوہ از یں فیض مرحوم نے اپنے دستِ مبارک سے تراشیدہ جواہرات کا اپنے تلامذہ کی شکل میں جو سلسلہ ہمیں عطا کیا ہے وہ ان خدمات اور روایات کا سلسلہ تاقیامت جاری رکھے گا کیونکہ

ع　اس اک چراغ سے لاکھوں چراغ جلتے ہیں۔

مجھے یقین ہے وابستگانِ حضرت فیض مرحوم ان تابانیوں کو ماند نہیں پڑنے دیں گے جو انہوں نے ہمیں بخشی ہیں بلکہ ان کی روایات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی جاں فشانیوں سے ان میں مزید اضافہ کرتے رہیں گے اور یہی استاد مرحوم کو اپنا خراجِ عقیدت ہوگا۔

جناب سبط حسن انجم صاحب

"یہ بھی کہو۔ انسان تھے فرزند حسن فیض"

۱۹۸۹ء

اپنے محترم دوست جناب محمد کاظم زیدی صاحب کا یہ مصرع جس سے فیض صاحب کا سن وفات نکلتا ہے میں نے اپنے اس مختصر سے مضمون کا سرنامہ قرار دیا ہے۔

فیض بھرت پوری مرحوم شاعر تھے اور مرثیہ گوشاعر بھی تھے۔ مرثیہ گوشاعر ہونا بڑی سعادت کی بات ہے۔ عزائے سید الشہداء سے انھیں زمانہ طفلی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس دور میں مجالس عزا میں زیادہ تر مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے کا رواج تھا۔ خود فیض صاحب کے والد گرامی حضرت کلیم مرحوم نہ صرف یہ کہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے بلکہ تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں کافی مہارت اور شہرت کے مالک تھے۔ اور آپ کے جد امجد حضرت بقیر مرحوم ممتاز مرثیہ گوشاعر تھے فیض صاحب اپنی فطری صلاحیت اور لگن کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول سے بھی مستفیض ہوئے۔

فیض صاحب کی شاعری کے متعلق ان کی زندگی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے آئندہ اور بھی لکھا جائے گا۔ اصل میں یہ منصب نقادان فن کا ہے اور یہ میرے دائرہ صلاحیت سے باہر ہے۔ اس وقت میری ساری توجہ فیض صاحب کی شخصیت پر مرکوز ہے۔ ان کے افکار میں شدت احساس کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ جس مسئلہ پر جس زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتے تھے بلا کم و کاست اسے نظم کر دیتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں پس و پیش کے قائل نہ تھے اور نہ کسی مصلحت کے زیر اثر حق بات کہنے سے باز رہتے تھے۔ ایک سچے اور با اصول شخص کے اطوار و کردار کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا شیوہ حق گوئی و بے باکی ہوتا ہے۔ وہ وضعداری اور حفظ مراتب کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے اور اپنے خوردوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ یہی طور طریقہ

وہ بھی اخفیا ر کریں اور اپنے خیالات و احساسات کو دوسروں پر مسلّط کرنے کے قائل نہ تھے لیکن جو بات ان کی پسندیدہ ہوتی تھی اس کے برملا اظہار میں انھیں تکلف نہیں ہوتا تھا۔

وہ عزائے سیدالشہداء کو مقصدِ زیست سمجھتے تھے اور اسی مقصد کو آگے بڑھانے میں مرثیہ گوئی کو ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ عزاداری کے متعلق اپنے ایک مرثیہ میں انھوں نے اپنے بچپن کے چند ایک تاثرات کچھ اس طرح نظم کئے کہ عہدِ ماضی کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شوق بچپن سے مجھے مجلس و ماتم کا رہا | ہر قدم پیشِ نظر سبطِ نبیؐ کا غم تھا
دی بزرگوں نے وہ تعلیم جو تھی بیش بہا | ان کا صدقہ ہے جو میں ذاکرِ شبیر ہوا

تربیت ایسی نہ ملتی تو نما ھر ہوتا
مدح خواں ہوتا نہ ذاکر نہ میں شاعر ہوتا

٭

اسی سلسلے میں ایک بند اور دیکھئے۔ کہتے ہیں۔

ماہِ ذی الحجہ سے تا آٹھو ربیع الاوّل | کھانے پینے کا نہ آرام تھا کوئی محل
رہتا تھا ذکرِ شہادت کے لئے دل بے کل | شوق کہتا تھا یہی۔ مجلسِ شبیر میں چل

مرثیہ خواں کی خطابت جو بہت بھاتی تھی
سنتے ہی ذہن میں سب بات اتر جاتی تھی

محولہ بالا دو بند آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ یہ شاعری نہیں حقیقت ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب اپنے مرثیوں کے آئینے میں عزائے حسین کی ترویج و ترقی کے لئے ساری عمر انتہائی انہماک کے ساتھ کوشاں رہے۔ مجھ سے فیض صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ اُن کے شغلِ مرثیہ گوئی کو تازہ رکھنے میں انکی اہلیہ مرحومہ کا بھی بڑا دخل تھا۔ ان کی رفیقۂ حیات کی اس ذہنی ہم آہنگی نے انھیں نامساعد حالات میں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا۔ جبتک مرحومہ زندہ رہیں فیض صاحب کے فکری اور شعری ولولے نہ صرف برقرار رہے بلکہ بڑھتے ہی رہے ان کی

وفات کے بعد مرثیہ گوئی کا سلسلہ قائم تو رہا لیکن فیض صاحب بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ ان کی شریک زندگی کی دائمی جدائی مرثیوں کے حوالے سے باعث افسردگی ہوئی۔

فیض صاحب سے میری ملاقات مجالس عزا کے سلسلے میں ہوئی بشاعر آل محمد حضرت مولانا نسیم امروہوی کی سرپرستی میں ۱۹۶۲ء سے جامعہ امامیہ ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی میں جدید مراثی کی سالانہ مجالس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان تمام مجالس میں فیض صاحب آخری سے پہلی مجلس میں تو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ ہر سال ان مجالس کا افتتاح میر انیس کے مرثیہ سے ہوا کرتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۶ء یا ۶۷ء سے مرثیہ انیس پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔ فیض صاحب جامعہ امامیہ کی مجالس کے مہتمم ہوتے تھے انھوں نے مولانا نسیم امروہوی کے ایماء سے مجھ سے مرثیہ انیس پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اور اس طرح ہمارے قریبی تعلقات قائم رہے۔ فیض صاحب مولانا نسیم امروہوی کے ممتاز شاگرد ہی نہیں زود بازو بھی تھے۔ مولانا اُن کے مشورے اور تعاون کے ہمیشہ خواہاں رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جامعہ امامیہ کی مجالس جن کامیابیوں سے ہمکنار ہوئیں اس کا سہرا فیض صاحب کے سر تھا۔ تقریباً دس سال کے بعد مولانا کراچی سے کوٹ ڈیجی (خیر پور) منتقل ہوگئے۔ اور کسی معمولی بات پر فیض صاحب کچھ بددل ہوگئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان مجالس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نسیم امروہوی سے فیض صاحب کے تعلقات منقطع ہوگئے تھے جہانتک مجھے معلوم ہے تعلقات میں کمی ضرور ہوگئی تھی لیکن فیض صاحب نے مولانا کی عزت و احترام میں فرق نہیں آنے دیا اور مولانا بھی جب کبھی کوٹ ڈیجی سے کراچی تشریف لاتے فیض صاحب سے ملنے کے لئے بہ نفس نفیس ان کے گھر ضرور جاتے۔ اب نہ مولانا زندہ ہیں نہ فیض صاحب

رہے نام اللہ کا

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

سید کرار حسین زاہد فتحپوری

سفر آخرت!

موت اور حیات کا ایک مختصر جائزہ

دنیا کی ناپائیداری اور زندگی کی بے ثباتی

زیست ناپائیدار ہے اے دوست
مختصر سی بہار ہے اے دوست
آج سب مِل رہے ہیں آپس میں
کل کا کیا اعتبار ہے اے دوست

☙

یہ دنیا کارگہ شیشہ گراں ہے اور یہ زندگی بے حقیقت ہے۔ اس دنیا کی ہر شے کو فنا ہے۔ آدمی کی زندگی بہت ہی نازک اور بے ثبات ہے کسی نے خوب کہا ہے

آدمی بلبلہ ہے پانی کا — کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

دونوں کا دار و مدار ہوا پر ہے۔ سانس آئی تو زندگی۔ نہ آئی تو موت یوں ہی بلبلہ جو

ابھی سطحِ آب پر تھا۔ پلک جھپکتے ہی غائب۔

یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے، ہم سب مسافر ہیں۔ یہاں ہمارا عارضی قیام ہے۔
ابھی آگے بڑھیں گے دم لے کے

یہ دنیا آزمائش گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ہادی اور پیر بھیجے۔ ہمیں وجود حیات دیا۔ وہ ہر طرح سے ہمارا امتحان لے گا۔ آخرت کی دائمی و پُر آسائش زندگی کے لئے امتحان میں کامیابی شرط ہے۔ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے۔ ایک معینہ مدّت کے لئے ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں مدّتِ عمر کے لئے چھینے اور سال نہیں ہوتے ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کچھ سانسیں عطا کرتا ہے اور وہ اس دنیا میں آکر اچھی طرح یا بُری طرح ان سانسوں کو استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نہ ایک سانس کم نہ ایک زیادہ جب اس کی عطا کردہ سانسیں ختم ہو جاتی ہیں تو اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ علالت اور حادثات تو موت کا ایک بہانہ ہوتے ہیں۔ اس جہان فانی کی زندگی تو بے حقیقت ہے۔ اصل زندگی تو اس دنیا سے جانے کے بعد کی ہے جو نیک اعمال اور خوش اعتقادی کا انعام ہوتی ہے جسے حیاتِ جاوداں کہتے ہیں۔

اللہ کا فرمان اور رسول کا ارشاد بھی کہ جو اہل بیت کی محبت میں مر جاتا ہے وہ شہید کا مرتبہ پاتا ہے۔ شہید کو مردہ نہ کہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اُسے نہ دیکھ سکیں۔

حضرت فیض بھرتپوری کی زندگی بھی مدحِ اہل بیتؑ و ذکرِ آلِ محمدؐ میں گزری اور سفرِ آخرت کے لئے کافی زادِ راہ لے کر گئے ہیں۔ جدائی کا غم لازمی ہے صدمہ تو جانے والے سے مستقلاً بچھڑ جانے کا ہوتا ہے کہ اب ہم اس سے نہ مل سکیں گے۔

فیض بھرتپوری مرحوم میرے دیرینہ ساتھیوں میں تھے۔ مرحوم نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ موت تو برحق ہے۔ ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے کب موت آئے گی یہ کسی کو معلوم نہیں۔

پروفیسر سید غلام عباس

حضرت فیض بھرتپوری ___ مرثیہ نگار کی حیثیت سے

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں مرثیہ ہی وہ واحد صنف سخن ہے جو رفعت فکر ندرت خیال اور جمالیاتی حسن میں جہاں غزل اور نظم کے ہم پلہ ہے، اپنے پیغام میں ان دونوں اصناف سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ بلاشبہ مرثیہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے اس گلدستے کے مانند ہے جس میں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور سلام کے مختلف پھول بڑی خوبصورتی سے آراستہ ہیں، اردو غزل کا دامن یقیناً بہت ہی کشادہ ہے اور اس کے ایک ایک شعر میں ایک ایک جہان پوشیدہ ہے لیکن نفس مضمون کی طوالت کے سبب جہاں غزل اس بوجھ کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہوتی اس بار گراں کو نظم سنبھالا دیتی ہے اس کے برخلاف مرثیہ وہ بحر زخّار ہے جس کے دامن میں تمام اصناف سخن کی سبک خرام اور تیز و تند موجیں گرداب بناتی رہتی ہیں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے ہر صنف سخن مرثیہ کا ایک جز ہے؟ حمد و نعت اور منقبت کی شکل میں قصیدہ کیا مرثیے کا ایک جز نہیں ہے؟ اسی طرح سے غزل کے ہر ہر شعر میں پایا جانے والا سوز و گداز اور رعنائی فکر کیا مرثیے کی رگ و پے میں موجود نہیں ہے؟ نفس مضمون کی طوالت کے سبب نظم کیا مرثیے کے ایک ادنی جز سے زیادہ حیثیت کی مالک ہو سکتی ہے اسی طرح ان گنت روایتیں اور حکایتیں جو مرثیہ میں موجود ہیں کیا اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتی ہیں کہ مثنوی بھی اس صنف بیش بہا کا ایک حصّہ ہے اور اگر مسدس سے بیت کو ہٹا دیا جائے تو مرثیے کا ہر ہر بند رباعی نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک اور خصوصیت جو مرثیہ کو دوسری تمام اصناف کے مقابلہ میں بہت ہی اعلیٰ و ارفع درجہ عطا کرتی ہے وہ اس کا موضوع سخن ہے۔ مرثیے میں اعلیٰ مقصد، بلند اخلاقی خیر و شر کی کشمکش طاقت کا تصادم، اخلاق کے اعلیٰ نمونوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ صدق و صفا، صبر و شکر، قربانی و ایثار، شجاعت و دلیری، خدا ترسی و عزت نفس، پاکیزگی ذوق، مزاج کی نفاست، باہمی محبت

بزرگوں کی اطاعت واحترام، چھوٹوں سے شفقت و محبت نیز ایسے بہت سے موضوعات پر بلند ترین اقدار و صفات کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن نمونوں کی ضرورت انسان کو ہر دور میں رہی ہے اور ہر دور میں رہے گی۔

مرثیے کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اسی معاشرہ اور اسی دور میں پھلتا پھولتا ہے جس معاشرہ اور دور میں ایسے افراد موجود ہوں جو خیر و شر کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں بلکہ خیر کے پرچم کو بلند رکھنے کے لئے کوشاں بھی ہوں۔ درحقیقت وہ ادب بہت عظیم ہے جو زندگی اور معاشرہ میں پائی جانے والی اقدار کی بھرپور عکاسی کرتا ہے لیکن وہ ادب عظیم تر ہے جو زندگی اور معاشرہ کو پاکیزہ جذبات سے سرشار کرتا ہے اس ضمن میں مرثیہ سے بہتر اور اس سے زیادہ فعال کوئی دوسری صنف سخن نہیں ہے یہ ادب کا وہ شہ پارہ ہے جس میں ایک طرف تو ماضی کی تمام تر تجلیات منعکس ہیں اور دوسری طرف مستقبل کی تمام تر امیدیں وابستہ ہیں۔ علاوہ ازیں پوری اردو شاعری میں مرثیہ ہی وہ واحد صنف ہے جس میں سچے جذبے کے ساتھ طہارتِ فکر کو بہت بڑا دخل حاصل ہے اسی لئے مرثیے میں جن اقدار کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ٹھوس اور اٹل اقدار ہیں۔ تغیرات زمانہ خواہ کچھ بھی ہوں ان اقدار پر اثرانداز نہ ہو سکیں گی۔ اسی طرح اس صنف سخن میں جہاں وقتی زندگی کی جھلک موجود ہوتی ہے وہاں ابدی زندگی کے لئے پند و نصائح کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے اور ابدی زندگی کے مقابلے میں چونکہ یہ زندگی بہت ہی کمتر شے ہے اس لئے مرثیہ ہی وہ کارآمد شے ہے جو فطرت کے اسرار و رموز سے لے کر عاقبت تک کی منزل کی نشاندہی کرتی ہے وہ لوگ جو اچھی عاقبت کے طلبگار ہیں اور قیامت پر یقین رکھتے ہیں انھیں مرثیے کے علاوہ کسی دوسرے طرز کا ادب سہارا دینے سے قاصر ہے۔

مرثیہ کی افادیت اور اس کی اخلاقی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس خاص صنفِ سخن کو فرقہ پرستی کی رنگین عینک سے دیکھنے کے بجائے اس کی اپنی خوبیوں کی روشنی میں اسے پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے علاوہ وہ حضرات جو چیزوں کو نہ صرف دیدۂ بینا سے دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہوں بلکہ حق کو حق کہنے کے لئے اپنے اندر اخلاقی اور نفسیاتی

جرأت بھی رکھتے ہوں ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے افراد کی تعداد دورِ حاضر میں کم سے کمتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

حضرت فیض بھرت پوری کے مرثیوں میں اخلاقی اور نفسیاتی جرأت کے یہ معرکے جا بجا نظر آتے ہیں ان کے مرثیوں میں اعلیٰ کردار اور اخلاق کے مظاہرے بیشتر جگہ پر موجود ہیں ان کے کلام کا بیشتر حصہ چونکہ کلاسیکی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اس لئے اعلیٰ کردار و اخلاق کی رمق ان کے ہر ہر مرثیے میں موجود ہے یہی نہیں کہ وہ اس رفعت کا مظاہرہ محض الفاظ کے ذریعے کر دیتے ہیں بلکہ اپنے ممدوح کے عظیم کردار کو پیش کر کے وہ سامعین یا قارئین کو دعوتِ عمل بھی دیتے ہیں یوں تو خیر و شر کے درمیان ایک کشمکش ازل سے جاری و ساری ہے لیکن کربلا میں واقع ہونے والے اس تصادم کی داستان رہتی دنیا تک باقی رہے گی اور اس معرکے میں حسین خیر کا وہ انتہائی نقطۂ عروج ثابت ہوئے کہ شر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحت الثریٰ میں دفن ہو گیا انھوں نے اپنا سب کچھ کھو کے دینِ مصطفویؐ کو بچا لیا اور اس طرح سے اپنے مشن کی تکمیل کر دی جس کے لئے پروردگارِ عالم نے انھیں خلق کیا تھا اس نکتہ کی تشریح فیض بھرتپوری یوں کرتے ہیں۔

گلزارِ فاطمہؑ کے گلِ تر حسینؑ ہیں — سردارِ خلد، شافعِ محشر حسینؑ ہیں
انساں کے حق میں رحمتِ داور حسینؑ ہیں — شکلِ بشر میں روحِ پیمبرؐ حسینؑ ہیں
کیونکر نہ جان دیتے یہ اسلام کے لئے
بھیجا تھا کبریا نے اسی کام کے لئے

آئینہ ارادۂ داور حسینؑ ہیں — عزمِ نبیؐ کے مظہر و مظہر حسینؑ ہیں
کرب و بلا کے فاتحِ خیبر حسینؑ ہیں — اوجِ عمل کے مہرِ منور حسینؑ ہیں
یوں ظلمتوں کو دور کیا کائنات سے
ایماں کو چار چاند لگے ان کی ذات سے

کلمے کی جان دین کا حاصل حسینؑ ہیں — مقتول ہو کے کفر کے قاتل حسینؑ ہیں
مرضیٔ کردگار کے حامل حسینؑ ہیں — قرآنِ بے رسولؐ، حمائل حسینؑ ہیں
حق پر فنا بھی ہیں، یہ فنا پر بقا بھی ہیں
فتحِ مبینِ معرکۂ کربلا بھی ہیں

اسی طرح اپنے ایک دوسرے مرثیے میں فیض بھرت پوری نے حضرت زینبؑ کی سیرت پاک کو اداران کے عظیم کردار کو جن الفاظ میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیے۔

بعد زہراؑ نہیں زینبؑ کی زمانے میں نظیر ۔۔۔ استقامت میں یہ تھیں فرد مثال شبیرؑ
گرم سر رزم شہیدوں نے چلائی شمشیر ۔۔۔ ان کے خطبوں نے کیا ظلم کے دل کو تسخیر
کب یہ سمجھا تھا کوئی بنت ولی ہیں گویا
لوگ دوڑے یہ سمجھ کر کہ علیؑ ہیں گویا

ان کے ہر جملے میں الفاظ تھے وہ پرتاثیر ۔۔۔ حق و باطل کی کھینچی جن سے مکمل تصویر
ظلم کو صبر کے لہجے میں کیا یوں تشہیر ۔۔۔ بدعتیں ہو گئیں ایماں کے شکنجے میں اسیر
یاد قربانی شبیرؑ جواب زندہ ہے
کربلا ان کے ہی خطبوں کے سبب زندہ ہے

موج کوثر تھی خطابت میں زبان زینبؑ ۔۔۔ دل میں راسخ ہوا دشمن کے بیان زینبؑ
وہ بھی جھوٹے اجو نہ تھے مرتبہ دان زینبؑ ۔۔۔ دلنشیں لفظ بنے، تیر کمان زینبؑ
کلمہ جس سے ہے قائم، وہ کلام ان کا ہے
ثبت تاریخ کے اوراق پہ نام ان کا ہے

جزو ہے اسوۂ شبیرؑ کا سیرت ان کی ۔۔۔ پوچھئے شام غریباں سے شجاعت ان کی
مان لی اپنے پرائے نے قیادت ان کی ۔۔۔ کربلا کو تھی حقیقت میں ضرورت ان کی
کیوں نہ ہو گود میں زہراؑ کی پلی تھیں زینبؑ
خون کا تھا یہ اثر، بنت علیؑ تھیں زینبؑ

حضرت زینبؑ کی طرح حضرت عباسؑ کی عظمت کردار بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے ان دونوں ہستیوں کے بارے میں دل پر یاد کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا کہ وہ غیر معصوم ہو سکتے ہیں عباسؑ جہاں وفا کے پیکر ہیں وہاں شجاعت کی جیتی جاگتی تصویر بھی۔ فیض بھرت پوری نے اس پیکر وفا کی رجز خوانی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ہم علمدار حسینؑ ہیں فدائے شبیرؑ	باپ سے پائی ہے ترکے میں وفا کی جاگیر
ہم کو ٹوکا جو کسی نے تو چلے گی شمشیر	کھینچ دیں گے اسداللہ کی رن میں تصویر
زخم کھاتے ہیں سدا جنگ میں ہم سینے کا
مرکے بھی دیتے ہیں دنیا کو سبق جینے کا

تن کے دریا پہ پکارا اسداللہ کا شیر	شمر بھاگی ہوئی فوجوں کو ادھر پھر سے بھیر
سخت حیرت ہے کہ لاکھوں میں نہیں ایک دلیر	یہ زبردست تھے کیسے کہ ہوئے خوف سے زیر
چل دیئے رعب لڑائی کا جو بیٹھا دل پر
گھاٹ کیا روکیں گے خود رک نہ سکے ساحل پر

چشم آفاق نے دیکھے یہ وفا کے منظر	ہائے وہ پیاس، وہ عباسؑ کی محتاط نظر
دور سے مشک بھری مقام کے تسمہ جھک کر	منہ پھرائے ہوئے بیٹھے رہے اللہ رے جگر
ڈر یہ تھا چشم وفا میں نہ سبک ہو جائیں
کشش آب سے آنکھیں نہ خنک ہو جائیں

امام حسینؑ کا ذکر آتے ہی کربلا کا تصور خود بخود ہر ذہن میں آجاتا ہے۔ کربلا وہ عنوان ہے جس پر تقریباً ہر مرثیہ نگار نے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ فیض بھرتپوری کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جہاں انبیاء اور اولیا بہت بڑے مصائب سے دوچار ہوئے اور آخر میں یہ دیار امام عالی مقام کی صعوبتوں اور قربانیوں کے لئے امتحان گاہ بنا اور اس عظیم المیئے کے بعد اس کرب والم کے مقام سے کردار وعمل اور شعور وآگہی کی ایسی روشنی پھوٹی جس نے دنیا کی تمام تر تاریکی کو دور کر دیا۔ ذیل کے بند دیکھئے۔

وہ کربلا جو مرکز آلام و ابتلاء	آ آ کے جھیلتے رہے غم جس میں انبیاء
ہابیل سے عزیز کا جس میں لہو بہا	شامل ہے غم خمیر میں اور نام میں بلا
مٹی میں جس کے خون ہے آدم نژاد کا
آغاز جس سے خلق میں پہلے فساد کا

وہ کربلا جو روزِ ازل سے تباہ تھی
حرمان و یاس و حزن کی آماجگاہ تھی
قبل از حسینؑ مسکن فریاد و آہ تھی
آفت کے کاروانِ مسلسل کی راہ تھی
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتے چلے گئے
جو آئے، اس کی جان کو روتے چلے گئے

وہ کربلا کبھی تھی جو بربادیوں کا گھر
آباد جس میں ہونے سے ڈرتا تھا ہر بشر
للہ رے فیض پائے شہنشاہِ بحر و بر
اب ہے وہ لامکاں کے فرشتوں کی رہ گزر
زندوں کو جس زمین پہ نہ دم بھر اماں ملی
مُردوں کو اس میں زندگیٔ جاوداں ملی

زخمِ جگر بھی، مرہمِ زخمِ جگر بھی ہے
دل میں بھی ہے بسی ہوئی دور از نظر بھی ہے
رہرو کی یہ صراط بھی ہے۔ راہبر بھی ہے
منزل بھی ہے جناں کے لئے رہ گزر بھی ہے
دنیا سے کچھ الگ ہی یہاں کا نظام ہے
کرب اور بلا میں بھی یہ سکوں کا مقام ہے

یہ خاک تھی ازل سے وہ سرچشمۂ الم
آکر جہاں لرزتے تھے انسان کے قدم
جس نے رکھا قدم، وہیں آیا لبوں پہ دم
آدمؑ ہوں یا کہ نوحؑ اٹھائے سبھی نے غم
عظمت یہ بوترابؑ کے گھر سے عطا ہوئی
پہلے جو خاک تھی، وہی خاکِ شفا ہوئی

یہ کربلا جو آج ہے مشہور و نام وَر
تھی تربتِ حسینؑ سے پہلے حقیر تر
رستے بھی منزلیں بھی، یہ آفات و یہ خطر
گزریں جو خضر بھی تو رہے رہزنوں کا ڈر
پہنچا جو کاروانِ حرم نامدار کا
حُر کی طرح نصیب پھرا اس دیار کا

حضرت فیض بھرتپوری کے مرثیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں کلاسیکی ذوق کے ساتھ ساتھ جدید مرثیہ کا رنگ بھی نمایاں ہے قدیم رنگ میں رنگ جدید کی آمیزش انھوں نے بڑی احتیاط اور ہنرمندی کے ساتھ کی ہے فیض مرحوم کے زیادہ تر مرثیے بیانیہ ہیں۔ ان تمام

مرثیوں میں قدیم رنگ ہی غالب ہے لیکن "پانی" کے موضوع پر جو مرثیہ انھوں نے تصنیف کیا ہے اس میں جدیدیت کو بہت دخل حاصل ہے۔ ویسے تو "پانی" کے موضوع پر جوش ملیح آبادی، راجہ صاحب محمود آباد اور نسیم امروہوی نے بھی بڑے گرانقدر مرثیے کہے ہیں لیکن فیضؔ کا کلام بھی ان مرثیہ نگاروں کے کلام ہی کے ہم پلہ ہے۔ ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیے۔

باعثِ رونقِ گلزارِ جہاں ہے پانی
عنصرِ زندگی کون و مکاں ہے پانی
گھر ہے آنکھوں میں اور آنکھوں سے نہاں ہے پانی
روح بن کر تنِ گیتی میں رواں ہے پانی
پھر نباتات نہ حیوان نہ انساں ہوتے
یہ نہ ہوتا تو چمن دشت و بیاباں ہوتے

سب کو ہے فیض رساں بارشِ رحمت اس کی
کل زمانے پہ عیاں اصل و حقیقت اس کی
دولتِ ہستیٔ کونین بدولت اس کی
دوست دشمن پہ برابر ہے عنایت اس کی
مہرباں سب پہ ہے چاہے کوئی بدکیش سہی
شاہ و درویش ہیں محتاج کم و بیش سہی

مختلف نام ہیں پانی کے سبھی حسبِ محل
یہ فضاؤں میں ہے شبنم تو فلک پر بادل
خاک پر ہو تو ہے زم زم کہ نہیں جس کا بدل
چرخ پر ہو تو ہے کوثر کہ جو صد رشک عسل
ایک وہ آب ہے رحمت کی جو بوچھار میں ہے
ایک وہ ہے جو یداللہ کی تلوار میں ہے

یہ سدا غرقِ خلائق کی محبت میں رہا
سب کو راحت میں رکھا چاہے خود آفت میں رہا
کبھی طوفان میں کبھی مہر کی حدت میں رہا
اور تو اور رسولوں کی بھی خدمت میں رہا
پیاسِ عرفانِ الٰہی کی بجھانے والا
کشتیٔ نوحؑ کنارے سے لگانے والا

مشفقانہ ہے بہت آب رواں کا دستور
اس سے سیراب ہیں سب انس و جن و وحش و طیور
پیاسا اٹھ جائے کوئی، یہ نہیں اس کو منظور
جان کا مونس و غمخوار ہے تا حدِ شعور
جان بلب کی بھی ہے امداد کو حاضر پانی
حلق میں ڈالتے ہیں تا دمِ آخر پانی

نعمتیں جتنی ہیں خالق کی میان عالم
ان میں پانی ہے وہ نعمت کہ جو سب سے ہے اہم
خدمت عامہ کے کتنے ہیں رخ اس میں بہم
قدر میں سب سے گراں سب سے مگر قیمت کم
وہ بھی اس دور میں قیمت سے ملا ہے پانی
ورنہ فطرت نے تو بس مفت دیا ہے پانی

حضرت فیض کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں رزمیہ پہلو بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے یہی وہ گوشہ ہے جس سے عصر جدید کے بیشتر مرثیہ نگار پہلو تہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید مرثیہ نگاری میں رزم کو شاید اس وجہ سے کم دخل حاصل ہے کہ دلبستان لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے مرثیہ گو شعراء نے اس جز کو اس قدر نکھارا اور اتنا کچھ دیا کہ کوئی نئی بات کہنے کی مزید گنجائش باقی نہ رہی لیکن رزمیہ بیان پر فیضؔ بھر تیوری کی گرفت بہت مضبوط نظر آتی ہے۔ ذیل کا بند دیکھئے۔

نام عباسؑ کی ہیبت سے جو دل تھرایا
فوجیں سمٹیں، لپسر سعد بہت گھبرایا
بدحواسی میں بگڑ کر یہ شقی چلایا
کس کی دہشت سے سپاہ نے قدم سرکایا
بزدلو! ثانیٔ الیاس نہیں آئے ہیں
حرؔ سے حرِّ جنگ کو عباسؑ نہیں آئے ہیں

فیض کے ایک دوسرے مرثیے میں رجز کے تیور دیکھئے

قریب فوج جو غازی بہ رعب وداب آیا
پکاری گرد، وہ دلبند بوترابؑ آیا
سپاہ شام میں شبّیرؑ کا آفتاب آیا
صفیں الٹ گئیں لشکر میں انقلاب آیا
فرس کو روک کے، تن کر ادھر ادھر دیکھا
نظر میں فوج کی طاقت کو تول کر دیکھا

جھپک جھپک گئیں نظریں جدھر نگاہ پڑی
اٹک اٹک گئے دم اُن کے آنکھ جن سے لڑی
جھجک جھجک گئے رن میں جو جھیلتے تھے کڑی
سرک سرک گئے جن کی ہوا بندھی تھی بڑی
دبک دبک گئے بودے، دلیر آ پہنچا
بھڑک بھڑک گئے گھوڑے کہ شیر آ پہنچا

[illegible] بڑھ کے ندا دی کہ اے گروہِ جفا   ڈرو نہ اتنا کہ آیا نہیں ہے وقتِ سزا
تو اب بھی ظلم و شقاوت سے تم کرو توبہ   تو بخش دیں گے تمھاری خطا امامِ ہدا
کرو خیال کہ سولہ پہر سے پیاسے ہیں
ادب تمھارے پیمبرؐ کے یہ نواسے ہیں

نہ باز آئے ستم سے تو پھر رہے یہ خیال   کہ یادگار رہے گی کریں گے ہم وہ جدال
تمھاری لاشوں سے پٹ جائے گا یہ دشتِ قتال   خدا کا قہر ہے اے بزدلو ہمارا جلال
علیؑ کا زور بھی ہے طاقتِ ستیز بھی ہے
یہ دیکھ لو مرے قبضے میں تیغِ تیز بھی ہے

مرے پدر کہ وہ نانا تھے جو ہیں خیرِ انام   وہ جد کہے اپنے کہ اتری جنھیں فلک سے حسام
وہ اپنی دادی ہیں جن کو کیا نبیؐ نے سلام   پدر امام، چچا بھی امام، جد بھی امام
مٹا کے کفر کو رکھ دیں یہی ارادے ہیں
جو کہہ دیا وہ کریں گے امام زادے ہیں

ہمارے سامنے کیا مال ہے یہ فوجِ کثیر   کہ ہم ہیں وارثِ زورِ جنابِ خیبر گیر
گھٹا کی طرح جو چھائی ہے شامیوں کی بھیر   سیاہ کار، سیاہ رو، سیاہ قلب و ضمیر
جو تیغ کھینچ لیں ہم دور یہ اندھیرا ہو
سیاہ شام کا دو ہاتھ میں سویرا ہو

قدیم مرثیہ نگاری میں تیغ زنی کے منظر کو بہت دخل رہا ہے۔ جدید مرثیہ گو شعراء کے کلام میں یہ عنصر تقریباً ناپید ہے لیکن فیضؔ بھرتپوری کے مرثیوں میں بہت جگہ یہ منظر کشی نظر آتی ہے ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیے۔

اس دبدبے سے تیغِ شہنشاہِ دیں چلی   گردوں لرز کے رہ گئے ڈر سے زمیں چلی
عباسؑ کی طرح جو وہ چیں بر جبیں چلی   ایسی چلی کہ پھر نہ کبھی وہ کہیں چلی
اب تک لبوں پہ سکۂ ضرب و درشت ہے
ہر تیغ سرنگوں ہے اسے کفر و بت شکست ہے

یوں تیرہ دل کو برق فنا آ کے لے گئی — کالی گھٹا کو جیسے ہوا آ کے لے گئی
موجِ ستم کو سیل بلا آ کے لے گئی — جبر کا یہ دے گئی تو قضا آ کے لے گئی
قاتل کو چشم یاس سے تکتے چلے گئے
بسمل پے وصال پھڑ پھڑکتے چلے گئے

خود کھو گیا وہ رن میں، جسے اس نے پالیا — وہ دم میں جل بجھا جسے رستے میں آلیا
اٹھا جہاں سے جس نے بھی دل میں بٹھالیا — ٹوٹا اسی کو جس نے گلے سے لگالیا
ملتی تھی جھک کے طالب ارباب جور تھی
جاں لے کہ پھر نگاہ جو پھیری تو اور تھی

کیا وار تھے کہ بانئ شر لوٹنے لگے — گھوڑے ادھر سوار ادھر لوٹنے لگے
نامی دلاوروں کے جگر لوٹنے لگے — ایسے دبے کہ پاؤں پہ سر لوٹنے لگے
تیغ امام سے کوئی سرکش بچا نہیں
اس دن سے آسماں کا سر اب تک اٹھا نہیں

اللہ رے صفائی شمشیر بے مثال — بجلی کی طرح گر کے اٹھی صورت ہلال
اس با کمال سے ہو نہ کیوں کفر کو زوال — یہ تیغ ہے علیؑ کے لئے نذر ذوالجلال
خالق نے کی عطا شہہ بدر و حنین کو
میراث میں ملی ہے علیؑ سے حسینؑ کو

تیغ ہی کی طرح گھوڑے کو بھی قدیم مرثیہ نگاری میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے اس عنوان پر بھی قدیم مرثیہ نگاروں نے دفتر کے دفتر بھر دیئے ہیں حضرت فیض بھرت پوری کے ذیل کے بند پیش خدمت ہیں۔

ایسے جری کا لال ہوں اے فوج نابکار — سر جس پہ ہو گراں وہ کرے مجھ سے کارزار
آئے ادھر سے تیر یہ سن کر جو بار بار — کھینچی جری نے تیغ فنا کہہ کے ہوشیار
گھوڑے سے بھڑک بھڑک کے یکایک جو بھر پڑے
کتنے سوار ٹھوکریں کھا کھا کے گر پڑے

جائے پناہ ڈھونڈھتے پھرتے تھے بدگہر　　لیکن نظر نہ آئی کہیں صورتِ مفر
ٹھہریں کہ بھاگیں، جاں کا بہر طور تھا خطر　　قائم جو اس تک تو رہے ایک حال پر
تھی بزدلوں کو اک یہی صورت پناہ کی
کشتوں کے پشتے آڑ بنے تھے سپاہ کی

فیض بھرت پوری کے مرثیوں کی سب سے اہم خصوصیت ان میں پائی جانے والی رثائیت ہے یہ مصائب اتنے بھرپور اور اتنے پرسوز ہیں کہ سامع یا قاری کے دل پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ دورِ حاضر کے بیشتر مرثیہ نگاروں کے کلام میں اس جز کی قدرے کمی ہے اور یہ کمی اس وقت سے شروع ہوئی جب حضرت جوش ملیح آبادی نے اس بات پر زور دیا کہ مرثیہ محض رونے اور رلانے کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ وہ پیغام ہے جس کے ذریعے فکر کو جلا اور خون کو حرارت ملنی چاہیئے چنانچہ جوش　سے متاثر ہو کر ان کے معاصرین اور متقدین نے اگر بین کے عنصر کو یکسر خارج نہیں کر دیا۔ تو کم ضرور کر دیا۔ لیکن فیض کے مرثیوں میں اس گوشے پر نہ صرف بہت زیادہ زور دیا گیا ہے بلکہ مصائب کو عین فطری تقاضوں کے تحت بیان کیا گیا ہے ذیل کے بند کو ملاحظہ فرمائیے۔ امام حسینؑ کے ہاتھوں پر حضرت علی اصغرؑ کی لاش ہے کبھی وہ خیمہ کا رخ کرتے ہیں اور ربابؑ سے خجالت کے سبب پھر پلٹ آتے ہیں شاعر نے کس خوبصورت انداز میں اس روایت کو پیش کیا ہے

منتظر ہو گی بہت اپنے پسر کی مادر　　کیا کریں گھر سے نکل آئے اگر بیبیؑ کے سر
پھر بڑھے خیمہ کی جانب کو شہِ جن و بشر　　انا للہ زباں پر تو نظر جانبِ در
ایسا محسوس ہوا جیسے خبر جا پہنچی
ہاتھ پھیلائے ہوئے در پہ ربابؑ آ پہنچی

حرکتِ دل جو ہوئی تیز، رکے شاہِ امم　　کبھی خیمے کو کبھی لاش کو دیکھا باہم
تھا تصور کے تلاطم میں عجب کچھ عالم　　آگے بڑھ جاتے تھے پھر پیچھے کو ہٹتے تھے قدم
لاکھ صدموں میں یہ صدمہ نہ سہا جاتا تھا
نہ چلا جاتا تھا آگے نہ رہا جاتا تھا

تھے ہی کشمکشِ غم میں امامؑ والا — امرِ الہام کا ناگاہ اشارہ یہ ہوا
لاش خیمہ میں نہ لے جائیے اے شاہِ ہدا — سن کے یہ خاک پہ مظلوم نے میت کو رکھا
کھینچ کر تیغ یداللہ وہیں بیٹھ گئے
آستینوں کو الٹ کر شہِ دیں بیٹھ گئے

تیغ حیدرؑ سے بنانے لگے ننھی سی لحد — ہائے وہ دھوپ، وہ کاوش، وہ امامِ امجد
قبرِ بے شیر بنی، یا ستم فوج کی حد — دل پکارا مرے انصار، یہ ہے وقتِ مدد
کوئی مٹی نہیں دیتا ہے پسر کو اپنے
آپ ہم قبر میں رکھتے ہیں جگر کو اپنے

ذیل کے بند فیض مرحوم کے ایک دوسرے مرثیے سے پیشِ خدمت ہیں ان میں کتنی جگر سوزی کے ساتھ انھوں نے مصائب سید الشہدا کو قلمبند کیا ہے۔

اُٹھے کمر کو پکڑے ہوئے سرورِ زماں — اکبرؑ کو یاد کر کے کہی عصر کی اذاں
محوِ نماز سبطِ پیمبرؑ ہوئے یہاں — واں ظلم پر تلی سپہ شام ناگہاں
افسوس یہ ستم دلِ احمد کے چین پر
تھی ہر طرف سے تیروں کی بارش حسینؑ پر

گو رعب سے قریب نہ آتے تھے اہلِ کیں — برسا رہے تھے سنگ جفا دور سے لعیں
لیکن کچھ ایسے محوِ عبادت تھے شاہؑ دیں — پتھر پڑا کہ تیر لگا، کچھ خبر نہیں
جاری رہی نماز، ستم پر ستم ہوئے
باصد خضوع سجدۂ آخر میں خم ہوئے

خنجر اٹھا کے ہاتھ میں شمرِ لعیں بڑھا — اب کیا کہوں زبان سے کہ سجدے میں کیا ہوا
صابر کا سر شقی نے چھری سے قلم کیا — لیکن ذرا نہ طاعتِ شہ میں خلل پڑا
لذت وہ پائی روح نے ذکرِ ودود سے
اب تک اٹھا نہیں سرِ سرورؑ سجود سے

فارغ ہوئے جو قتل شہِ دیں سے اشقیاء خیمے جلاتے لوٹ لیا گھر حسینؑ کا
مارے طمانچے بالی سکینہؑ کو بے خطا چھینی سروں سے عترتِ اطہار کے ردا
زینبؑ پکارتی تھیں کہ نانا دہائی ہے
زہراؑ کے گھر میں آگ دوبارہ لگائی ہے

رخ کر کے سوئے نہر یہ زینبؑ کی تھی فغاں عباسؑ جلد آؤ کہ محشر ہوا عیاں
بازو تمہاری بہنوں کے ہیں اور ریسماں پہناتے ہیں شقی مرے عابدؑ کو بیڑیاں
سرکار لٹ گئی شہِ بدر و حنین کی
ہے عید فوج شام میں قتلِ حسینؑ کی

بے گور ریگ گرم پہ ہے میتِ امامؑ کیوں کر ہو دفن سبطِ پیمبرؐ کا اہتمام
لائے کفن کہاں سے یہ مجبورِ مستہام چادر بھی لے گئی مرے سر سے سپاہِ شام
ساماں ہو کس طرح دلِ مضطر کے چین کا
پرسہ تو دو اخی مجھے بھیا حسینؑ کا

اکبرؑ ہیں اب نہ تم ہو، نہ سلطانِ مشرقین پھر کون گھر سنبھالے گا حیدرؑ کے نورِ عین
اس فکر میں دماغ کو راحت نہ دل کو چین بچوں کو دیکھوں یا میں کروں ماتمِ حسینؑ
آتے نہیں اگر مری امداد کے لئے
پھر میں نجف کو جاتی ہوں فریاد کے لئے

پانی کی طرح فیض بھرتپوری کا ایک دوسرا لازوال شاہکار "تبرک" کے عنوان سے ان کا دوسرا مرثیہ ہے یہ مرثیہ تازگی، جدت اور ندرت کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے فیضؔ مرحوم نے "تبرک" کی افادیت پر نہ صرف بڑی مدلل اور سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ اس رسم کی تاریخی اور دستاویزی سند پیش کی ہے اسی طرح ان کے دیگر مرثیوں میں بھی بہت سے ایسے دوسرے موضوع ملتے ہیں جو اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل کے بند دیکھئے۔

فلسفہ رسم تبرک کا بیاں کرتا ہوں   صرف اس امر میں کل تاب و تواں کرتا ہوں
ہیں جو اوصاف نہاں ان کو عیاں کرتا ہوں   اختلافات کو بے نام و نشاں کرتا ہوں
مدعا یہ ہے کہ اس رسم کا عارف ہو جائے
جو بھی ناواقفِ تاریخ ہے واقف ہو جائے

میں بتاتا ہوں بہ تفصیل تجھے نیک نہاد   رسم یہ سیدِ سجاد نے کی ہے ایجاد
کس لئے ہے تجھے پھر نام تبرک سے عناد   متبرک ہے تبرک ہے مبارک بنیاد
سنتِ سیدِ سجادؑ چلے گی تا حشر
چودہ سو سال پرانی ہے رہے گی تا حشر

درحقیقت متبرک ہے تبرک کا وجود   برکتیں اس کی ہیں مومن کے لئے لامحدود
ترک ہو یہ تو عزاداری پہ آجائے جمود   کم تو ہو جائے گا لیکن یہ نہ ہوگا مسدود
دخل ہے اس کو عقیدے کی ضیا باری میں
اس سے کیوں کر نہ اضافہ ہو عزاداری میں

اس تبرک کے فوائد کی کوئی حد نہ شمار   یہ وہ داروئے مکمل ہے برائے بیمار
فیض سے اس کے اتر جاتا ہے واللہ بخار   صحت ذہن و سکوں کا ہے یہ مومن کا حصار
خوش عقیدہ ہو تو بے جان میں جان آجائے
کسی بیمار کو دیدو تو شفا پا جائے

اس کے اوصاف رقم کرنے میں قاصر ہے قلم   خوش عقیدے کے لئے بات ہے یہ مستحکم
ہیچ ہے اس کے مقابل بخدا جامِ جم   دم سے اس چیز کے عیسیٰ نفسی کا ہے بھرم
موت کا آتا ہوا سر پہ تبر رک جائے
منہ میں بیمار کے تھوڑا جو تبرک جائے

ہے ہر اک ملت و مذہب میں تبرک کا رواج   متبرک اسے گردانتا ہے سارا سماج
اس کے معنی نے اسے بخشی ہے ایسی معراج   کل مقام اس کا جو تھا ہے وہی حاصل اسے آج
ماضی و حال کا کیا ذکر ہے مستقبل میں
اس کی مقبولیت آئے گی نظر ہر دل میں

کچھ وہ ہیں جو کہ ہیں تقسیم تبرک کے خلاف جن کو پس منظر مجلس نظر آتا نہیں صاف
ان کے ذہنوں پہ چڑھے ہیں جو جہالت کے غلاف حامل ظلم ہیں اور دشمن عدل و انصاف

صبر شہ، ظلم یزیدی جو بیاں ہوتا ہے
قصۂ کرب و بلا اور جواں ہوتا ہے

کچھ ہیں کمزور عقیدے کے بھی انساں یہاں شرکت مجلس شہ جن کو گزرتی ہے گراں
ہیں یہ تقسیم تبرک سے مسلسل نالاں ہے مگر اس کے پس پردہ یہ تحریک نہاں

محفل عیش و طرب آٹھ پہر جاری ہو
ہو کسی طرح مگر بند عزاداری ہو

ایسے افراد کی اصلاح کہاں ہے ممکن دن کو یہ رات سمجھتے ہیں تو یہ رات کو دن
ان کی نظروں میں نہیں عزت و توقیر حسینؑ دشمن علم ہیں اور جہل کے ہیں یہ ضامن

کفر کا سر میں ہے سودا تو بڑے دھندے ہیں
آنکھیں بینا ہیں مگر دل کے یہ سب اندھے ہیں

"تبرک" کے موضوع پر حضرت فیض بھرت پوری کے افکار عالیہ کو آپ نے دیکھا ان افکار کے اظہار کے لئے بھی انھوں نے بہت ہی اچھوتے انداز میں طرزِ کلام اختیار کیا اب آئیے دوسرے موضوع پر۔ رشید ترابی مرحوم نے ویسے تو ہزاروں مجلسیں پڑھی ہوں گی لیکن ان کی چند مجالس فن خطابت میں عظیم شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں اور مرحوم کی عظمت کی گواہی دیتی رہیں گی ان یادگار مجالس میں ایک وہ مجلس بھی ہے جس کا موضوع "سجدہ" ہے حضرت فیضؔ نے بھی اسی عنوان پر اپنے قلم کو جنبش دی اور حق ادا کر دیا۔ ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیے۔

طاعت میں آپ فخر جناب جلیل ہیں ایثار میں ذبیح صفت، بے عدیل ہیں
محویت سجود ہیں حق کی دلیل ہیں دنیا میں صرف وہی تو سجدے طویل ہیں

اک سجدہ وہ کہ پشت نبیؐ پر حسینؑ تھے
اک وہ کہ زیر تیغ شہ مشرقین تھے

یہ دو سجود ایک ہیں از راہِ احترام　　اک سجدۂ رسولؐ ہے اک سجدۂ امام
دونوں میں عشق تام ہے، عبدیت تمام　　حق کی رضائے خاص ہے دونوں میں لاکلام
دونوں عبودیت کے لئے زیب و زین ہیں
لیکن سبب یہاں بھی، وہاں بھی حسینؑ ہیں

فرزندِ بوتراب کا یہ سجدۂ نیاز　　ان کے علوئے نفس کا گویا ہے ایک راز
سجدے میں تیغ کھا کے ہوتے ہیں جو سرفراز　　میراث خاص ان کے پدر کی ہے یہ نماز
مقصد جو باپ کا وہی مقصد پسر کا ہے
سجدے میں ہو وصال یہ وصف ان کے گھر کا ہے

طاعت میں ان کا مثل، نہ ان کی کوئی نظیر　　یہ جانشین حسنؑ کے نبیؐ کے ہیں وہ وزیر
سردارِ خلد یہ تو وہ کونین کے امیر　　دونوں ہی مشکلات میں عالم کے دستگیر
تبلیغ میں شریکِ رسولؐ و دود ہیں
یہ دین کی بقا ہے وہ دین کی نمود ہیں

دونوں کے دم قدم سے ہے ایمان کی زیب و زین　　وہ مصطفیٰؐ کا دل ہیں تو یہ ان کے دل کا چین
وہ عینِ کبریا، یہ محمدؐ کے نورِ عین　　خیبر شکن علیؑ ہیں تو باطل شکن حسینؑ
وہ در مصطفیٰؐ کے شہہ قلعہ گیر ہیں
یہ جنگِ کربلا کے جنابِ امیر ہیں

فیضؔ بھرت پوری سنہ ۱۹۶۳ء میں ہونے والے ٹھیڑی خیرپور میرس کے المناک واقعہ سے اس قدر مضطرب ہوئے کہ ایک مدت تک ان شہیدوں کا ماتم کرتے رہے شہدائے ٹھیڑی کی یاد کو جاودانی بخشنے کے لئے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے کچھ عرصہ بعد انھوں نے ایک مرثیہ تصنیف کیا ذیل کے بند اس مرثیے سے پیش خدمت ہیں۔

تھی جن کے دل میں الفتِ اسلام جلوہ گر　　سینہ سپر وہ ہو گئے نام حسینؑ پر
نمرودِ وقت تھے جو مقابل میں سر بسر　　شعلوں سے لڑ گئے وہ کفن سر سے باندھ کر
کہتے تھے ہم کسی سے بھی ڈرتے نہیں کبھی
جو یوں شہید ہوتے ہیں مرتے نہیں کبھی

تھے سب وہ گلبدن چمنِ مصطفےٰ کے پھول — ان کا لہو بہا کے عمل ہوگا کچھ قبول؟
پھر کیا کہو گے حشر میں پوچھیں گی گر بتولؑ — کیوں مار اِن بے گناہوں کو اے غرقۂ جہول؟
روزِ جزا جو حق کی عدالت میں جاؤ گے
جس کے ہو کلمہ گو اسے کیا منہ دکھاؤ گے

الفت بھی اہلِ بیت سے ان کو وہ لازوال — اس دورِ زندگی میں جو آپ اپنی ہے مثال
تم اپنے حال و قال سے پرکھو نہ اُن کا حال — پیچھے ہٹا نہ پاؤں ہوتے گرچہ پائمال
یوں جو بھی عاشقِ شہہ گردوں وقار ہے
جنت ہے موت، دارِ فنا اس کو دار ہے

ان کی رگوں میں خونِ علیؑ تھا رواں دواں — ہمت ہیں، ولولے ہیں نظیر ان کی ہے کہاں
ہم ان کا خون بہنے پہ کرتے نہیں فغاں — لیکن غمِ حسینؑ میں ہر دم ہیں نوحہ خواں
ہم ہیں غلام بادشہِ مشرقین کے
نقشِ قدم پہ چلتے رہیں گے حسینؑ کے

ایسے ستم زدوں کو ستانے سے فائدہ — گھر بار بے کسوں کا جلانے سے فائدہ
ماتم کی صف پہ تیغ چلانے سے فائدہ — اہلِ عزا کا خون بہانے سے فائدہ
اس ظلم سے مراد دلوں کی نہ پاؤ گے
ابھرے گا غمِ حسینؑ کا جتنا دباؤ گے

ایک اور بات جو اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ حضرتِ فیض کی زبان میں بلا کی روانی اور سلاست ہے ان کا ہر مرثیہ سادگی سے معمور ہے اور بقول پروفیسر منظور حسین شور

"فیض بھرت پوری اس اعتبار سے بڑے کامیاب اور ادب آفریں صاحبِ فن ہیں ان کے یہاں مطالب کی صحت اور فکری توازن کے ساتھ زبان کی سادگی اور بیان کا جو بے ساختہ پن ملتا ہے وہی ان کے شعور کی پختگی اور فکر کی بلوغت کا ایسا جوہر ہے جو ان کو معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت سے مشخص کرنے کے لئے کافی ہے۔

سید محمد عالم زیدی عالم
خیرپور

وہ صورتیں الٰہی...

دکھ درد کے دلوں میں سمندر سمو گیا
اشکوں سے آہ دامنِ ہستی بھگو گیا
چادر اجل کی تان کے سویا ہے جب سے فیض
سارا جہان دوستو بے فیض ہو گیا

یہ غالباً ۱۹۶۰ء کا زمانہ تھا۔ گندمی کھِلتے ہوئے رنگ پر ذہین بولتی ہوئی آنکھیں لیے مضبوط جثے کے ایک شخص سے جس کی ایک ایک ادا سے وضعداری اور روایتی قدروں سے وابستگی ٹپک رہی تھی، استاد محترم مولانا نسیم امروہوی کے درِ دولت پر ملاقات ہوئی ــــــ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز، لبوں کے گوشے اس طرح کہ ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہے، اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ موصوف گفتگو کرنے کا ہی نہیں دل میں اترنے کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔ غالباً وہ اپنے کسی مرثیے کے بارے میں انیس دوراں مولانا نسیم امروہوی سے محوِ گفتگو تھے اور اپنے

دل نشیں انداز میں اپنے مرثیے کے کسی بند کو دلائل سے مستحکم کر رہے تھے۔

مشاہدے اور تجربے کی آگ سے کندن بنا ہوا وہ شخص — — فیض بھرتپوری کے نام سے متعارف ہوا... اور پھر پہلی ملاقات خانگی تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔ ۹۱ سال کے اس قدیم مراسم نے ان کے مزاج کی کئی تہوں کو مجھ پر منکشف کیا لیکن ایک تہہ سب پر حاوی رہی، وہ تھی ان کی وضعداری۔

خیرپور کا علاقہ اور خصوصاً لقمان کے ماحول میں کچھ ایسی کشش ہے کہ مقرر ہو یا عالم، شاعر ہو یا سوز خوان جو ایک بار لقمان کی کسی محفل میں داد وصول کر گیا، اس کا لطف اسے بار بار لقمان کی طرف کھینچ کر لاتا رہے گا کیونکہ سخن فہمی کا تعلق علم سے کم اور ذوق سے زیادہ ہوتا ہے۔ فیض صاحب کی میرے ساتھ قربت کی ایک وجہ یہ بھی تھی — فیض بھرتپوری اکثر اہل خیرپور اور اہل لقمان کی دعوت پر تشریف لاتے مگر ہمیشہ ان کا قیام میرے غریب خانے پر ہوتا۔ تمام تمام رات محفلیں رہتیں۔ بے ساختہ اور پر لطف جملوں سے ماحول معطر رہتا۔ علمی اور ادبی نکتے زیر بحث لائے جاتے اور وہ باتوں باتوں میں فی البدیہہ قطعات و رباعیات کہہ کر اپنی حکمت و دانش کے ثبوت فراہم کرتے رہتے — لیکن کیا مجال ہے جو کبھی لہجہ میں تکبر یا شاعرانہ تعلی کا پہلو نظر آجائے۔ اپنے ایک مرثیے میں استاد محترم کے الطاف و کرم کا کس خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا۔

ایک تو خود برکت مرثیہ گوئی کی قدیم ٭ دوسرے پھر میرے استاد کا فیض تعلیم
کیوں رہوں چپ رہ حق میں کہ ہوں فرزند کلیم ٭ چمن فیض ہے پروردۂ الطاف نسیم
پھول چنتا ہی گذر جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ الجھا ہوں نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

میری طینت میں رعونت نہ تکبر نہ غرور ٭ جھک کے ملتا ہوں میں دشمن سے بھی حتی المقدور
خاکساری مرا مسلک تو وفا ہے دستور ٭ جو علیؑ کے ہیں تعلی کا نہیں ان کو شعور
کب کسی غیر سے یہ خلق حسن سیکھا ہے
جن کا مداح ہوں ان سے یہ چلن سیکھا ہے

ایک اور مقام پر مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

پاک ہے خانۂ کعبہ کی طرح دل کا حرم ٭ لن ترانی کا نہ بت ہے نہ تعلی کا صنم

یا علیؑ کہہ کے میں جس وقت اٹھاتا ہوں قدم + پھر مرے زورِ طبیعت کا نہ پوچھو عالم

اسی کلمہ نے مری نظم کو قوت بخشی

یہ اسی ورد نے گویائی کی طاقت بخشی

مزاج میں سادگی اس قدر تھی کہ میزبان ان کی مہمانی میں کبھی الجھن محسوس نہ کرتا گو کہ شعری حوالے سے ان کا رجحان دبیرؔ کے اندازِ سخن کا تھا مگر بیشتر مقامات پر انیسؔ کی سادگی اپنا ایک علیحدہ رنگ جما دیتی ہے۔ اس بند میں بیت میں سادگی اور پرکاری کا کمال ملاحظہ ہو۔

حق سے اس درجہ انہیں جرأتِ بیباک ملی + بات جو حق تھی وہ کھل کر علی الاعلان کہی

کربلا کی جو ہے تاثیر دلوں میں گہری + ان کی تقریروں سے تاریخ وہ تحریر ہوئی

کربلا ایک بغاوت کا فسانہ ہوتا!

یہ نہ بتلاتیں تو واقف نہ زمانہ ہوتا

شاعری میں کسی کے نام کا سجع کرنا بلاشبہ بڑی مہارت کا طالب ہے۔ فیضؔ صاحب نے مرثیہ بعنوان "تاریخِ ظلم، گنجِ شہیداں میں المیۂ خیرپور ۱۹۶۳ء" کے شہیدوں کے ناموں کا سجع جس انداز میں کیا ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ذیل کے بند میں دلنواز، اڑیل، غلام نبی، بھولے اور بلّو کے ناموں کا سجع ملاحظہ فرمائیے۔

جس بات پر یہ اڑ گئے وہ دلنواز تھی + اڑیل کہے کوئی کہ یا انہیں بات کا دھنی

ایسے تھے یہ غلام نبی حق پہ جان دی + بھولے تھے پھر بھی جانتے تھے قدرِ زندگی

کیا قدر ان کے عزم کے آگے ہواؤں کی

ان کی گھٹا سکے گی نہ بل لو جفاؤں کی

مندرجہ بالا مثالوں سے مرحوم کے مراثی کا تنقیدی تجزیہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ کام ناقدینِ سخن کا ہے کہ وہ ان کے محاسن و معائب تلاش کریں اور ان کی حیثیت متعین کریں ـــــ ہاں! البتہ ایک مرثیہ خوان اور ادب کا ادنیٰ طالبِ علم ہونے کے ناطے جب میری نظر مرزا رفیع سوداؔ سے لے کر عصرِ حاضر کے مرثیوں تک پڑتی ہے جو کم و بیش ۱۸ ہزار کے لگ بھگ ہیں (ان میں وہ مرثیے شامل نہیں جو شہرت سے محروم رہے) تو ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ فیضؔ بھرتپوری مشکل سے مشکل مقام سے بڑی آسانی کے ساتھ گزر جاتے ہیں ـــ انہوں نے اپنی مرثیہ نگاری کے ضمن میں

کیسی خوبصورت دلیل دی ہے ۔

میری طینت میں جو ہے مرثیہ گوئی شامل ٭ جیتے مرتے میں سکونِ ابدی ہے حاصل
قبر میں میری نکیرین جو ہوں گے داخل ٭ صاف کہہ دوں گا کہ ہے مدح کا دفتر مرا دل

پھر بھی کچھ ہوگی اگر سود و زیاں کی پرسش
میں یہی مرثیہ پڑھ دونگا کہاں کی پرسش

اسی مرثیہ میں آگے چل کر جناب عباسؑ کی وفا اور پانی سے احتراز کو کس چابکدستی اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے ۔

چشم آفاق نے دیکھے یہ وفا کے منظر ٭ ہائے وہ پیاس' وہ عباسؑ کی محتاط نظر
دور سے مشک بھری تھام کے تسمہ جھک کر ٭ منہ پھرائے ہوئے بیٹھے رہے اللہ رے جگر'

ڈر یہ تھا چشمِ وفا میں نہ سبک ہو جائیں
کششِ آب سے آنکھیں نہ خنک ہو جائیں

یا ایک قطعہ جناب علی اکبرؑ کے لئے کہا جس کے چوتھے مصرعے میں اردو زبان کا لطف اور ندرت جو مجھ کو بہت کم مرثیوں میں نظر آیا ۔

کہاں ہے فیضؔی میں طاقت ثنائے اکبرؑ کی
ہوا نہ ہوگا زمانے میں اس طرح کا جری
جہاں فرس سے گرے تھے وہاں سے خیمہ تک
رگڑ کے ایڑیاں تاریخِ کربلا لکھ دی

آج فیض بھرتپوری ہم میں نہیں ہیں ـــــ سوچتا ہوں کہ ایک ایک کر کے تمام ساتھی رخصت ہو رہے ہیں ۔ بدر اللہ آبادی، اطہر ہرسری، ڈاکٹر منظور رائے پوری، ڈاکٹر صفدر صاحب، آشکار صاحب، نسیم صاحب اور فیض بھرتپوری سب ہی چلے گئے مگر یہ سب زندہ ہیں ۔ ان کی زندگی کا ثبوت ہمارے درمیان ان کے مراثی ہیں ـــــ ـــــ اس موقع پر فیض بھرتپوری صاحب کا ایک شعر جو موصوف نے میر انیس کے لئے کہا ہے اگر میں ان ہی کے لئے لکھ دوں تو بے جا نہ ہوگا ۔

پائی حیات مدحِ شہِ مشرقین سے!
زندہ ہے حشر تک یہ ثنائے حسینؑ سے

طارق عباس آذر

○

"فیض بھرتپوری کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ"

سید فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری کی شاعری میں سب سے نمایاں صنف مرثیہ ہے۔ انہوں نے مرثیہ نگاری میں فنی اور معنوی طور پر اس کارواں کی ہمرکابی کی ہے جس میں صفیر بلگرامی، جلیل، جوش ملیح آبادی، آغا شاعر دہلوی، نسیم امروہوی، صبا اکبر آبادی، جمیل مظہری اور دلو رام کوثری جیسے مرثیہ گو شامل ہیں۔

فیض بھرتپوری کے مرثیے میں بظاہر تقریباً تمام بنیادی اور مروجہ فنی محاسن نظر آتے ہیں لیکن جو عنصر ان کے مرثیے کو ممتاز کرتا ہے، وہ وابستگی (INVOLVEMENT) کا شدید تر احساس ہے۔ داخلیت کا یہ احساس ان کے مرثیے میں چاندنی کی طرح پھیلا ہوا ہے اور ان کے مرثیے میں واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ واقعیت، مقصدیت اور بلاغت کو نمایاں کرتا ہے۔

مرثیہ نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ باوجود اس کے ہر دور میں بے شمار شعراء نے مرثیہ گوئی کی ہے اور بیانیہ شاعری کے ذریعہ واقعات نگاری، منظر نگاری اور زبان دانی کے کمال دکھائے ہیں ـــــ مقبولیت، شہرت اور نمائندگی صرف ایسے شعراء کو حاصل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے مرثیوں میں " داخلیت " کو نمایاں عنصر کے طور پر اہمیت دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مرثیہ میں 'داخلیت' کے عنصر کو اہمیت نہ دی جاتی رہی ہوتی تو یہ صنفِ شاعری کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔

مرثیہ، عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں میں مسلک کے حوالہ سے تخلیق کیا گیا تھا۔ گولکنڈہ کے قلی قطب شاہ، ملا وجہی اور غواصی نے اسے بیانیہ انداز میں ڈھالا، نصرتی نے بیانیہ عنصر کو فطرت سے قریب کیا۔ دکن میں مغلیہ دور کے مرثیہ نگاروں شاہ حسین زوقی، غلامی گجراتی، ندیم بیجاپوری اور ولی اورنگ آبادی نے مرثیہ میں زبان و بیان اور واقعہ نگاری میں داخلیت کا تاثر شامل کیا۔ فیضی کے یہاں یہ تاثر نمایاں ہے ـــــ شمالی ہند میں پہلے صاحبِ دیوان شاعر سید فضل علی افضل کے کلام میں مرثیے بھی شامل ہیں۔ ان مرثیوں میں داخلیت، عقیدتمندی کے حوالے سے ملتی ہے۔ افضل کے بعد میاں محمد مسکین کے مرثیے میں داخلیت نمایاں ہوتی ہے اور مرثیہ ارتقاء پاتا ہے۔ اس طرح مرثیہ جب میر تقی میر کے پاس پہنچتا ہے تو داخلیت سے مالامال ہو جاتا ہے لیکن میر نے مرثیہ کے دیگر محاسن پر کم توجہ دی ـــــ رفیع سودا نے اس کمی کو پورا کیا اور فنِ قصیدہ گوئی میں اپنی مہارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرثیہ کے مدح کے مرحلے میں داخلیت کو نمایاں کیا اور اچھا مرثیہ گو ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

مرثیہ میں میر کی غزل اور سودا کے قصیدہ کی داخلیت کے اثرات کی شمولیت نے مرثیہ کے مزاج میں بڑی وسعت پیدا کر دی اور مرثیہ مقبول تر ہوتا گیا ـــــ ـــــ اس کے بعد مرثیہ جب مثنوی نگاروں کے ماحول میں پہنچا تو میر ضمیر، میر خلیق، فصیح اور دلگیر نے اس میں زبان کی شوکت، تاثر اور انسانی نفسیات کے آہنگ کو اجاگر کیا۔ میر انیس نے مرثیہ کے بیانیہ حصے اور منظر نگاری کو تمام شعری صنعتوں اور

فنی محاسن کے کمال کے ساتھ سجایا ــــــ لیکن خاص طور پر جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور مکالمہ نگاری میں انہوں نے زبان و بیان کی شان و شوکت کے ساتھ داخلیت کو اس درجہ پیراستہ کیا کہ ان کے مرثیے کی ہر سطر میں داخلیت کی ایک کائنات سی بچھتی چلی گئی ــــــ اور ان کا مرثیہ تاثر اور تاثیر کی رفعتوں کو چھونے لگا ــــــ ــــــ یہ درست ہے کہ انیسؔ کے مرثیے میں تاریخی مبالغہ زیادہ ہے اور فنی شان کو بڑھانے کے لئے انہوں نے زبان و بیان کے کمال اور مثنوی کے اثرات سے خوب فائدہ اٹھایا ہے اور واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری میں میر حسنؔ سے معنوی اکتساب کیا ہے ــــــ لیکن یہ بھی درست ہے کہ میر انیسؔ، مرثیہ سے گہری وابستگی (INVOLVEMENT) رکھتے تھے۔ انہوں نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ وہ شاعری میں داخلیت کے قائل تھے اور دبستان لکھنؤ کے شعراء سے اس معاملے میں مختلف تھے، چنانچہ انہوں نے مرثیہ میں اپنے اس مزاج کا بھرپور اظہار کیا۔ مرثیہ کے ہر جز کو جیتا جاگتا بنا دیا اور فطرت سے قریب کر دیا۔ تمام واقعات، جذبات، مکالمات اور کرداروں کو انسانی نفسیات سے ہم آہنگ کر دیا۔ کیا یہ سب انیسؔ کی شدید تر وابستگی اور داخلیت کے بغیر ممکن تھا؟ ــــــ ــــــ انیسؔ کی مرثیہ میں ذہنی، روحانی اور جذباتی شمولیت نے مرثیہ کو ان کی ذات سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ ان کے مرثیہ کو پڑھنے والا بعض اوقات یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کربلا کا واقعہ جیسے لکھنؤ میں پیش آیا ہو کیونکہ انیسؔ، مرثیے کے ہر جز کو اپنی شخصیت اور ذات کی داخلیت میں برتتے چلے گئے ہیں اور مرثیے میں مزاج، ماحول، زبان، مکالمات، جذبات اور تمدن کے پس منظر میں لکھنویت پھیلتی چلی گئی ہے ــــــ مرزا دبیرؔ کے مرثیے میں انیسؔ کے مرثیے کی کئی خصوصیات موجود ہیں لیکن دبیرؔ کا مرثیہ بلند ہوتے ہوئے بھی انیسؔ کے درجہ کا نہیں ہے البتہ دبیرؔ نے مرثیے میں عالمانہ شان کا اضافہ کیا ہے ــــــ انہوں نے مرثیہ میں رکھ رکھاؤ پیدا کیا ہے جبکہ رزمیہ اور فخریہ لکھنے میں انیسؔ سے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی عالمانہ زبان سے کلام میں بلندی ضرور پیدا ہوئی ہے لیکن یہ زبان جذبات اور احساسات کی فطری، موثر اور بھرپور ترجمانی میں کامیاب نہیں ہوئی ــــــ بعد میں مرزا تعشقؔ، میر نفیسؔ، وحیدؔ، مرزا محمد جعفر، پیارے رشیدؔ صاحب اور شادؔ عظیم آبادی نے اپنی اپنی انفرادی داخلیت کے حوالے سے اردو مرثیہ میں

اہمیت حاصل کی۔

مرثیہ کے فنی ارتقاء کی تاریخ پر فیض بھرتپوری کی گہری نظر ہے اور انہوں نے اپنے مرثیے کے لئے ایسے فنی عناصر کا انتخاب کیا ہے جو ان کے مرثیے کی تحسین کر سکیں اور عصری ترجیحات و لسانیات سے اسے ہم آہنگ کر سکیں ــــــ ان کے مرثیے میں، میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ان کا مرثیہ محض فن برائے فن نہیں ہے بلکہ وہ اسے بطور واسطہ (MEDIA) استعمال کر کے کسی واضح مقصدیت کا ابلاغ کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ ــــــ اس مقصد کے لئے وہ علمی، منطقی اور روحانی نکات کے پس منظر اور تاریخی واقعات کے تناظر میں عصری روایات اور رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں، تقابل یا موازنہ کرتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں اور قاری کو قائل کر کے مقصدیت اس کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

فیض بھرتپوری نے مرثیہ نگاری میں معنوی طور پر میر انیس اور مرزا دبیر کو پیش نظر رکھا ہے لیکن ان کی تقلید کو فن کی معراج بنانے کے بجائے ان سے INSPIRATION کو اپنی فکری و فنی انفرادیت میں ڈھالا ہے ــــــ ــــــ چنانچہ جب ان کے مرثیہ میں وابستگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے تو اس کی نوعیت انیس کے مرثیہ میں وابستگی کے عنصر سے خاصی مختلف ہو جاتی ہے ــــــ فیض بھرتپوری کے مرثیہ میں وابستگی کے طیف (SPECTRUM) میں تین طرح کے تاثراتی رنگ نمایاں ہیں ــــــ پہلے تاثر کو عقیدتمندی اور وارفتگی کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس مرحلے میں وہ واقعۂ کربلا کے ہر مثبت کردار کے لئے عقیدہ کے لحاظ سے، انسانی اعتبار سے اور کردار کی عظمت کے لحاظ سے اپنی عقیدتمندی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے مثالیت عطا کر دیتے ہیں، گویا مرثیے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

دوسرا تاثر واقعۂ کربلا، واقعات کربلا اور واقعۂ کربلا کے مثالی کرداروں کو تاریخی اور انسانی حیثیت عطا کرنے کا اقدام ہے۔ وابستگی کے اس مرحلے میں فیض بھرتپوری کا انداز بالکل تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ اسی طرز فکر کو اختیار کر لیتے ہیں جس کے تحت سعدی نے بغداد کا مرثیہ لکھا تھا یا حالی

نے مرثیۂ دہلی لکھا تھا، اقبال نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اور "سر راس مسعود" مرثیے لکھے تھے اور جزیرۂ سسلی پھر بلادِ اسلامیہ کو موضوعِ مرثیہ بنایا تھا، حالی نے غالب کا مرثیہ لکھا تھا اور مولانا ظفر علی خان نے اپنے والد مولانا سراج الدین کا مرثیہ لکھا تھا۔ فیض بھرتپوری اس مرحلے میں بھی کامیابی کے ساتھ اپنے موضوع کو یادگار بنا دیتے ہیں۔

تیسرا تاثر مقصدیت کا ہے۔ اس مرحلے میں وہ عام طور پر واقعات سے MORALISATION کی فضا تخلیق کرتے ہیں اور مولانا حالی کے مسدس "مدو جزرِ اسلام" جیسی مقصدیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وابستگی کے اس مرحلے میں وہ یکدم ایک مبلغ اور مصلح بن جاتے ہیں۔ تنقید اور ترغیب سے موثر طور پر کام لینے لگتے ہیں۔ ان کا لہجہ بھی بدل جاتا ہے ؎

ان کے کردار سے ہوتی ہے ندامت کیسی ٭ جب ضمیر ان کے نجس ہیں تو طہارت کیسی
کھیل کی پڑ گئی عادت تو عبادت کیسی ٭ شکوہ اپنوں سے ہے غیروں سے شکایت کیسی
شرکتِ مجلسِ شبیرؑ سے کتراتے ہیں
آنے دیتے ہیں کسی کو نہ یہ خود آتے ہیں

فیض بھرتپوری کے مرثیے میں مرزا دبیر کے اثرات بھی ملتے ہیں، خاص طور پر زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ، وضعداری اور کلام میں عالمانہ شان پیدا کرنے کے معاملات میں انہوں نے دبیر کے اثرات کو قبول کیا ہے لیکن قبولیت کی یہ صورت تقلید نہیں کہلا سکتی بلکہ اسے پسندیدگی کا یا ہم مزاجی کا نام دیا جا سکتا ہے ــــــ مرثیہ لکھنے میں بھی وہ دبیر کا سا انداز اختیار کرتے ہیں جبکہ رزمیہ کے معاملے میں وہ انیس کی طرف مائل ہیں ــــــ اپنے استاد مولانا نسیم امروہوی سے انہوں نے فنِ مرثیہ گوئی سیکھا ہے لیکن انفرادیت اپنی قائم کی ہے۔

فیض بھرتپوری کے مرثیہ میں سرشاری اور وجدان کا ایسا عالم ہے جو کم مرثیہ نگاروں کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیے میں فن اور زبان و بیان کی صلاحیت ملتی ہے۔ موزوں الفاظ، عمدہ تراکیب، خوبصورت اور برمحل

تشبیہات و استعارات اور استادانہ بندشیں کائنات فن کی طرح ان سے مرثیے میں بچھی ہوئی ہیں۔ خیال آفرینی اور جدتِ خیال کے ساتھ ساتھ استادانہ پرکاری کے کمالات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ع

کیوں رہوں چپ رہِ حق میں کہ ہوں فرزندِ کلیمؔ

اس مصرع میں اپنے والد سید اکرام حسین کے تخلص کلیمؔ سے کیا خوب رعایت لی ہے۔ اسی طرح ایک قطعہ میں جناب علی اکبر کے بیان میں کیا خوب کہا ہے کہ

جہاں فرس سے گرے تھے وہاں سے خیمہ تک
رگڑ کے ایڑیاں تاریخ کربلا لکھ دی

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ع

جو علیؑ کے ہیں تعلّی کا نہیں ان کو شعور

فیضؔ بھرتپوری نے مرثیہ نگاری کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۶۴ء میں کیا۔ جدید اردو مرثیہ کے لئے ان کا دم غنیمت تھا۔ ان کا مرثیہ کثیر المقاصد ہوتا ہے انہوں نے ہر زمانے میں اپنے مرثیے کو عصری تقاضوں اور عصری لسانیات سے ہم آہنگ رکھا ہے ___ ان کے مرثیے میں تمام اجزاء اور فنی محاسن موجود ہوتے ہیں۔ ان کا ہر مرثیہ عصری تناظر میں کسی نہ کسی واضح مقصدیت کا ابلاغ بھی کرتا ہے۔ وہ بلاشبہ ایک بیدار مغز شاعر تھے ___ ان کے مرثیوں میں جذبات نگاری میں مبالغہ سے زیادہ حقیقی اور فطری رنگ ملتا ہے اور وہ جذبات نگاری کے معاملے میں انسانی نفسیات سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں ___ سراپا نگاری، بزم نگاری اور رزمیہ میں وہ میر ضمیر کو رد کرتے ہیں، صرف رزمیہ میں انہوں نے کسی حد تک میر انیس کو قبول کیا ہے ___ کردار نگاری کو البتہ انہوں نے اہمیت دی ہے اور تمثالیت کے تاثر میں مقصدیت کو رفعت دی ہے ___ منظر نگاری میں جزئیات نگاری سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ منظر نگاری یا جزئیات نگاری بھی مبالغہ سے پاک ہے۔ اس سے انہوں نے فضابندی کا کام نہیں لیا ہے بلکہ ماحول کی عکاسی کی ہے ___ واقعہ نگاری میں بھی وہ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں مثلاً حضرت سکینہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ

روکے یہ بولی کہ بیزار ہوں اب جینے سے
تیر پیوست ہیں کس طرح لگوں سینے سے

یہاں 'تیر پیوست ہیں' کا حوالہ کس قدر حقیقی ہے۔ وہ مکالمہ نگاری میں موقع، ماحول اور کردار میں مناسبت قائم رکھتے ہیں۔ مکالمہ نگار کی حیثیت 'اہمیت اور اہلیت سے خوب واقف ہیں چنانچہ مکالمہ لکھتے وقت کرداروں کی حیثیت' اہمیت اور نفسیات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور موقع کے مطابق فطری مکالمات ادا کراتے ہیں۔ داخلیت کے تاثر سے ان کی واقعہ نگاری اور مکالمہ نگاری خاصی بلند ہو گئی ہے۔ اسی طرح سراپا نگاری کے بجائے سیرت نگاری پر توجہ دے کر اپنے مرثیے کا درجہ مقصدی اعتبار سے بلند کر دیا ہے۔

ـــ ان کے بیانیہ کلام میں بھی معنوی آہنگ نمایاں رہتا ہے ـــ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ذکرِ مجلس سے اکثر ذکرِ شاہؑ کو مربوط کر دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

دین نے فریاد جو کی اپنی حفاظت کے لئے
کربلا آ گئے شبیرؑ بھی نصرت کے لئے

فیضؔ بھرت پوری کا مرثیہ میر انیسؔ کے بعد کا مرثیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مروجّہ مرثیہ' ابتدائی یا بنیادی مرثیہ سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ انیسؔ کے دور میں مرثیے میں فنی طور پر غزل' قصیدے اور مثنوی کی اکثر و بیشتر خصوصیات کا اجتماع ہو گیا تھا یعنی قصیدے کی مدح' مثنوی کی واقعہ نگاری اور منظر کشی نیز غزل کی جذبات نگاری کے بھرپور رچاؤ کے ساتھ مرثیہ تخلیق کیا جانے لگا تھا' بعد میں جنگِ آزادی کے اثرات اور دیگر مذہبی' اصلاحی اور قومی تحریکات نے مرثیہ میں طرح طرح کے مضامین و موضوعات شامل کیے اور رفتہ رفتہ مر یہ میں مقصدیت واضح طور پر نمایاں ہوتی چلی گئی ـــ فیضؔ بھرت پوری کا مرثیہ اسی نوعیت کا ہے ـــ پھر انہوں نے ۷۵ سال تک مرثیہ کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ہے چنانچہ مرثیہ نگاری کے ساتھ اگر انہوں نے غزل اور قصیدے بھی کہے ہیں تو یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کیونکہ ان اصناف میں مہارت کے بغیر مرثیہ گوئی میں کمال پیدا نہیں ہو سکتا ـــ فیضؔ کی غزلیں عام طور پر روایتی ہیں۔ قصائد میں

البتہ استادانہ بندشیں نمایاں ہیں۔ نعت، سلام اور منقبت پر مرثیہ کا فنی تاثر گہرا ہے۔

مرثیے کی ہمہ گیری یہ ہے کہ ابتدائی دَور میں یہ مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند غرض ہر صنف میں لکھا جاتا رہا اور مرثیہ گو ہر صنف میں اپنے فن کا کمال اور طبیعت کی جولانیاں دکھاتے رہے۔ پھر یہ چو مصرع (مربع) کی ہئیت میں عام ہوا، لیکن سودا نے اسے مسدس میں مخصوص کیا اور مرثیہ کی مسدس میں روایت پڑ گئی۔ انیس سے کچھ پہلے اور خود انیس کے زمانے میں اس کی مسدس ہئیت کو بھرپور طریقے سے برتا گیا اور یہ تصوّر عام ہو گیا کہ مرثیہ کے لئے مسدس سے بہتر کوئی اور ہئیت ممکن نہیں، لہٰذا یہ سلسلہ آج تک چلا آتا ہے ـــــ لیکن مرثیہ گو شعرا ہر دَور میں مرثیہ کی دیگر ہئیتوں میں بھی طبع آزمائی کرتے آئے ہیں۔ خاص طور پر رباعی اور قطعہ تقریباً ہر مرثیہ گو کے کلام میں عام طور پر مل جاتے ہیں ـــــ فیض بھرت پوری کے کلام میں بھی رباعیات اور قطعات کا موجود ہونا اس لحاظ سے ایک فطری بلکہ نفسیاتی امر ہے۔

فیض بھرتپوری کے کلام میں ان کے عقیدے کا رنگ گہرا ہے لیکن اپنے مرثیوں میں خاص طور پر انہوں نے درسِ اخلاق کا بھی موثر ابلاغ کیا ہے اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کی جابجا ترجمانی کی ہے۔ ہر سود و زیاں کے تصوّر اور تکلف سے بے نیاز ہو کر انہوں نے حقانیت کا علم بلند رکھا ہے اور واقعۂ کربلا کے کرداروں کو استعارہ بنا کر انہوں نے انسانیت اور عظمتِ انسانی کے تاثر کو جِلا بخشی ہے۔ یہی ان کا عقیدہ ہے، یہی ان کا فنی مسلک ہے اور یہی ان کی ریاضت کا ثمر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ؎

مدحتِ پنجتنِ پاک کیا کرتے ہیں\
یوں ثمر اپنی ریاضت کا لیا کرتے ہیں

فیض بھرتپوری بظاہر آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ہم بے فیض نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا کلام اکیسویں صدی میں بھی ہمارے ساتھ ہو گا کیونکہ اس میں فنی طور پر زندہ رہنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

سرفراز ابد

حرفِ عقیدت

یہ حقیقت ہے کہ مجھے نثر لکھنے کا نہ تو تجربہ ہے نہ سلیقہ..... بس لفظوں کو الٹا سیدھا جوڑ کر اپنا کام چلا لیتا ہوں۔ باقاعدہ مضامین لکھنا تو میرے بس کی بات ہی نہیں۔ چاہے یہ تحریر صرف تاثرات ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔

بہرحال جناب فیضؔ بھرتپوری میرے بزرگ بھی تھے اور قریبی عزیز بھی اس کے علاوہ جو ادب کے حوالے سے ایک تعلقِ خاطر تھا دراصل وہی سب سے مضبوط اور معتبر رشتہ تھا۔ آج فیضؔ صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو وہ بھی یاد آتے ہیں اور ان کی باتیں بھی۔ جی چاہتا ہے کہ فیضؔ صاحب کے بارے میں کچھ تحریر کروں مگر ہر بار یہی خیال ہوتا ہے کہ میں ہوں کیا اور میرے لکھے کو یہی سمجھا جائے گا کہ عزیزداری نباہی ہے۔ یا پھر سوال یہ ہوگا کہ لکھنے والے کا معیار و اعتبار کیا ہے۔ بس یہی کشمکش ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ شاعرِ آلِ محمدؐ جناب نسیمؔ امروہوی زندہ ہوتے تو یہ منصب انکا ہی تھا کہ وہ فیضؔ صاحب پر تفصیل سے لکھتے جو اپنی زندگی میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد میرا بستہ تو فیضؔ صاحب ہی سنبھالیں گے۔ نسیمؔ صاحب اپنے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ عزیز فیضؔ صاحب ہی کو رکھتے تھے اور انکی یہ آرزو تھی کہ فیضؔ صاحب ہی انکے جانشین ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نسیمؔ صاحب

کی زندگی میں ہی انکے اکثر شاگرد انکی عدم موجودگی میں فیضؔ صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ جنکا نام لکھنا اب اسلیئے مناسب نہیں ہے کہ وقت وحالات بدل چکے ہیں۔

فیضؔ صاحب بہت کھرے اور محبت کرنے والے ایک سچّے مومن تھے اور سچی بات تو ان سے جو چاہے جب چاہے کہلوا لے انکی حق گوئی ہر قسم کی مصلحت سے بے نیاز تھی۔ اکثر اس سچائی کی تلوار سے تعلقات بھی مجروح ہو جاتے تھے مگر فیض صاحب کو ان باتوں کی کوئی پرواہ کبھی نہ ہوتی۔

فیضؔ صاحب سے اکثر میری نشستیں رہتی تھیں۔ اور وہ اسقدر شیریں کلام تھے کہ گھنٹوں ماضی کے دلچسپ قصے اسطرح بیان کیا کرتے کہ وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا اور جب انکی جادو بھری گفتگو کے حصار سے نکلتے تب معلوم ہوتا کہ "۴" یا "۵" گھنٹے گذر گئے۔

اپنی مرثیہ نگاری کے متعلق فرماتے کہ جنیبہ ایرانیاں میں مرثیہ کی مجالس کا آغاز ہوا ہم وہاں سننے گئے جسکے دوسرے برس ڈاکٹر یاور عباس کے گھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا اور یوں کراچی میں چند برسوں میں ایک فضا رثائی ادب کی بن گئی۔ ہم اسوقت غزلیں لکھتے یا منقبت۔ قصیدے وغیرہ ایک روز ہماری بیوی نے ہمیں بڑے موثر انداز میں مرثیہ کہنے کی تحریک دلائی سو ہم انکے کہنے سے مرثیہ لکھنے بیٹھ تو گئے لیکن یقین یہ ہرگز نہ تھا کہ ہم مرثیہ لکھ سکیں گے۔ چنانچہ دس بند مسدس کے لکھ کر اپنے انتہائی بے تکلف دوست علی اطہر جعفری مرحوم کے توسط سے نسیم امروہوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے عرض کیا مولانا ایک غرض سے حاضر ہوا ہوں اور وہ یہ کہ مرثیہ کے دس بند پہلی مرتبہ لکھنے کی جسارت کی ہے اور آپکو سنا کر یہ مشورہ لینا ہے کہ میں مرثیہ لکھوں یا نہیں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں مرثیہ لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو بلا تکلف فرما دیجئے گا میں آپکا شکریہ ادا کرونگا اور یہ

کاروبار یہیں ختم کردونگا۔ جو آپ یہ ارشاد فرمائیں کہ یہ میدان میرے لئے بھی ہے تو انشاءاللہ یہ سلسلہ آپکی رہنمائی میں شروع ہوجائیگا۔ چنانچہ نسیم صاحب نے پوری توجہ سے میرے وہ دس بند سماعت فرمائے اور بڑی ہمت افزائی کرتے ہوئے مرثیہ لکھنے کی ترغیب دی۔

اسطرح میری مرثیہ نگاری کا آغاز ہوگیا۔ اب استاد تو ہوگئے نسیم امروہوی اور کسوٹی بنالیا میں نے اپنی بیوی کو۔ فیض صاحب کا کہنا تھا کہ مرثیہ وہ نہیں ہے جسمیں صرف واہ واہ ہوتی ہے یا شوکت الفاظ کے اوپر داد حاصل کرنے کیلئے شاعری کی جاتی ہے۔ دراصل مرثیہ تو وہی ہے جس میں مصائب بھرپور ہوں۔ مرثیہ وہ ہے جسکو سن کر مومنین دل کھول کر جناب فاطمہ زہرا کو انکے فرزند کا پرسہ دیں۔ اسی لئے میں سب سے پہلے مرثیہ کہہ کر اپنی بیوی کو سناتا ہوں جو میری پہلی ناقد ہے فیض صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں نے مرثیہ لکھا اور اپنی بیوی کو سنایا جب مرثیہ ختم کرچکا تو پوچھا کیا رائے ہے تو کہنے لگیں کہ یہ مرثیہ کیسا ہے کہ میری آنکھیں نم تک نہ ہوسکیں۔ ان کا یہ جملہ سنا اور مرثیہ لیکر پھر بیٹھ گئے۔ پندرہ دن کی مزید کاوش کے بعد جب دوبارہ سنایا تو ہماری بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور اب نسیم صاحب قبلہ کے پاس مرثیہ سنانے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ فیض صاحب مصائب بہت سخت لکھتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ فیض صاحب نے مرثیے لکھے اور تادم آخر پورے انہماک اور انتھک محنتوں سے ایسے مرثیے تخلیق کئے جو فکر انگیز بھی ہیں جنمیں تنوع بھی ہے شاعری بھی ہے اور رثائیت بھی مختصر یہ کہ ایک طرف تو انکے استاد اپنا بستہ سپرد کرنے پر آمادہ تھے اور دوسری طرف یہ الزام تھا کہ نسیم صاحب فیض کو مرثیہ کہہ کر دے دیتے ہیں جب تو کلام میں اسقدر پختگی، روانی

فکر اور شاعری ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ وقت بھی آہی گیا جب فیضؔ صاحب نے بغیر نسیمؔ صاحب کی اصلاح کے ویسے ہی تقریباً دس معیاری مرثیے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ انکی ہی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ فیضؔ صاحب کے جو مرثیے بہت مقبول ہوئے ۔ انمیں ایک مرثیہ تو پانی کے عنوان پر ہے ۔ دوسرا "تبرک" پر اور شہدائے ٹھیری کیلئے جو مرثیہ آپ نے لکھا اسکو بھی بہت پذیرائی حاصل ہوئی ۔ مقبولیت کے حوالے سے عرض کروں کہ فیض صاحب کا کلام پاکستان میں تو جا بجا پڑھا ہی جاتا ہے اسکے علاوہ بھی امریکہ، برطانیہ اور کنیڈا میں بھی مومنین انکا کلام ماہ محرم میں پڑھتے ہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو پاکستانی مرثیہ نگاروں کے مرثیے پڑھے جاتے ہیں جن میں ایک جناب نسیمؔ امروہوی اور دوسرے فیضؔ بھرتپوری ہیں ۔ ممکن ہے اس تعزیتی مجلے میں اُن خطوط کو بھی شامل کر لیا جائے جو فیضؔ صاحب کو بیرون ملک سے موصول ہوئے جن میں فیضؔ صاحب کی مرثیہ نگاری کا اعتراف انکی شاعری کا لوہا مانا گیا ہے اور انکی مطبوعات طلب کی گئی ہیں ۔ ان خطوط سے بھی فیضؔ صاحب کی شخصیت اور مقبولیت کھل کر سامنے آتی ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ فیضؔ صاحب اس دار فانی سے رخصت ہو گئے لیکن اپنا فن اور تجربہ اپنے شاگرد رشید یعنی نیرؔ اسعدی کو منتقل کر گئے جن میں واضح اور روشن امکانات موجود ہیں جو یقیناً ایک روز اپنے استاد کا نام روشن کریں گے یہی نہیں فیضؔ صاحب کے بڑے فرزند جناب باقر زیدیؔ نے رثائی ادب کی اس ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے جو انکو باپ دادا سے ورثہ میں ودیعت ہوئی ہے اور انشاء اللہ وہ اس سال اپنی پہلی تخلیق پیش کریں گے ۔ خداوند عالم ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور فیضؔ صاحب مرحوم کو جوار رحمت اور سایۂ دامان پنجتن میں جگہ عطا فرمائے ۔ آمین ثم آمین ۔

آغا نیئر علی (نیئر اسعدی)

"دنیائے مرثیہ گوئی میں اک چراغ اور گل ہو گیا"

عظیم مرثیہ گو شاعر جناب فیض بھرت پوری ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور ملت پھر ایک اچھے مرثیہ نگار سے محروم ہو گئی۔ پچھلے چند سالوں میں شہر کراچی سے جتنے مرثیہ گو شاعر ہم سے بچھڑے ہیں۔ اتنی تعداد میں نئے مرثیہ لکھنے والے سامنے نہیں آئے پھر بھی جو تعداد سامنے آئی ہے ان میں سے بیشتر سے اچھی توقعات رکھی جا سکتی ہیں کہ وہ مستقل مرثیہ کہیں گے۔ ان میں اکبر فیض آبادی، عبدالرؤف عروج، سرفراز آبد، نسیم اختر، مشہور جعفری، عارف امام، پرویز محب فاضلی، کوثر نقوی شامل ہیں۔

فیض بھرت پوری صاحب سے میرا تعلق ۱۹۸۱ء سے تھا۔ جب میں نے پہلا مرثیہ کہا تھا اور سرفراز آبد کے توسل سے میری فیض صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت سے ۱۹۸۹ء تک میں نے ہر سال نیا مرثیہ کہا اور ہر مرثیے پر مرحوم نے مشورہ سخن کیا۔ اِس وقت جبکہ میں نیا مرثیہ کہہ رہا ہوں وہ وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے وہ اب بھی میری رہنمائی کر رہے ہیں اُن سے آٹھ سال مرثیے کے متعلق جو گفتگو بات دن رہی ہے وہ اب بھی اور ان شاء اللہ آئندہ بھی میری رہنمائی کرتی رہے گی۔

انھوں نے کبھی اپنے آپ کو استاد نہیں کہا لیکن وہ واقعی استاد تھے مگر وہ جب ملے ایک دوست کی طرح ملے اور جب میں اُن سے ملا انھوں نے نئے مرثیے کی بابت پوچھا میں نے نئے مرثیے کے بند فقط فقط سنائے تو ہمیشہ بہت خوش ہوئے اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ شاید وہ مجھ سے مستقبل میں بہتر توقع رکھتے تھے اور میں ہمیشہ اُن کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کرتا رہا۔

انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن انہیں عمر کے آخری ۱۴ سالوں میں مرثیہ سے خاص رغبت ہو گئی تھی اور وہ ہر سال نیا مرثیہ کہہ کر پڑھتے تھے

رثائی ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ اُن کے مراثی میں "واہ" سے زیادہ "آہ" ملتی ہے۔ اور یہی مآلِ مجلس ہے۔ وہ بہت سخت مصائب رقم کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جناب فاطمہ زہراؑ مجلس میں موجود ہیں اور اہلِ عزا کو انہیں پُرسا دینا ہے۔ اور دامان بنے مجسمِ انتظار ہیں کہ آنسوؤں کے گوہر اس میں کب گرتے ہیں۔ اسلئے اشک افشانی کے لئے مصائب کا بھرپور انداز میں رقم کرنا ضروری ہے۔

فیض صاحب مرحوم نے فلسفۂ صبر کے (عنوان) کے مرثیے میں جو مصائب کہے ہیں وہ پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں چند بند ملاحظہ فرمایئے

قتلِ شبیرؑ کی پہنچی جو سکینہ کو خبر — باپ کو ڈھونڈنے نکلی شہِ دیں کی دختر
جب ترے لاشہ کے پہنچی وہ ملول و مضطر — آئی آواز کہ آ۔ میں ہوں یہاں جانِ پدر
یہ تھی روتی جو پہنچی تو یہ محشر دیکھا
لاشۂ سبطِ نبی۔ خاک پہ بے سر دیکھا

گر پڑی باپ کے لاشے پہ بصد شیون و شین — کانپ اٹھی لاش تڑپ کر جو کہے اس نے وہ بین
صبر کر حلقِ بریدہ سے یہ کہتے تھے حسینؑ — وہ یہ کہتی تھی کہ بابا مجھے آتا نہیں چین
بولے شہ ہجر میں مطلق بھی نہ کل پاؤں گا
قید خانے میں تجھے لینے کو میں آؤں گا

پھر کہا شہ نے کہ اے راحتِ دل راحتِ جاں — صبر کر صبر کہ غم سے ہیں مرے آہ و فغاں
تیرے آرام و سکوں کا ہے یہی اک عنواں — آ لپٹ جا مرے سینے سے تڑپتی ہے زباں
رو کے یہ بولی کہ بیزار ہوں اب جینے سے
تیر پیوست ہیں کس طرح لگوں سینے سے

کھینچ لوں تیروں کو بیٹھے ہیں جو آپ اگر — کچھ اذیت نہیں ہوگی مجھے قربان پدر
لب اعجاز سے گویا ہوا حیدرؑ کا پسر — سخت دشوار ہے بیٹی یہ تم سے نہ ہوگا دختر
دل کو کیا جانئے کس طرح سنبھالا میں نے
تیر جب گردنِ اصغرؑ سے نکالا میں نے

تیر اک کھینچا تھا میں نے کہ مرا دل بسمل
اس سے واقف ہو کہ بیٹ جسم ہے میرا گھائل
تم اگر کھینچو گی ناوک تو یہ ہوگا حاصل
تیرے ساتھ ہی سینے سے نکل آئے گا دل

کچھ نہ وہ بات کہ جس کا کوئی امکان نہیں
کھینچنا سینکڑوں تیروں کا کچھ آسان نہیں

تم تو نادان ہو، دم بھر میں ہوں امام ابن امام
اب میں زندہ نہیں ہو سکتا ہوئی زیست تمام
رات اندھیری ہے بس اب خیمے میں جاؤ گلفام
جو مرا فرض تھا۔ انجام دیا میں نے وہ کام

یا علیؑ کہہ کے بعد آہ و فغاں کھینچی ہے
تیر کیا، سینۂ اکبرؑ سے سناں کھینچی ہے

اس مرثیے کے پیش لفظ میں پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن فاضل زیدی (مرحوم) ایک جگہ فرماتے ہیں کہ۔

"شہادت حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے بعد حضرت سکینہ کا باپ کے سینے سے لپٹنا اکثر مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہے اور اس دل دوز منظر سے اپنے مرثیے کے تاثر میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ بعد شہادت امام علیہ السلام کے سینۂ مبارک میں ہر طرف تیر پیوست تھے۔ اس لئے حضرت سکینہ کا باپ کے سینہ سے لپٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔ فیض صاحب نے حضرت سکینہ کی زبانی یہ کہلوا کر۔

رو کے یہ بولی کہ بیزار ہوں اب جینے سے
تیر پیوست ہیں کس طرح لگوں سینے سے

صحیح روایت کو نظم کیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ صحت نگاری کے باوجود تاثیر میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیض صاحب کتنی احتیاط سے مصائب رقم کرتے تھے۔

فیض صاحب خلوص و محبت کا پیکر تھے فکرو خیال کا سمندر تھے انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ محفل شعر و ادب کی جان تھے۔ خود دار تھے یا کہو لو تھے وہ اس طرح حیات کاٹنے والے تھے کہ دوسروں کا دکھ درد بانٹنے والے تھے۔ ان کی ایک ایک خوبی کو یاد کر کے دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور یقیناً وہ مداح اہلبیت جنت

میں آرام سے سو رہا ہے۔

لیکن کراچی کے مرثیہ نگاروں کا جب بھی تذکرہ ہوگا فیض صاحب مرحوم کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگا۔ وہ آسمانِ مرثیہ گوئی پر اک نیرِ تاباں کی مانند روشن رہیں گے اور یہ تابانی کبھی کم نہیں ہوگی۔

قطعۂ تاریخِ وفات (عیسوی)

ذاکرِ حسینؑ فیضؔ بھرتپوری

۱۹۸۹ء

ذکرِ اہلبیت میں گزری تمام
شاعرِ آلِ محمدؐ السلام
بابِ جنت پر لکھا رضوان نے
مرثیے میں فیضؔ کا اوّل مقام

۱۹۸۹ء

قطعۂ تاریخِ وفات (ہجری)

حق شناس فیضؔ (بھرتپوری)

۱۴۰۹ھ

کبھی خیال یہ آیا کہ ہیں سبطین کے پاس
کبھی یہ سوچا کہ ہیں خلد میں نفیس کے پاس
اسی خیال میں گم تھا کہ عرش سے آئی
یہی ملک کی صدا فیض ہیں انیس کے پاس

۱۴۰۹ھ

○

مشہود جعفری

○

دکھاتا ہے داغ آسماں کیسے کیسے

جناب فیض بھرتپوری گزشتہ دنوں ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ شاعرِ دربارِ محمدؐ و آلِ محمدؐ تھے ــــ میرے غریب خانے پر متعدد شعری محفلوں میں شریک ہوئے اور کئی محفلوں کی صدارت بھی فرمائی۔ مرحوم کے شعروں میں انسان کو انسانیت کا پیغام ملتا ہے۔ ان کا ایک شعر جو انہوں نے میرے غریب خانے پر حضرت امام حسنؑ کی طرحی محفل میں پڑھا تھا، یہ تھا۔

نہ ہو گر عشق آلِ مصطفےٰؐ کا ✤ نماز و روزہ و حج رائیگاں ہیں

اس میں بھی درسِ عمل ہے ــــ اگرچہ جناب فیض بھرتپوری آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن دل کہہ رہا ہے کہ وہ عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سفر اختیار کر گئے ہیں۔ پہلے وہ اپنے شعروں اور مرثیوں میں ساقیٔ کوثر کا ذکر کرتے تھے اور آج یقیناً وہ لبِ کوثر، ساقیٔ کوثر کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہوں گے۔

کیف کتنے آلِ احمدؐ آپ سے نسبت میں ہیں ✤ جنّت و کوثر کے ساغر آپ کی الفت میں ہیں
تھک گئے مشہود وہ سو گئے ہیں اب وہ چین سے ✤ سایۂ رحمت کے طالب سایۂ رحمت میں ہیں
آلِ احمدؐ کی محبّت کا ہی دم بھرتے تھے وہ ✤ عاشقِ آلِ محمدؐ آل کی قربت میں ہیں
گوشۂ دل سے صدا یہ آ رہی ہے بار بار ✤ قبر میں ہیں فیض کب؟ ہاں فیض تو جنّت میں ہیں

یوں تو مرثیہ گوئی کے حامل شعراء آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی ذکرِ شہدائے کربلا کے لئے نئے نئے مرثیہ گو جنم لیتے رہیں گے۔ لیکن فیض کی وفاتِ حسرت آیات سے میدانِ ادب میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے، اس کا پُر ہونا کارے دارد ہے ــــ خداوندِ کریم، مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے فرزندان اور دختران کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے ۔

کم نہ ہو گا کسی طرح یہ غم ✤ ان سے بچھڑے ہوا یہ ظرفہ ستم
دل سے مشہود آ رہی ہے صدا ✤ آہ بے فیض ہو گئے ہیں ہم

سبط جعفر زیدی

بیادِ فیضؔ

کسی شاعر کی مقبولیت اور عوام و خواص ہر دو سطح پر درجۂ کمال تک پہنچانے میں کم از کم مجالس و محافل کی حد تک کلام، ادائیگی اور تعلقات (پبلک ریلشنز) کا بڑا دخل ہوتا ہے اگر کسی شاعر میں مذکورہ تین میں سے دو صفات و خصوصیات بھی موجود ہوں تو مقبولیت اور مجلس و محفل کی حد تک کامیابی اسکا مقدر ہو جاتی ہے۔ فیض صاحب میں بیک وقت تینوں خوبیاں پائی جاتی تھیں۔

شاعر اپنے احساسات و جذبات کا عکاس اور گرد و پیش اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے جو کچھ اسپر گذرتی ہے یا اپنے گرد و پیش میں دیکھتا ہے اُسے شعری قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے اور درحقیقت وہی شاعری قبولیت عامّہ کی سند حاصل کرتی ہے جو حقائق اور روزمرّہ مشاہدات و تجربات اور فعال و اطلاقی زندگی سے قریب تر ہو یعنی آپ بیتی اور جگ بیتی کے برعکس پیش کی جانے والی شاعری محض لاھوت و ملکوت کی شاعری ہو گی اور مقبولیت عامّہ کی سند سے محروم رہیگی۔ چنانچہ فیض صاحب نے اگرچہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی اور حقیقت و مجاز ہر دو جگہ انھوں نے اشہبِ قلم کی جولانیاں

دکھائی ہیں۔ تاہم ایک متدین و معزز خاندان کے چشم چراغ ہوتے اور توارث کے علاوہ اپنے ماحول و تربیت اور اپنے فطری رجحان و طبعی میلان کے سبب بھی انہیں شاعرِ اہلبیتؑ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے کہ حبِ اہلبیتؑ ہی انکی طینت و خصلت تھی۔ انھوں نے حمد و نعت، مناقب و قصائد، رباعیات۔ قطعات، سلام، نوحہ جات سبھی کچھ تحریر کئے مگر انکی وجہ شہرت اور شناخت صرف اور صرف مرثیہ نگاری ہی ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ اچھا انسان (باعمل و باکردار اور ذی علم) ہی اچھا شاعر بن سکتا ہے۔

فیض صاحب نسلاً حضرت زید شہید کی اولاد میں سے تھے۔ پھر جائے ولادت بھرت پور کے حوالہ سے بھی مجاہدانہ و سپاہیانہ جاہ و جلال۔ جرأت اور حق گوئی و بیباکی بھی آپکا خاصا تھا۔ ذاتی اغراض و مصلحت کبھی اس حق گوئی و بیباکی کی راہ میں آڑے نہ آتی۔ اسی وجہ سے مزاج ناشناس قریبی احباب بھی بعض اوقات آپ سے خائف و نشاکی ہو جایا کرتے تھے تاہم آپ کے خلق و انکسار اور عاجزی و تواضع کی وجہ سے غلط فہمی دور ہو جانے پر جلد ہی راضی بھی ہو جایا کرتے تھے۔ حق گوئی و بیباکی کے اظہار میں بھی آپ وضعداری اور اخلاق رواداری کا دامن نہ چھوڑتے تھے اور شائستگی اور شنوں کی پاسداری ہمیشہ ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ آپ ایک متواضع اور خلیق و خوددار آدمی تھے۔ بڑے سے بڑے مصائب کو نہایت خندہ پیشانی اور خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے

ساحر لکھنوی صاحب سے پہلے فیض صاحب ہی دبستانِ نسیم کے نامور و نمائندہ شاعر تھے انکے استاد کو بھی بجا طور پر ان پر بڑا ناز اور مان تھا۔ آپ ہر اہل نظر سے مشورۂ سخن اور تبادلۂ خیال کر لیتے تھے بلکہ کمتر یا ہم پلہ معاصرین سے بھی مشورہ میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے اور دوسروں کی

مثبت و تعمیری تنقید کا بڑی فراخدلی و وسیع القلبی سے خیر مقدم کیا کرتے تھے اور اگر تنقید یا اصلاح معقول ہوتی تو بصد شکریہ قبول کر لیتے تھے اپنے استاد سے وہ اصلاح اور مشورہ تو ضرور لیتے تھے اور منائے بغیر حتی المقدور نیا کلام پیش کرنے سے گریز کرتے۔ یہاں تک کہ خود استاد کو کہنا پڑا کہ آپ اب اصلاح کی ضرورت اور مشورہ سے بے نیاز و بالاتر ہیں۔ پھر بھی مروت اور وضع داری کہیئے یا استاد کا احترام مگر آپ ہمیشہ انہیں کلام سنایا کرتے تھے لیکن آپ انکی تائید و توثیق کے سوا کچھ حاصل نہ کرتے اور اصلاح تو ضرور قبول کرتے مگر مصرعہ کبھی قبول نہ کیا۔ استاد کا دیا ہوا مصرعہ تک اپنے کلام سے پیوند نہ کرتے اور خود ہی مصرعہ کو اسوقت تک بدلتے رہتے تاوقتیکہ استاد صاد نہ فرما دیتے اکثر اپنا مصرعہ نہ قبول کرنے پر استاد ان سے شاکی بھی رہتے۔

اگرچہ قبلہ گاہی جہاں مگر آبادی کا مقام مرثیہ گوئی میں کچھ نہیں اور نہ ہی اس حیثیت سے وہ منظر عام پر آئے ہیں مگر پھر بھی فیض صاحب اکثر انہیں بھی اپنا کلام سنا کر مشورہ میں شامل کر لیا کرتے تھے جس سے خود انکی مثبت فکر اور اعلیٰ ظرفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کبھی چہرے یا شخصیت کی داد نہیں دیتے تھے۔ بیجا تو کیا عرف عام میں بجا قرار دی جانے والی خوشامد بھی کسی کی نہیں کرتے تھے۔ اچھا شعر خواہ کسی کا بھی ہو دل کھول کر تعریف کرتے تھے اور قدر شناسی اور تحسین و ستائش کے معاملہ میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے اور کسی امتیاز و وابستگی کی پرواہ کئے بغیر اسی طرح غلط شعر پر پوری محفل داد دے رہی ہو وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہتے اور اگر بے تکلف آدمی غلطی کرتا تو اسے چپکے سے احسن طریقہ پر غلطی سے آگاہ کر دیتے اور اگر وہ چاہتا تو مناسب اصلاح بھی فرما دیتے مگر خود سے کسی کی غلطی کی نشاندہی یا گرفت یا اسکا اعلان و اظہار نہ فرماتے بلکہ

تائید و رسمی تعریف کرتے بلکہ خاموشی اختیار کر لیتے یعنی انہیں خواہ مخواہ استاد
بننے یا استادی دکھانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ لیکن جب کوئی ان سے مشورہ
یا اصلاح چاہتا تو انتہائی دیانتداری و ایمانداری سے اسے بہترین مشورہ
دیتے اور اپنا محتاج و دست نگر بنا کر قابو میں رکھنے کی بجائے اسکی اصلاح
اس طرح کرتے کہ وہ جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر خود اعتماری
و خود انحصاری سے شاعری کر سکے۔ بات وہی تھی کہ انہیں استادی کا یا اپنے
گرد شاگرد جمع کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ نا اہل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے
تھے بلکہ سچ پوچھئے تو آپکا اختلاف اپنے استاد سے ہوا بھی تو بنائے
اختلاف استاد کی ذات و شخصیت نہ تھی۔ نہ ہی استاد کا استناد و اعتبار ہی
محل بحث تھا بلکہ استاد سے اختلاف کا سبب استاد کا بیجا التفات اور
غیر ضروری مروت و اخلاص تھا کہ جو وہ اپنی سادگی یا مصلحت کی بناء پر نااہل
و غیر مستحق لوگوں سے برتتے تھے وہ چاہتے تھے کہ بخشش و عنایت مسائل کے
ظرف و استعداد اور صلاحیت و اہلیت کے مطابق ہو اور نا اہل لوگوں کی کفالت
و سرپرستی کر کے باصلاحیت لوگوں کا استحقاق مجروح نہ کیا جائے اور بے ہنر
افراد کو ہنرمند افراد کے مدِ مقابل نہ لایا جائے جو شعر نہیں کہہ سکتا۔
اسے شعر کہہ کر نہ دیئے جائیں اور جو شعر کہہ سکتا ہے اسے بھی شعر کہہ کر دینے کی
بجائے خود اسمیں قابلیت و مہارت پیدا کی جائے اور کفالت کی بجائے اسکی معاونت
و تربیت کی جائے اور علمی قابلیت و فنی مشق و مہارت کا سامان کیا جائے جبکہ
استاد کا فیضان کرم عام تھا۔ ظاہر ہے کہ اس اصولی اختلاف کی بنا پر اسپتھ
اور بیگانے استاد اور انکے زیر کفالت افراد سب ہی خفا تھے۔ استاد کی اپنی
خفگی تو اتنی نہ تھی جتنی کہ لوگوں نے ہوا دی۔ بہر حال وقت نے ثابت کیا کہ
فیض صاحب کا اعتراض بجا تھا۔ فیض صاحب نے استاد سے استفادہ

کیا۔ اصلاح لی کلام نہ لیا چنانچہ انکا اپنا فطری رنگ اور شعری مزاج بھی۔ اور استاد کا فیضانِ تربیت اور انکے اثرات بھی موجود رہے جبکہ استاد کے سلسلے ہی جو سورج کی مانند تھے تمام ستارے اور کواکب بجوم بھی غروب ہوگئے یا کم از کم اپنی آب و تاب سے فرد محروم ہو گئے، جس جس نے استاد، ہاتھ کھینچے گئے وہ مجالس و محافل سے دور ہوتا گیا یا دوسرے سہارے ڈھونڈھ کر دوسرے درختوں پر جا بیٹھے جبکہ فیض صاحب اس سورج کی موجودگی اور عدم موجودگی، حضوری و غیبت ہر دور میں اپنی روشنی بکھیرتے رہے اگر استاد کلام کی بجائے قدرت کلام اپنے متوسلین تک منتقل کر دیتے تو آج بالخصوص مرثیہ کے افق سے جیتے جی اتنے سارے شعراء گوشہ نشین یا روپوش نہ ہوجاتے!!!

لے دے کر حضرت ساحر لکھنوی کی

وضعدار اور منفرد ہستی ہے کہ جس سے استاد کا نام اور کام باقی رہنے کی توقع ہے بلاشبہ وہ مضبوط و معتبر اور نامور نمائندہ ہیں دبستان نسیم کے انکے بعد اس دبستان کا کوئی مستقل بظاہر روشن اور واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ اللہ کرے کہ میرے خدشات غلط اور بے بنیاد ہوں اور محض میری کم نگاہی و قنوطیت ثابت ہوں۔ اگرچہ فیض صاحب کی طرح ساحر صاحب بھی اپنا جداگانہ تشخص اور شعری مزاج رکھتے ہیں تاہم یہ دونوں حضرات اس پر نازاں اور مفتخر ہیں کہ وہ دبستانِ نسیم سے متعلق ہیں اور اس وابستگی و تعلق کے اظہار میں نسیم صاحب کے فیضانِ صحبت اور کمال تربیت اور نسبت و تعلق کے ساتھ ان دونوں کی سعادت مندی کا بھی دخل ہے۔ ورنہ یہ حضرات پہلے سے پختہ گو شاعر ہیں اور اپنا الگ مزاج و مذاق شعری رکھتے ہیں تاہم انکے اس مذاق اور پختگی میں نسیم صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

فیض صاحب کے بے شمار اشعار اور متعدد مراثی پسندیدہ و مقبول خواص و

عوام ہیں لیکن ذاتی طور پر مجھے جس شہ پارہ نے بیحد متاثر کیا وہ انکا وہ معرکتہ الآرا مرثیہ تھا جو شہید لمحہ فکری (خیرپور) کیلئے کہا گیا تھا۔ علاوہ ازیں تبرک کے عنوان سے آپکا مرثیہ اپنے موضوع اور مقصد کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے۔ آخر عمر میں فیضی صاحب نے روایتی انداز شاعری سے صرف نظر کرتے ہوئے مخمس ہیئت ترکیب میں تو روایت کو برقرار رکھا تھا۔ مگر موضوع اور انداز و طرز استدلال کے اعتبار سے مرثیہ میں تنوع کو فروغ دیا اور مرثیہ گوئی کو محض اہلبیت کے فضائل و مصائب یا اظہار عقیدت تک محدود نہ رکھا بلکہ قوم و ملت کی اصلاح احوال کیلئے ایک ذریعہ و وسیلہ کے طور پر استعمال کیا یعنی قومی مسائل اور قومیات اور اقتضائے وقت کو مرثیہ میں جگہ دی اسطرح آپ نے مرثیہ کو ابلاغ و اظہار کیلئے استعمال کرتے ہوئے مجالس اور محافل کی سماجی و قومی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا اور ان اجتماعات اور اس طرز ذاکری کو اطلاقی و ابلاغی یعنی تعمیری اور بامقصد جہت میں ڈال دیا کہ جو درحقیقت عزاداری کے اغراض و مقاصد اور اصل ہدف سے قریب تر ہے کیونکہ مجالس و محافل بجائے خود مقصد یا منزل نہیں بلکہ حصول مقصد و منزل وہی کا ذریعہ اور مضبوط و مستحکم وسیلہ ہیں

فیضی صاحب کی شخصیت و خدمات اور فنی حیثیت و مقام پر گفتگو کے لئے بحمداللہ ابھی بہت سے اہل نظر اور واقف حال بزرگ موجود ہیں جو مرحوم کی محبتوں کا قرض چکانے میں مصروف بھی ہیں اور مجھ احقر و کمتر سے زیادہ اس کے اہل ہیں اور ذمہ دار بھی۔ ان میں بالخصوص اردو انگریزی کے ممتاز نقاد و دانشور اور انگریزی کے شاعر پروفیسر غلام عباس بھی شامل ہیں جو مرحوم کے شخصی و فنی استناد و اعتبار پر نقد و

نظر کے مستحق و اہل ہیں تاہم مجھے اس بات پر اطمینان ہے کہ میں نے پیشہ ور تعزیت گذاروں اور عادی تبصرہ نگاروں کی طرح کوئی رسمی مضمون لکھ کر محض چند مخصوص جملوں اور نام کی تبدیلی کے بجائے اپنا فوکس صرف اور صرف فیض صاحب کی ذات پر مرکوز رکھا ہے اور اس مضمون کا ہر پیراگراف اور ہر جملہ اگرچہ سرِ راہ بعجلت تمام سپردِ قلم کیا گیا ہے مگر صرف مرحوم کیلئے انکی نسبت اور انکے حوالے سے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے۔ اس مرحلے پر طوالت سے بچنے کیلئے میں مرحوم کے بارے میں چند ذاتی مشاہدات و تجربات اور تاثرات کے بیان پر اکتفا کروں گا یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی غیر اہم اور معمولی باتیں ہیں مگر درحقیقت یہی چھوٹی۔ غیر اہم اور معمولی باتیں کسی بھی عام آدمی کو بڑا اہم اور غیر معمولی بنا دیتی ہیں اور ان سے صرفِ نظر بعض اوقات بڑے بڑے قدر آور انسانوں کو بھی بے قدر و قیمت بنا دیتا ہے۔ مثلاً فیض صاحب کو جب بھی کسی مجلس محفل میں مدعو کیا جاتا بشرطِ صحت و فرصت آپ اُسے بسر و چشم قبول فرما لیتے۔ آپ کبھی دعوت دینے والے کی حیثیت و شخصیت پر توجہ نہ دیتے پھر پہلے وعدہ کے بعد اگر بڑی سے بڑی اور بہتر پیشکش بھی موصول ہوتی تو اُسے قبول نہ کرتے۔ ایک بار وعدہ کے بعد کبھی اُسے منسوخ تبدیل یا وعدہ خلافی نہ کرتے اور اگر کبھی ایسا ناگزیر ہو جاتا تو قبل از وقت صاحبِ معاملہ کو فوراً جاکر اپنی مجبوری و معذوری سے آگاہ کرتے اور اس معذرت و رخصت کے وقت بھی اگر صاحبِ معاملہ خواہش کرتا تو متبادل انتظام کرکے دیتے۔ وعدہ کے بعد صاحب معاملہ سے کسی قسم کی توقع نہ کرتے۔ لانے لیجانے کی بابت نہ پوچھتے بلکہ از خود اپنے کرائے اور ذرائع سے پہنچنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ تمام تر مصروفیت و علالت کے باوجود میں

نے انہیں دور دراز کے علاقوں اور مضافات میں پہنچتے اور پڑھتے دیکھا سُنا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجلس وقت مقررہ پر شروع نہیں ہو سکتی ہمیشہ دیئے ہوئے وقت پر پہنچتے اور تاخیر کا شکوہ بانیٔ مجلس سے نہ کرتے۔ محافل میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہ کرتے اور اس قسم کی دانستہ یا نادانستہ غلطیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتے منہ دیکھے یا چہرے کی داد نہ دیتے اچھے شعر کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیتے ہر قسم کے تعصب و امتیاز اور گروہ بندی سے بالاتر ہو کر داد دیتے اسطرح غلط شعر خواہ کسی کا ہوتا خاموش بیٹھے رہتے اپنوں کی غلطی کی نشاندہی خاموشی و راز داری سے اچھے طریقے پر کر دیتے۔ دوسروں کو ٹوک کر یا غیر ضروری تنقید کر کے اپنی علمیت و قابلیت کا رعب ڈالنے کی کوشش نہ کرتے نہ ہی شاگرد بنانے یا استاد کہلوانے کا انہیں کوئی شوق نہ تھا۔

اگرچہ آپکو اپنے مقام و منصب کا علم و احساس تھا مگر کمتر درجہ پر بھی پڑھ لیتے۔ محفل کا مزاج اور رنگ سمجھتے اور برتتے تھے۔ محفل میں آخر تک بیٹھے رہتے درمیان سے اٹھ کر نہ جاتے مجھے یاد ہے کہ ۲۹ صفر المظفر ۱۴۰۵ھ کو ضیا لکھنوی صاحب کی قیام گاہ عزا خانہ رضویہ مسلم ٹاؤن پر منعقد ہونے والی سالانہ محفل مسالمہ میں آپ نے حضرت عروج بجنوری کی زیر صدارت کلام پڑھا ویسے یہ بے نیازی اور وسیع النظری حامل اہلبیتؑ حضرت ثمر ہوشنگ آبادی مرحوم کے علاوہ اللہ رکھے حضرت شفق اکبر آبادی حضرت زاہد فتحپوری حضرت معجز جوپوری اور قبلہ گاہی ذاہد بجانگیر آبادی میں بھی پائی جاتی ہے اور بعض دیگر شعراء بھی اس قسم کی کوتاہیاں اور زیادتیاں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مرثیہ کی روایت بلکہ آداب میں شامل ہے کہ ہر مرثیہ گو شاعر اپنی مجلس میں اپنے لوگوں کو گھیر کر لیجاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ نیا مرثیہ پیش کر رہا ہو تو براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کو ضرور مدعو کرتا ہے بلکہ احباب و تلامذہ کی پوری ٹیم اس خدمت دعوت پر مامور و متعین ہوتی ہے تاہم فیضؔ صاحب نے اس روایت و ضرورت پر کبھی توجہ نہ دی شاید ہی دو چار مرثیہ گو شعرا (صف اول و دوم کے بھی) ایسے ہونگے جو اس قسم کا بیتکی التزام و اہتمام اور انتظام نہ کر رکھتے ہوں۔

بلا حیل و حجت (بشرط صحت و فرصت) وعدہ کر لینا قبل از وقت از خود پہنچنا پھر مجلس میں تاخیر پر بانیٔ مجلس سے کوئی شکوہ نہ کرنا جمع کی کمی یا نا فہمی کا گلا نہ کرنا تقدیم و تاخیر کو نظر انداز کر دینا ہر چھوٹے بڑے شاعر کی مجلس و محفل میں شرکت و سماعت اور خاطر خواہ حوصلہ افزائی کرنا کبھی کسی قسم کا مطالبہ و تقاضہ نہ کرنا اور بغیر دعوت کے محض سننے کیلئے بھی مجالس محافل میں شرکت کرنا فیضؔ صاحب کی ایسی نمایاں خوبیاں تھیں جو کسی ایک شخص میں اس درجۂ کمال پر یکجا نہیں دیکھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے علاوہ حضرت ساحرؔ لکھنوی حضرت شادانؔ دہلوی اور پروفیسر سردار نقوی اور بعض دیگر حضرات میں بھی یہ صفات پائی جاتی ہیں اور ہم لوگوں کیلئے قابلِ تقلید ہیں۔

مندرجہ بالا صفات اور خصوصاً مجلس محفل میں بروقت بلکہ قبل از وقت پہنچنے کی بابت فیضؔ فرمایا کرتے تھے کہ اسمیں میری اہلیہ کا بہت بڑا دخل ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ اہلیہ کے انتقال کے بعد فیضؔ صاحب کے معمولات اور عادات بھی متاثر ہوئے

بغیر نہ رہ سکے۔ فیض صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی محفل مجلس سے واپس آتا ہوں تو محترمہ محفل مجلس کی روداد پوچھتی ہیں۔ مناسب حوصلہ افزائی کرتی ہیں پھر آئندہ کے پروگرام معلوم کرتی ہیں۔ اس کے مطابق دعوت نامے ترتیب سے لگا دیتی ہیں اور اسی مناسبت سے کپڑے وغیرہ تیار کر رکھتی ہیں پہلے سے یاد دہانی کراتی ہیں بعض اوقات کلام کے انتخاب میں بھی مشورہ دیتی ہیں پھر تقریب میں جانے سے پہلے کھانا چائے اور تیاری و روانگی تک سارے کام ذمہ داری سے انجام دیتی ہیں اور ہمیشہ بصد اصرار مجھے گھر سے اس طرح رخصت کر دیتی ہیں کہ میں بروقت بلکہ قبل از وقت مجلس محفل میں پہنچ جاؤں اور یہی کہتی ہیں کہ مجلس محفل میں ذاکر کو قبل از وقت ہی پہنچنا چاہیئے اس سے بانی کا دل بڑھ جاتا ہے اور تاخیر سے بانئ مجلس کی پریشانی اور فکر میں اضافہ ہوتا ہے۔

بہرحال آخر میں آپ حضرات سے ملتمس ہوں کہ ممدوح محترم فیض صاحب اور انکی اہلیہ کے علاوہ جملہ مومنین و مومنات کیلئے ایک سورۂ فاتحہ پڑھ دیں کہ اپنے گزشتگان کی خدمت میں اس سے بہتر ہدیۂ و تحفہ شاید ہم نہ پیش نہ کر سکیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

از ریحانہ اعظمی

"بیٹھوں تو نیند آئے لیٹوں تو نیند غائب"

نیند بھی کیا چیز ہے اگر آنا چاہے تو پھر دار بھی آجاتی ہے کانٹوں پر بھی آجاتی ہے اور اگر نہ آنا چاہے تو نرم گرم بستر لق آراستہ خوابگاہ اور سبزہ زاروں میں بھی نہیں آتی نیند کے بارے میں یہ خیال میرے ذہن میں اس دن پیدا ہوا جب میں اور برادرم سرفراز ابد محترم کوثر نوری صاحب کے پاس اسی زیر نظر مجلے کے لئے ان کے تاثرات لینے گئے دوران گفتگو نوری صاحب نے یہ مصرعہ سنایا۔

"بیٹھوں تو نیند آئے لیٹوں تو نیند غائب"

لیکن فیض بھرتپوری کو بیٹھے ہوئے کبھی نیند نہیں آئی وہ جب بیٹھے ہوتے تھے تو محفل میں رونق نظر آتی تھی وہ جب بیٹھے ہوئے ہوتے تھے تو ان کا قلم اور ان کی فکر دونوں ان کے ساتھ بیدار رہتے تھے۔ نیند کو اپنے قریب فیض صاحب نے بیٹھے ہوئے کبھی بھٹکنے نہ دیا تھا لیکن ایک روز جو بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی تو شاید نوری صاحب کا یہ مصرعہ ان کے ذہن میں بھی ابھرا ہو کہ لیٹنے سے نیند غائب ہو جاتی ہے تو بیٹھ کر بستر پر کمر لگائی اور نیند ایسی آئی کہ فیض صاحب کے مداحوں، رفقا اور لواحقین کو سوگوار کر گئی۔ بہر حال موت برحق ہے اور تمام لوگوں کو یہ ذائقہ چکھنا ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے لوگ دو چار دن یاد کرتے ہیں پھر وہ شخص اور اس کا نام قصہ پارینہ ہو جاتا ہے لیکن کچھ لوگ جاتے جاتے میں ایسا کر جاتے ہیں کہ ان کے سو جانے کے بعد بھی ان کی یاد صدیوں تک نہیں بھلائی جا سکتی ایسے ہی لوگوں میں فیض بھرتپوری صاحب کا شمار بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی صرف ان کو نیند آئی ہے ان کا کلام تو پوری طرح سے بیدار ہے جو کہ ان کو صدیوں فراموش نہ ہونے دے گا۔

محمد رضی راہی
ایم اے (اردو)، ایم اے (لسانیات)
ریسرچ اسکالر، جامعہ کراچی
لیکچرر، شعبۂ اردو، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی

فیض بھرتپوری

جناب فیض بھرت پوری ایک کہنہ مشق شاعر، خلیق اور باوقار انسان تھے۔ ان کی شخصیت پرانی تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا اور بات چیت کرنا اب تک نگاہوں میں سمایا ہوا ہے۔ ان کی شخصیت ادب اور اخلاق کے توازن سے آراستہ تھی۔ وہ ہمیشہ انکساری سے ملتے تھے اور نہایت وضعدار تھے۔ ان کی رحلت سے واقعی ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے جس کا اہلِ علم کو بطورِ خاص احساس ہے۔

فیض بھرت پوری ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی سید ہدایت علی رضوی اکبر آبادی کی بڑی صاحبزادی سے ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں بھرت پور ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ سید فرزندِ حسن فیض بھرت پوری کے والد سید اکرام حسین، عمدہ شاعر تھے اور کلیم تخلص ،

کرتے تھے۔ فیض صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ غزل گوئی میں انہوں نے شاد بھرتپوری اور عروج بھرتپوری سے اصلاح لی۔ ایک عرصہ ہوا، انہوں نے غزل گوئی ترک کرکے مذہبی شاعری پر خصوصی توجہ دی۔ نعت و منقبت اور سلام کثیر تعداد میں کہے۔ کراچی میں جب باقاعدہ اردو مرثیہ نگاری کی ترویج ہوئی، اس وقت سے مرثیے کہنے لگے اور ہر سال اپنا نوتصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔ مجموعی طور پر فیض (مرحوم) مرثیہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انہیں فن شاعری سے گہری دل چسپی تھی۔ اس لئے ان کے کلام میں استادانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری میں بجا طور پر یہ اوصاف پائے جاتے ہیں ؎

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

گویا ان کی مرثیہ نگاری مختلف پہلوؤں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ فنی اعتبار سے ان کے مرثیوں میں تمام روایتی محاسن پائے جاتے ہیں۔ ہم ان کے مرثیوں کو پڑھ کر ان کے انداز بیان کی عظمت اور تاثر کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایک مرثیے کی ابتدا انہوں نے اس طرح کی ہے ؎

میں مدح خوانِ سرورِ عالی مقام ہوں ٭ گویا شریک کارِ خدا کا کلام ہوں
شہرت کی ہے نہ چاہ نہ جویائے نام ہوں ٭ کیا کم شرف ہے یہ کہ علیؑ کا غلام ہوں
کہتا ہوں مرثیہ شہؑ روشن ضمیر کا
فیضان ہے یہ فیض جناب امیرؑ کا

شغلِ محمدؐ کے لطف و کرم سب پہ عام ہیں ٭ دستِ خدا ہیں بازوئے خیر الانام ہیں
وجہِ محمدؐ کی حیاتِ دوام ہیں ٭ حق کے ولی ہیں، خویشِ نبیؐ ہیں امام ہیں
اوروں کو جز خدا و نبی مانتے نہیں
کردوں حشم بھی ہوں تو یہ گردانتے نہیں

مسلمانانِ آلِ اطہار کو جس عظمت پر فائز سمجھتے ہیں، اس کا تذکرہ جا بجا کرتے ہیں۔ فرزندِ رسول الثقلین حضرت امام حسینؑ کی بے بہا قربانی کا تذکرہ بلا تفریق ہر جگہ کیا جاتا ہے۔ ذکرِ شہادت اور مجالس کا انعقاد ہماری روح کو پاکیزہ بناتا ہے۔

شہیدانِ کربلا کی جرأت و ہمت سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ہم حقانیت کے لیئے اپنی جان کی بازی لگا دیں لیکن باطل کے سامنے سر نہ جھکائیں۔ احکام خداوندی اور سنتِ رسول کریمؐ کی ترویج اور اشاعت کے لیئے امام عالی مقامؑ نے یزیدیت کا مقابلہ کیا۔ مجالس میں ان خدا والوں ہی کا تذکرہ ہوتا ہے جیسے جناب فیض بھرت پوری نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ظلم کے ساتھ جو دَور بنی عباس آیا + آلِ احمد پہ ستم ظالموں نے یہ ڈھایا
خون کا گارا کیا قصر میں بھی چنوایا + نذرِ آتش بھی کیا، قتل کیا، تڑپایا
ظلم پر ان کے خلاف مائل مشاقی ہیں
اس کے باوصف یہ سادات ابھی باقی ہیں
انقلاباتِ زمانہ کا نہیں ان پہ اثر + کبھی آسائشِ دنیا پہ نہیں رکھتے نظر
ہاں، عزائے شہِ مظلومؑ پہ بندش کی اگر + مال کیا چیز ہے اس راہ میں دیدینگے یہ سر
یہ قیاسات کے قائل، نہ کسی شک کے ہیں
سب ہیں واقف یہ عقیدے کے بڑے پکے ہیں
لاکھ دھوکے دو کبھی ہوتے نہیں ٹس سے مس + زر کے لالچ سے بھی چل سکتا نہیں ان پر بس
سرِ رہِ حق میں یہ دیتے ہیں بے پیش و پس + یہ علیؑ والے ہیں ان کو نہ سمجھنا بے کس
قوم یہ، دین کی تبلیغ میں کد کرتی ہے
یہ وہ ہیں جن کی مشیت بھی مدد کرتی ہے

فیض بھرت پوری (مرحوم) کے مرثیے تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں اور ادبی اعتبار سے بھی انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ انہوں نے مرثیہ نگاری میں کردار نگاری اور سیرت نگاری کا از حد خیال رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں روحانی اور اخلاقی قدریں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، گویا سرورِ کونینؐ اور ان کی آلِ اطہار کے مقدس تذکروں سے انہوں نے اپنے کلام کو زینت دی ہے۔

فیض بھرت پوری (مرحوم) اگرچہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں لیکن ان کا بامقصد کلام ہمارے سامنے ہے۔ ان کے افکار ہمیشہ اہلِ دل کو ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ وہ ایک پاکیزہ کردار بلند پایہ شاعر تھے۔ خداوندِ تعالیٰ انہیں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

ڈاکٹر سید نثیر حسین
میڈیکل آفیسر اینڈ سرجن
حسن ریلوے ہاسپٹل، کراچی کینٹ

فیض بھرتپوری
جدید مرثیہ گو شاعر

○

حضرت سید فرزند حسن فیض بھرتپوری شاعر اہل بیت تھے۔
موجودہ مشینی دور میں جب کہ انسان مادی تقاضوں کی دوڑ میں اپنی اقدار فراموش کر بیٹھا ہے اور زندگی کا اوڑھنا بچھونا حتیٰ کہ اپنا نصب العین بھی مادی آسائشوں کو بنا بیٹھا ہے ــــــ فیض بھرتپوری جیسے شعراء کا دم غنیمت ہے کہ وہ زندگی کے بنیادی حقائق، سچے جذبوں اور اعلیٰ و مثالی کرداروں کے ذریعۂ علمبردارِ انسانیت کا ورثہ خوشبوئے سخن کے ذریعۂ عام انسانوں تک پہنچاتے رہتے ہیں اور آلِ رسول ؐ کے ناموں کو کردار کا استعارہ بنا کر انسانیت کی رگوں میں نیا خون دوڑاتے رہتے ہیں۔

حضرت فیض بھرتپوری سے میری براہ راست کوئی نیاز مندی نہیں تھی مگر انہیں سننے کا مجھے اتفاق ضرور ہوا ہے۔ وہ جدید مرثیہ گو شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایک سامع اور ناظر کی حیثیت سے میں نے محسوس کیا ہے کہ فیض بھرتپوری کا زبانی کلام صرف ان کی شاعرانہ فنکاری کا ترجمان ہی نہیں ہے بلکہ وہ مرثیے کے مناظر میں جیسے خود کو شامل کر لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا مرثیہ سنتے وقت ایسا لگتا تھا جیسے ہم بھی مرثیہ کے مناظر میں شامل ہو گئے ہوں اور میدانِ کربلا سے زندانِ شام تک ہم نے بھی روحانی، جذباتی اور نفسیاتی سفر کیا ہو ــــ

حضرت فیض بھرتپوری! اے میرے دور کے مرثیہ گو! تمہاری رحلت ایک قدرتی اور فطری واقعہ ہے کہ مرجانا تو اولادِ آدم کا ورثہ ہے ــــ لیکن مر کر بھی جیتے رہنا تمہارا روحانی ورثہ ہے۔ تم مر کر بھی زندہ ہو! تمہارے مرثیے تمہیں زندہ رکھیں گے۔ تمہارا فیض جاری رہے گا!

آہ فیض بھرتپوری ...

سید محمد تقی زیدی رہبر

محترم جناب فیض بھرتپوری بیک وقت میرے بزرگ میرے عزیز اور باوجود تفاوت عمری کے میرے دوست بھی تھے۔ مرحوم ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اس کو گلزار بنا دیتے تھے۔ مرحوم کو میں گذشتہ تقریباً ۲۵ سال سے جانتا تھا لیکن اس ۲۵ سال کے عرصہ میں میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی میں نے کبھی ان کو فکرِ دنیا سے پریشان ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تفکراتِ دنیا کو کبھی اپنے نزدیک نہ آنے دیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی اس آخری بیماری سے پہلے تک وہ قابلِ رشک صحت کے مالک تھے ——— اور باوجود اس کے کہ ماشاءاللہ ان کے چاروں بیٹے صاحبِ روزگار ہیں، انہوں نے آخری عمر تک کسبِ معاش کو ترک نہیں کیا۔

بحیثیت شاعر بھی فیض صاحب ایک قدآور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کو تمام اصنافِ سخن پر کماحقہٗ دسترس حاصل تھی لیکن بتقاضائے طبیعت انہوں نے آخری زمانے میں مرثیہ گوئی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ ——— کیونکہ وہ مرثیہ گوئی کو بجا طور پر اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایک

مرثیہ کی بیت میں کہتے ہیں کہ ؎

ایک بھی بیت جو مقبول آئمہ ہوگی ؛ حشر کے دن وہی بخشش کا تتمہ ہوگی

جناب فیض نے ایک صلح کل اور منکسر طبیعت پائی تھی۔
طبیعت کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک کہنہ مشق مرثیہ گو شاعر تھے بلکہ ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاسکتا ہے، جب کبھی میں کراچی جاتا تھا، وہ اپنا زیر تصنیف مرثیہ مجھ کو ضرور سناتے تھے اور یہ کہہ کر سناتے تھے کہ مرثیے کو ایک ناقد کی حیثیت سے سنو ——— میں جواب دیتا تھا کہ بذات خود صاحب کمال ہیں، میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں ——— لیکن وہ یہی کہتے تھے کہ مفید مشورہ تو کوئی بھی دے سکتا ہے۔ بہرحال یہ ان کی کسرِ نفسی تھی۔

کراچی میں کیونکہ مراثی کی مجالس ہوتی رہتی تھیں اور بہت سارے مرثیہ گو شعراء تھے۔ ایسے ماحول میں معاصرانہ چشمک کا ہونا بھی ایک لازمی امر ہے لیکن فیض صاحب نے اس قسم کی چشمک سے ہمیشہ اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ ایک مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

پھول چنتا ہی چلا جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ الجھا ہوں نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

جو علیؑ کے ہیں تعلّی کا نہیں ان کو شعور

فیض صاحب کی شخصیت اور فن پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن تنگئ وقت کا خیال رکھتے ہوئے میں اپنے تاثرات کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اللہ تعالیٰ، مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے، آمین۔

غـلام عباس بٹ صاحب

"جناب فیض بھرت پوری بحیثیت مرثیہ گو"

موجودہ دور میں برصغیر پاک وہند میں جن شعراء نے فن مرثیہ گوئی میں قابل ذکر اضافے کیے ہیں اُن میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری، سید آل رضا، قیصر بارہوی، نسیم امروہوی، علامہ نجم آفندی، یاور عباس اور صبا اکبر آبادی بے حد مقبول اور مشہور ہوئے ہیں۔ اُن کے علاوہ مسعود رضا خاکی، نفیس فتحپوری اور فیض بھرت پوری نے بھی فن مرثیہ گوئی میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اگرچہ فیض بھرت پوری مرحوم نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد انھوں نے خود کو مذہبی شاعری کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے نعت اور منقبت کے علاوہ بے شمار سلام بھی کہے لیکن مرثیہ گوئی سے انہیں دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے زیادہ شغف رہا۔

مرثیہ گوئی قصیدے کی طرح ایک مشکل صنف ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے رثائی ادب میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے بے پناہ وسعتیں عطا کیں، توحید۔ نبوت، رسالت اور اخلاقیات سے متعلق وہ کون سے موضوعات ہیں جن پر ہمارے مرثیہ گو شعراء نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ فیض بھرت پوری مرحوم نے مرثیے کی روایت کو بخوبی سمجھا اور اُسے فنی مہارت سے برتا۔ انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ مرثیے کے لوازمات بھرپور انداز میں پیش کیے جائیں۔ گویا انکی مرثیہ نگاری میر انیس اور مرزا دبیر کے اتباع سے مزین ہے۔ ان کی مرثیہ گوئی کا مقصد شہیدان کربلا کی عظمت بے پایاں سے درس لیتے ہوئے زندگی کو خوب سے خوب تر بنانا رہا۔ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حقانیت اور حریّت کے عظیم علمبردار کی حیثیت سے

اسلام کی روشن اقدار کے تحفظ کے لئے بے مثال قربانیاں دیں۔ ایسی قربانیاں جن سے یزیدیت کی باطل سامانیاں فنا ہو گئیں اور انھوں نے زیر خنجر حق کی خاطر جان دے کر زندہ جاوید رہنے کا عظیم سبق دیا۔ واقعات کربلا کو فیض بھرت پوری نے اپنے مرثیوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ شکستہ دلوں کو ایمان افروز حوصلہ ملتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فرزند رسولؐ کا نام لینے والے ہمیشہ مصروف عزا رہتے ہوئے حقانیت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہتے ہیں اور مختلف قسم کی صعوبتوں کے باوجود پیغام حسینؑ کو عام کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

انقلابات زمانہ کا نہیں ان پہ اثر — کبھی آسائش دنیا پہ نہیں رکھتے نظر
ہاں عزائے شہ مظلوم پہ بندش کی اگر — حال کیا چیز ہے اس راہ میں دے دینگے یہ سر
یہ قیاسات کے قائل۔ نہ کسی شک کے ہیں
سب ہیں واقف۔ یہ عقیدے کے بڑے پکے ہیں

لاکھ دھوکے دو۔ کبھی ہوتے نہیں ٹس سے مس — زر کے لالچ سے بھی چل سکتا نہیں ان پہ بس
سر رہِ حق میں یہ دیدیتے ہیں بے پیش و پس — یہ علیؑ والے ہیں۔ ان کو نہ سمجھنا بیکس
قوم یہ۔ دین کی تبلیغ میں کہ کرتی ہے
یہ وہ ہیں جنکی مشیت بھی مدد کرتی ہے

ہیں حقیقت میں یہ سرمایۂ دین اسلام — گامزن جادۂ حق پر ہیں۔ عقیدہ نہیں خام
محو ہیں تذکرۂ سبط پیمبرؐ میں مدام — ایسی عزت نہ میسر ہو۔ تو جینا ہے حرام
الفت شہ میں غم انگیز ہیں سب باتیں ان کی
گریہ و زاری میں کٹ جاتی ہیں راتیں ان کی

کربلا حقانیت اور صداقت کا استعارہ ہے کربلا شناسی ہمیں حقائق و معارف سے ہمکنار کرتی ہے۔ کربلا کے ریگزار کا ہر ذرہ آج بھی آفتاب ہدایت بن کر درخشاں ہے اور انسانیت کو اعلیٰ اقدار کا پیغام دے رہا ہے۔ فیض بھرت پوری مرحوم نے

کربلا سے متعلق بجا طور پر کہا ہے ؎

دل سے نقوشِ جہل مٹاتی ہے کربلا — انسان کے حقوق بتاتی ہے کربلا
ملت کا امتیاز بھلاتی ہے کربلا — خلدِ بریں کی راہ دکھاتی ہے کربلا
ذروں کے دل پہ عشقِ الٰہی کے داغ ہیں
روشن بروئے خاک بہتّر چراغ ہیں

ثابت قدم رہو یہ سناتی ہے کربلا — حریتِ خیال سکھاتی ہے کربلا
باطل کو حق کی راہ، دکھاتی ہے کربلا — قدروں کا امتیاز، مٹاتی ہے کربلا
جو پیکرِ بلا تھی، وہ اب جانِ صبر ہے۔
اس سرزمیں پہ کعبہ ایماں کی قبر ہے

زندگی مسلسل جد و جہد اور سعیٔ پیہم کا نام ہے وہ افراد جو محنت سے گریزاں رہتے ہیں اور غفلت شعاری کو اپناتے ہیں کبھی ترقی نہیں کر پاتے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کارگہ ہستی کو میدان عمل تصور کرے اور اپنے ارتقا میں منہمک رہے۔

فیض بھرت پوری نے ایک عمدہ مرثیہ نگار کی حیثیت سے زندگی کے موضوع پر اپنے مرثیوں میں مختلف جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک مرثیے میں انہوں نے زندگی کی حقیقت کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

یہ زندگی میں تنازع جو ہے بقا کے لئے — دماغ لڑتے ہیں تکمیل مدعا کے لئے
نہیں یہ جنگ کسی حال میں فنا کے لئے — حیاتِ نو کی تمنا ہے ارتقا کے لئے
یہ اک امنگ بھی جز ضمیرِ انساں ہے
کہ ہر بشر سبقت کا عمل میں خواہاں ہے

مسابقت سے ترقی کا ذوق عام ہوا — یہ ذوق وہ ہے بشر جس سے نیک نام ہوا
مقابلے میں کسی کام کے جو کام ہوا — تو دونوں کاموں میں اک خاص اہتمام ہوا
یہ اہتمام ہی وہ ارتقا کا زینہ ہے
جو زندگی میں حصول بقا کا زینہ ہے

نہیں ہے حد تقابل کسی کا کوئی اگر | تو جیسے چاہے کئے جائے اپنا کام بشر
مگر جہاں ہو تقابل میان اہل ہنر | تو دونوں ڈالتے ہیں اپنی خامیوں پہ نظر

یہ چاہتا ہے مرا کام اس سے بڑھ جائے
وہ سوچتا ہے مرا فن نظر پہ چڑھ جائے

فیض صاحب کے مرثیوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کربلا کے حوالے سے حیات انسانی کا عمیق مطالعہ کیا اور حقائق کو مرثیے کے پیکر میں ڈھال کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے کلام میں روحانیت اور مادیت دونوں پہلوؤں پر عمدہ مضامین ملتے ہیں۔ بحیثیت مرثیہ گو انھوں نے کردار نگاری اور سیرت نگاری پر خصوصی توجہ دی جس کے سبب ان کا کلام انسانیت کے حوالے سے افادیت سے بھرپور ہے جہانتک زبان وبیان کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انہیں شعر وادب پر عبور تھا۔ فنی محاسن پہ انکی مکمل گرفت تھی لہٰذا ان کا کلام فکر اور فن کے اعتبار سے معتبر اور مستند ہے

فیض بھرت پوری مرحوم جتنے بڑے شاعر تھے اس سے زیادہ بڑے انسان تھے پُرانی اقدار جلوہ گر تھیں ان کا مسلک محبت تھا وہ کسی کی دل آزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بلند شاعر ہوتے ہوئے وہ اپنے چھوٹوں سے انکساری سے ملتے تھے جس کے سبب ہر دلعزیز رہے انکی شفقتیں اور وضعداریاں ہمیشہ یاد آئیں گی۔ ایک اور خوبی جو ان میں پائی جاتی تھی وہ یہ ہے کہ ۸۰ سال کی عمر میں بھی وہ نوجوانوں میں جوانوں کی طرح رہتے تھے۔ اور انکی یہی کوشش ہوتی تھی کہ نئی نسل علم وفضل میں آگے بڑھے۔

دنیا فانی ہے آمد ورفت کا سلسلہ جاری وساری ہے مگر فیض صاحب جیسے شخص کی رحلت خصوصی طور پر ہزاروں دلوں کو متاسف اور متاثر کئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے کردار کی خوبیوں اور علمی بلندی کے سبب ایک مقام پیدا کر گئے۔ خداوند تعالیٰ انہیں بلند درجات عطا فرمائے (آمین) اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

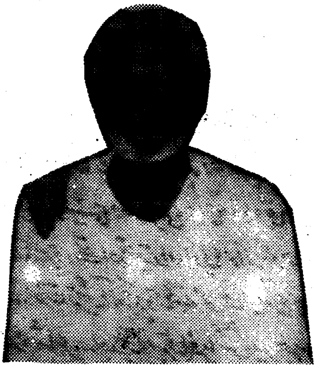

منظومات

نذرانۂ عقیدت

حضرت فیضی بجر تنوری کی یادگاری مجلہ کیلئے جن شعراء حضرات نے اپنی منظومات ہمیں بر وقت ارسال فرمائیں، ہم شکریے کے ساتھ ان منظومات کو اس باب میں شاملِ اشاعت کر رہے ہیں ـــــ ان نظموں میں حضرت فیضی بجر تنوری اعلی اللہ مقامہ کی شخصیت اور فن کے حوالوں سے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے، چند حضرات نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور چند صاحبان نے تاریخِ وفات کہی ہے۔۔

(ادارہ)

مقابلے میں صف آرا ہوئے جو اہلِ زمن
سبھی کے سینوں میں تیکھی کٹار کی تھی لگن
اب اس میں جو سبقت لے گئے تھے منارِ فن
بسا کے فن کی وہ بستی بسا چکے مدفن

وہ مر گئے مگر اب ان کا کام زندہ ہے
یہ کام کی برکت ہے نام زندہ ہے

فیضی بجر تنوری

نذرانۂ عقیدت

شاعرِ ملت و قومی نغمہ نگار

حضرت بشیر فاروق

کے تاثرات

○

فیض بھرتپوری سے میری ملاقات تین چار سال قبل کراچی میں حضرت رئیس امروہوی کے دفتر میں ہوئی تھی... میں جس وقت وہاں پہنچا تھا تو وہاں حضرت رئیس امروہوی، امیر حسنین جلیسی، منظر علی خان، طارق عباس آذر، مبارک مونگیری، اور فیض بھرتپوری جیسے صاحبان موجود تھے اور تنقید اور ادبی محاکمہ کے حوالوں سے شعر و ادب پر زور و شور سے گفتگو جاری تھی... حضرت رئیس امروہوی نے مجھ سے فیض بھرتپوری کا تعارف کرایا تھا۔ متبسم چہرہ اور مرثیہ کا عمدہ شاعر... بعد میں میری فرمائش پر ہم سب نے فیض بھرتپوری صاحب سے ان کے مرثیوں سے کئی بند سنے۔ ان کے چند قطعات بھی سننے کو ملے۔ پھر فیض صاحب ہی گفتگو کا موضوع بن گئے اور اچھی خاصی گفتگو رہی۔ حضرت رئیس امروہوی کی یہ بات مجھے یاد ہے کہ فیض صاحب کا مرثیہ اس لئے کامیاب ہے کہ وہ مرثیہ کے کرداروں اور واقعات کو نفسیاتی نکتۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مرثیہ کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہیں — امیر حسنین جلیسی کا تاثر تھا کہ فیض صاحب مبالغہ کے بجائے تاریخی حقائق سے کام لیتے ہیں — اور طارق عباس آذر نے تجزیہ کیا تھا کہ فیض بھرتپوری کا مرثیہ مقصدی بھی ہے وہ کرداروں اور واقعات کو بیان کرتے ہوئے معنوی طور پر HIGH MORALS کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اور ان کا کمال مرثیہ میں وابستگی اور داخلیت کے عناصر ہیں... بہرحال اس پہلی ملاقات میں ہی میں فیض صاحب سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کیا خبر تھی کہ یہ پہلی ملاقات، آخری ملاقات ثابت ہوگی لیکن یہ ایک بھرپور ملاقات تھی۔ اسی ملاقات کے تاثر میں چند اشعار بطور نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں:

ملت کا غم گسار تھا فیضِ بھرتپوری ہو شاعر تھا، حق نگار تھا فیضِ بھرتپوری
رکھتا تھا دل میں عشقِ شہیدانِ کربلا ہو یعنی وفا شعار تھا فیضِ بھرتپوری
وہ بحرِ فن کا ایک شناور تھا بے بدل ہو اسلام کا وقار تھا فیضِ بھرتپوری
عشقِ حسینؑ، عشقِ رسالت مآب میں ہو ہر لمحہ اشکبار تھا فیضِ بھرتپوری
مسلک میں مرثیے کے انیس و دبیر تھا ہو کیا مرثیہ نگار تھا فیضِ بھرتپوری
فاروق، سرکشانِ رسالت کے واسطے ہو اک تیغِ تابدار تھا فیضِ بھرتپوری

حضرت نیساں اکبرآبادی

نظم برائے فرزند حسن زیدی صاحب مرحوم

ف	فرزند جن کا نام حسن سے تھا متصل اخلاق میں بلند محبت بھرا تھا دل
ر	رمزِ فنونِ شعر سے آگاہ و باخبر عالم ادیب شاعرِ بے مثل باہنر
ز	زندہ کیا تھا مرثیہ جو توڑتا تھا دم کیا کیا نہ گل کھلائے بیک جنبشِ قلم
ن	نیساں انہوں نے اردو ادب کو دیا فروغ کہتا ہوں صاف صاف نہیں اس میں کچھ دروغ
د	دنیا پہ اپنے علم کا سکہ بٹھا دیا اہلِ قلم میں رنگ بھی اپنا جما دیا
ح	حسنِ بیاں تھا ایسا فصاحت کو جس پہ ناز مضموں بلیغ اتنے بلاغت کو جس پہ ناز
س	سوزِ بیاں بھی شعر میں بندش بھی لاجواب اردو پہ تھا عبور وہ فن میں بھی کامیاب
ن	نام و نمود کی انہیں خواہش کبھی نہ تھی وہ پنجتن کی شان میں کرتے تھے شاعری
ز	زیبِ کلام مدح سرائیِ اہلِ بیت ان کا پیام مدح سرائیِ اہلِ بیت

ی	یہ حسن خلق میں بھی مثال اپنی آپ تھے ہر دلعزیز سب کے لئے بے گماں رہے
س	دنیائے دوں کو چھوڑ کے جنت لبھائی ہے ہاتف کی میرے کانوں میں آواز آئی ہے
ی	یہ لیجئے ہے صنعت توشیح میں یہ نظم تحسین سے نوازتے ہیں اس کو اہل بزم

نظم بہ صنعت توشیح

ف	فن دکھادو شعر گوئی کا زمانے بھر کو آج اور اہل علم سے لو داد و تحسیں کا خراج
ی	یاوری فکر رسا کرے تو بن جائے گی بات ہوں مضامیں بھی عیاں طرز بیاں کے ساتھ ساتھ
ض	ضوفشاں اشعار سے ہو جائے میدان ادب ایک اک مصرع بنے لطف فصاحت کا سبب
ب	بیشتر اشعار میں توصیف ہو اس شخص کی وقف علم و فن رہا تھا جس کا دور زندگی
ہ	ہاں وہی زندہ کیا پھر جس نے فن مرثیہ مرثیہ کو ایک نیا طرز ادا بھی دے دیا
س	راستے جس نے دکھائے علم کے میدان میں کچھ بیاں ہو جائے نیساں آج اس کی شان میں
ت	تھا جو اک انسان کامل اور محبت سر بسر شعر کے حسن و قبح پر جس کی رہتی تھی نظر

پ	پاس وہ میرے نہیں تھا دور تھا وہ بالیقین ہاں مگر رہتا تھا میرے دل سے وہ بیحد قریں
و	وائے قسمت لے گیا اس شخص کو دستِ اجل شعر گوئی میں تھا یکتا خلق میں تھا بے بدل
س	راس یہ دنیا نہ آئی خلد میں گھر لے لیا مضطرب سب کو کیا ہے کوچ دنیا سے کیا
ی	یوں ہوئی ہے صنعتِ توشیح میں پوری یہ نظم تم اشارا کیوں کرو دانا ہیں سارے اہلِ بزم

قطعۂ تاریخ وفات فرزند حسن صاحب فیض بھرتپوری مرحوم

فیضؔ جہاں سے روٹھ گئے خلد کیا جا کر آباد
شاعرِ اہلِ بیت بھی تھے نیک طبیعت نیک مزاج
فکرِ رسا نے برجستہ کہہ دی ہے تاریخ وفات
کوچ کیا ہے دنیا سے فیضؔ بھرتپوری نے آج

۱۹۸۹ء

"قطعۂ دیگر بہ صنعت تعمیہ"

آج چھوٹے ہیں غموں کی دھوپ سے
فیضؔ صاحب سایہ رحمت میں ہیں
فکر تھی تاریخ کی بولا "قلم"
+ ۱۷۰
شاعر شیریں زباں جنّت میں ہیں

۱۸۱۹ = ۱۹۸۹ء

قطعۂ دیگر

کیا کوچ دنیا سے "ملکِ عدم کو
وفورِ الم سے چھٹے فیضؔ دیکھو
ندا غیب سے میرے کانوں میں آئی
"بہشت بریں میں گئے فیضؔ" دیکھو

۱۹۸۹ء

سیدہ رابعہ نہاں (راولپنڈی)

نذرانۂ عقیدت

جناب سید فرزند حسن فیض مرحوم

مداحِ اہلِ بیت کہ سوئے جناں گئے
یہ ماتمِ حسین میں سینہ تپاں گئے
کہتے تھے مرثیہ کہ یہی تھا شعارِ زیست
پڑھتے ہوئے یہ مرثیہ نوحہ کناں گئے
حوروں نے بھی خوشی سے لیا ان کو ہاتھوں ہاتھ
اُس بزم میں بھی صورتِ روحِ رواں گئے
جاری رہا ہے فیض بھی ان کا بہ نامِ فیضؔ
جود و سخا بھی ساتھ رہا ہے جہاں گئے
دیکھیں گے ان کو زندۂ جاوید ان کے وصف
ہم سب کے درمیاں سے بھلا یہ کہاں گئے
پیرو تھے یہ جنابِ محمدؐ کی آل کے
خدمت میں پنجتن کی بصد عز و شاں گئے
دنیا میں بھی بلند تر ان کا مقام تھا
دنیا سے جب گئے طرف آسماں گئے

سید یاور حسین یاور اعظمی

قطعہ تاریخ وفات
جناب سید فرزند حسن زیدی فدا، فیض جرتوری مرحوم

رباعی

مشکل جو تھا مر کے کامیاب ہوئے
ایک ذرہ تھے آفتاب ہوئے
شاعر آل مصطفیٰ تھے فیض
خدمت شعر میں نصیب ہوئے

قطعہ

ہائے افسوس ہوئی بزم سخنداں برہم
فیض کے غم میں ہے ارباب قلم میں ماتم
لوح کے سینے پہ اس غم میں چھری چلتی ہے
نام قرطاس پہ لکھتا ہے تو روتا ہے قلم
آیتیں ان کے لئے آہ و بکا کرتی ہیں
شاعر آل محمد تھے وہ قرآں کی قسم

مدح آئمہ میں ان گنت قصیدے لکھے
مرثیہ کہنے میں بے ساختہ چلتا تھا قلم

جب کبھی شعر و سخن کی کہیں بات آئیگی
فیض کی یاد ستائیگی جہاں کو بہم

یاد میں انکی ہوئی اہلِ قلم میں مجلس
سوگ میں ان کے جھکا ملکِ فصاحت کا علم

جانے کس بات پہ یہ اہلِ وطن سے روٹھے
اپنا گھر چھوڑ کے آباد کیا ملکِ عدم

ترجمانِ دلِ زہرا ہیں مراثی ان کے
نوحۂ حضرتِ زینب ہے سلاموں میں رقم

دست و پا سرد ہوئے جب تو پھرا کر آنکھیں
چپ ہوئے ایسے نہ پھر بولنے کی کھائی قسم

زور کچھ چل نہ سکا سانس کا رشتہ ٹوٹا
نقدِ جاں لوٹ لیا موت نے اے وائے ستم

بیٹیاں ان کے لئے آہ و بکا کرتی ہیں
جان لیوا ہے بڑا بیٹوں پہ ان کا ماتم

آہ کرتے ہیں کبھی اور کبھی سر دھنتے ہیں
قابلِ رحم ہے احباب کا ان کے عالم

اپنے غیروں کی بھی مشکل میں مددگاری کی
ڈھونڈھنے سے بھی کہاں ملتے ہیں ایسے ہمدم

غیر کو اپنا بنا لیتے تھے ایسے تھے خلیق
دین کی راہ پہ ہر وقت تھے یہ تیز قدم

دوستوں پر کبھی آنچ آئے تو تھے ان کی سپر
عزتِ نفس پہ بات آئے تو تھے تیغ دو دم

ایسے خوددار کہ اپنے کو لیے رہتے تھے
ایسے حساس کہ کڑی بات تھی ان کے لئے سم

آسماں پھوٹ کے رویا تو زمیں چلّا دی
رو دئے بیٹھے جو جنازے پہ گلے مل کے بہم

غیر بھی روئے پئے تابوت جب ان کا اٹھا
روز روشن ہوا اپنوں کی نظر میں شبِ غم

غم سے ہر رنگ شفق سرخ ہیں آنکھیں اب تک
لاکھ برسات ہوئی پر نہ بجھا شعلۂ غم

غم منائے گی سدا ان کا ادب کی دنیا
حشر تک روئیں گے ان کے لئے قرطاس و قلم

ان کی صورت مری آنکھوں میں بسی ہے اب تک
آپ منبر پہ ہیں اور سر پہ ہے سرور کا علم

یاد آئینگی بہت ان کی وفائیں مجھ کو
ہائے حسرت کہ دو قالب تھے اک جان تھے ہم

بہرِ تاریخ لکھو قبر پہ مصرعہ سیادت
"شاعرِ مرثیہ گو مالکِ قرطاس و قلم"

١٩٨٩ء

ساحر لکھنوی

قطعہ تاریخ وفات جناب فیض بھرتپوری مرحوم

مزاج مدح سرائے حسینؑ بھی ہے عجب
نہ اس کو موت کی پروا نہ زندگی کی طلب

ملے گا تیوروں میں اس کے خاص تیکھا پن
غلامیٔ شہ مرداںؑ ہے جس کا خاص سبب

یہ اس کی جرأت حق گوئی اس سے کہتی ہے
ہو لاکھ حاکم جابر کوئی، کسی سے نہ دب

بس ایک دھن کہ جیئوں تو حسینؑ کی خاطر
مروں تو یوں کہ ہو بہر نثار ادھر سے طلب

عجب ہے شوق حضوری میں اس کی بیتابی
اسی پہ جان دیئے دیتا ہے یہ بندۂ رب

جبھی تو دہر سے کس شوق سے سدھارے ہیں
جناب فیض بھرتپوری نثار مشرب

یوں آخرت کے سفر پہ چلے ہیں وہ جیسے
شعاع نور رواں ہے میان ظلمت شب

ہے آگے آگے تجلی ولائے حیدرؑ کی
ضیائے مدحت آل رسولؐ ان کے عقب

انہیں خوشی کہ برآئی مراد، ہم کو یہ غم
اک اور مرثیہ گو اٹھ گیا جہاں سے غضب
رندھی رندھی سی ہے ساری فضائے شعر وسخن
بجھی بجھی سی ہے پھر آج شمع بزم ادب
ہم ان کے صدمۂ فرقت سے دل ملول و حزیں
وہ خوش کہ مل گئی خلد ولا کی بزم طرب
ہر اک طرف سے اٹھی ہوگی اک صدائے درود
وہ باریاب ہوتے ہوں گے بزم خلد میں جب
وہ ہوں گے مجمع رنداں میں یوں لب کوثر
نظر بہ ساقی و شیشہ بدست و جام بلب
انہیں فضاؤں میں گونجے گی اک صدائے فیض
ملا تھا مرثیہ گوئی کا جو تجھے منصب
ہو زیب منبر جنت بھی آج پیش حضورؐ
یہاں بھی مرثیہ نذر حسینؑ ہو بہ ادب
فضا تجلیٔ مدحت سے جگمگا اٹھے
ورق ہو مدح کا آئینہ، بزم خلد حلب
ملے یہ فیض شہیدان کربلا وہ مقام
کہ جس کو دیکھ کے حیران ہوں اہل خلد بھی سب
جبھی تو مصرع تاریخ یہ ملا ساحر
"جناں کو فیض گئے مرثیہ سنانے اب"

۱۹۸۹ء

ذکرِ فرزند حسن

١٤٠٩ھ

حکیم محمد کاظم زیدی

اسلاف کی پہچان تھے فرزند حسن فیض
ذی فہم تھے، ذی شان تھے فرزند حسن فیض

سچائی کا دامن نہ کبھی ہاتھ سے چھوڑا
در اصل مسلمان تھے فرزند حسن فیض

حق گوئی و بیباکی رہا جن کا طریقہ
وہ صاحبِ ایمان تھے فرزند حسن فیض

محنت سے کیا قلعۂ تقدیر کو تسخیر
خوددار تھے، خود آن تھے فرزند حسن فیض

کیا جھکتے کسی ریت کی دیوار کے آگے
جب آہنی انسان تھے فرزند حسن فیض

تھا جس کے سبب ہر دلِ مکّار میں ناسور
سچائی کا پیکان تھے فرزند حسن فیض

ہر شعر میں ادراکِ صداقت کا سبق ہے
وہ صاحبِ دیوان تھے فرزند حسن فیض

تا عمر رہے مدحتِ شبیرؑ میں سرشار
شبیرؑ پہ قربان تھے فرزند حسن فیض

اوصاف و کمالات گِناتے رہے کاظم
یہ بھی کہو انسان تھے فرزند حسن فیض

١٩٨٩ء

آسماں کی طرح

باقر زیدی

تھے جو کل تک متاعِ جاں کی طرح
آج ہیں حسنِ داستاں کی طرح
ان کے اٹھنے سے یوں ہوا محسوس
فصلِ گل جیسے ہو خزاں کی طرح
دوستوں کے لئے ہمہ ایثار
فیض تھے فیضِ بیکراں کی طرح
تھے ہمدرد، ایک مخلص دوست
وقت پر پیارِ مہرباں کی طرح
وہ زمانے کی دھوپ میں ہم پر
سایہ گستر تھے سائباں کی طرح
خوش قدم، خوش مزاج و خوش قامت
پیرِ دانا مگر جواں کی طرح
ان کو حاصل تھی دولتِ ایماں
وہ مہکتے تھے گلستاں کی طرح
مجلسوں میں وہ اک بزرگِ خلیق
کارِ ہمت میں نوجواں کی طرح
خود وہ اپنا مزاج رکھتے تھے
کیوں کہیں ہم کہ تھے فلاں کی طرح
تھے وہ فکرِ انیس سے مانوس
مرثیے ان کے ارمغاں کی طرح
مرثیہ گوئی ان کا ایماں تھا
مرثیہ تھا عزیز جاں کی طرح
حسنِ خلق اور حرفِ حق کی طرف
وہ بلاتے رہے اذاں کی طرح
مرثیہ گوئی کے افق پر ہیں
آج بھی مہرِ ضو فشاں کی طرح

مرثیے کی زمین پر باقر
فیض دائم ہیں آسماں کی طرح

۱۴۰۹ھ

قمر وارثی

کی

قطعۂ تاریخ وفات
برائے فیضی بھرت پوری مرحوم

آشنائے آدمیت واقفِ اخلاقیات
شاعرِ حسنِ مناظر صاحبِ عرفانِ ذات
ہیں بہ حسنِ رفتگاں اب اہلِ دل میں جلوہ گر
رونقِ محفل تھے کیا کیا، ہے ابھی یہ کل کی بات
سچ تو یہ ہے عاشقِ آلِ شہِ دیں کے لئے
آئینہ دارِ بقا ہے کیا حیات اور کیا وفات
گو کہ موضوعاتِ دیگر کا تھا اک دفتر مگر
مرکزِ فکر و نظر تھے کربلا کے واقعات
تھا سلام و منقبت سے بھی طبیعت کا لگاؤ
مرثیہ لیکن رہا فکرِ سخن کی کائنات
ابتدا تو سنوارے لاکھ گیسوئے غزل
ذکرِ آلِ مصطفےٰ میں وقف کر دی پھر حیات

آ رہی ہے یہ صدا ہر گوشۂ دل سے قمر
"فیضی کا سرمایۂ فن حاصلِ موجِ نجات"

۱۹۸۹ء

کوثر نقوی

قطعہ ہائے تاریخ وفات

شاعر اہل بیت حضرت فیض بھرتپوری مرحوم

مرثیے میں وہ مدد کرتے رہے
غائبانہ، نت نئی تدبیر سے
جب کبھی کی دل نے آیت کی تلاش
"فیض کو آیت ہی تطہیر کا سے"

۱۹۸۹ء

میری ہر جانب تھا اس کے سوگواروں کا ہجوم
سب کی نظروں میں تصور میں دل مضطر میں فیض
ایک نے جاتے ہوئے یہ کان میں میرے کہا
"قلب کو یاد آئیگا اب عشرۂ یاورؔ میں فیض"

صنعت تخرجہ ۱۹۹۰ - ۱ = ۱۹۸۹ء

ہ یاور اعظمی

خلد میں زیر سایۂ شبیرؑ
شاعر ذی شرف سکون سے ہیں
کہہ رہا ہے یہ مصرعۂ تاریخ
"فیض کوثر بکف، سکون سے ہیں"

۱۹۸۹ء

سو رہا ہے جو اس میں چین کے ساتھ
اس پہ نظرِ کرم امام ؑ کی ہے
صاف کہتا ہے مصرعۂ تاریخ
"یہ لحد فیضؔ خوش کلام کی ہے"

۱۹۸۹ء

نظمِ برائے

حضرت فیضؔ بھرتپوری مرحوم

فیضؔ کی قامتِ فن ذہن میں آئے کیونکر
بحر بھر بھرے کوزے میں سمائے کیونکر
کیسے ذرّے میں بھلا وسعتِ صحرا سمٹے
کیسے شعلے میں یہ سورج کا اجالا سمٹے
ایسا لگتا ہے مری طبعِ رسا روٹھ گئی
یوسفِ دل سے زلیخائے انا روٹھ گئی
مثلِ آئینۂ شکستہ ہے تفکر میرا
منہ چڑاتا ہے مجھے آج تحیّر میرا

اپنے اظہارِ تخیّل پہ میں قادر ہوتا
کتنا اچھا تھا اگر آج میں ساحر ہوتا
جنبشِ لب سے ندامت کا قلم ٹوٹے گا
جنتِ شعر میں کوثر کا بھرم ٹوٹے گا
الفتِ فیضی مگر پھر بھی پکارے ہے مجھے
مثلِ کشتی کے یہ رہ رہ کے ابھارے ہے مجھے
لو مرے حسنِ تخیّل کے نظارے دیکھو
عرشِ قرطاس پہ لفظوں کے ستارے دیکھو
فیضی جب بولا تو اعجاز بیانوں کی طرح
لفظ منظوم ہیں تسبیح کے دانوں کی طرح
آ کے محرابِ تفکر میں اذاں دی اس نے
نوکِ خامہ سے خیالوں کو زباں دی اس نے
اس کی فطرت کی طرح رنگ ہے سادہ اس کا
پیالۂ چشمِ بصیرت ہے کشادہ اس کا
نقشِ فن دستِ سکندر کی لکیروں جیسا
اس کا ہر شعر ہے آباد جزیروں جیسا
منزلیں ابھری ہیں ہر نقشِ قدم سے اس کے
بارشیں فکر کی برسی ہیں قلم سے اس کے
کشتِ الفاظ میں افکار کو بویا اس نے
دل کی دھڑکن کو سماعت میں پرویا اس نے
فیضی کا قرب خیالوں کو روانی دیدے
مجھ سا کوثر بھی کہے فکر کا پانی دیدے
رنگِ اشعار سے جدّت کا قرینہ ٹپکے
تتلی دیکھے تو ندامت کا پسینہ ٹپکے
زورِ فن ایسا کہ ذرّوں کو اجالے بخشے
خار کے جسم کو خوشبو کے قبالے بخشے
شاعرِ شاہؑ کو حاصل ہوا یہ سوچ کے چین
موت آجائے تو بڑھ جائے گا یہ قربِ حسینؑ
رو کے یوں فیضی نے کی اپنے خدا سے یہ دعا
مستحقِ اجر کا میں ہوں تو یہ ہو اجرِ عطا
ہاں نئے طور سے ہو شاہؑ کا ماتم اب کے
خلد میں جا کے کروں ماہِ محرّم اب کے

۷۸۶

مصرعہ ہائے تاریخِ وفات

شاعرِ اہلبیت

"حضرت فیض بھرتپوری"

نتیجۂ فکر

کوثر نقوی

قطعہ نگار
روزنامہ ٹوڈے اسپیشل (کراچی)

۱۔ "فیض پر ہو خدا کا کرم"
سنہ ۱۹۸۹ء

۲۔ "فیض راہِ ادب، ہوا مرحوم"
سنہ ۱۴۰۹ھ

۳۔ "فیض ہے محوِ ذکرِ علی"
سنہ ۱۹۸۹ء

۴۔ "فیض ہیں محسنِ راہِ سخن"
سنہ ۱۹۸۹ء

۵۔ "فیض جیسے ماہرِ فن بھی چلے"
سنہ ۱۴۰۹ھ

۶۔ "فیض کا علم سربلند ہوا"
سنہ ۱۴۰۹ھ

۷۔ "دامنِ شاہ میں اب فیض بے مثال آیا"
سنہ ۱۹۸۹ء

۸۔ "فیض ہیں کربلا کے سائے میں"
سنہ ۱۴۰۹ھ

۹۔ "فیض عرشِ زمینِ ادب تھے"
سنہ ۱۹۸۹ء

۱۰۔ "شاعرِ اہلبیت فیض ہیں یہ"
سنہ ۱۹۸۹ء

فارمولے

۱۔ تخلص + بسم اللہ الرحمٰن الرحیم + محمد پر یو بد == سن وفات بلحاظ عیسوی
۲۔ تخلص + شبیر + ادب == سن وفات بلحاظ ہجری

نوٹ:۔ ۱۔ شاعرِ اہلبیت حضرت فیض بھرتپوری پر کوثر نقوی کے اکیاون(۵۱) مکمل مصرعہ ہائے تاریخ عنقریب کھارادر اور مارٹن روڈ سے طلب فرمائیں (منجانب ادارۂ ترویج مرثیہ)

شریکِ غم ——— جعفری چشمے والے۔ جی ۲۷ گلیمر ون۔ طارق روڈ۔ کراچی
فون: 423237

قطعات
برائے حنیف تنویری

افکار کو اوجِ آسمانی دے کر
اشعار کو دریا کی روانی دے کر
یوں حنیف گئے ملکِ سخن سے جیسے
حاکم کوئی جائے حکمرانی دے کر

بزمِ سخن ہے غمزدہ حنیف کے انتقال پر
نوحہ کناں ہیں خوش نوا حنیف کے انتقال پر
شاعرِ بے مثال تھے، حاملِ ماضی و حال تھے
مرثیہ خواں ہے مرثیہ حنیف کے انتقال پر

مرزا حیدر عباس

بیادِ فیض بھرت پوری

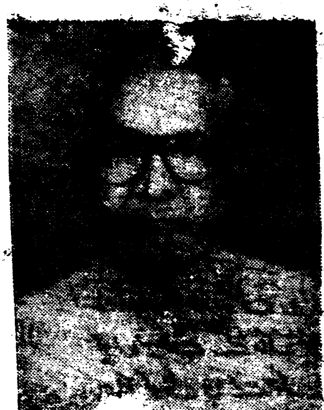

شوق تھا جن کو عروسِ شعر کی تزئین کا
حال عجب ہے یاد میں اس کی دلِ غمگین کا
بیٹھتے منبر پہ تھے فیض بھرت پوری ادھر
سامعین میں شور اٹھتا تھا ادھر تحسین کا

ان کے گلزارِ سخن میں وہ بہارِ تازہ تھی
جس کے آگے رنگ فق ہے لالہ و نسرین کا

وقفِ مدحِ صاحبانِ آیۂ تطہیر تھے
رہ کے دنیا میں کیا ہے کام سارا دین کا

ان کو قدرت نے دیا انعام بھی اکرام بھی
مرثیہ ان کا سہارا ہے دلِ غمگین کا

شوکتِ مضموں پہ ان کی فخر کرتے تھے کلیم
کیا ٹھکانہ ہے عروج و عزت و تمکین کا

ہاں فصاحت ہے مثالِ موجۂ بادِ نسیم
اس گلستاں میں نہیں ہے ڈر کسی گلچین کا

ہے کلاسیکی روایت طبع کی جودت کے ساتھ
مرثیے میں ہے کمال ان کے ہر اک آئین کا

صدقۂ اصغر میں ہے ایسا درخشندہ کلام
شعر گویا ہیں ایک جھمکا ہے مہ و پروین کا

وہ دکھایا آپ نے منظر نگاری کا کمال
مرثیے کا صفحہ گویا ہے مرقع چین کا

پیروی کی ہے انیسِ نادر کی اس طرح
بس دیا ہے جس نے منھ پر ایک نکتہ چین کا

باقر و جعفر میں ذوقِ مرثیہ پیدا کیا
یوں نبھایا فرض حبِّ آل کی تلقین کا

مرثیہ خواں جن کے تھے اب خلد میں ہیں انکے پاس
ان کی دوری میں یہی پہلو ہے اک تسکین کا

نظم

بیادِ فیض

وقار محسن

مخلص بھی تھے شریف بھی تھے باوقار تھے
مونس بھی تھے انیس بھی تھے غم گسار تھے

تھی موت تو بہانہ فقط اے دلِ حزیں
ملنے کو مرتضیٰؑ سے بہت بے قرار تھے

اک عمر ان کی مدحتِ سرور میں کٹ گئی
مظلوم کربلا پہ وہ دل سے نثار تھے

شعر و سخن کے پھول کھلے اُن کے فیض سے
گلشن میں شاعری کے وہ جانِ بہار تھے

بھرپور بات ہوتی تھی ان کے کلام میں
سب شعر فیض عام تھے سب شاہکار تھے

فن کا کبھی زبان سے دعویٰ نہیں کیا
فن پر انہیں عبور تھا با اختیار تھے

بچوں کے سر پہ سایہ فگن عمر بھر رہے
وہ تیز دھوپ میں شجرِ سایہ دار تھے

اب کس کو جا کے غم کی کہانی سناؤں گا
وہ اٹھ گئے جو دل کے مرے غم گسار تھے

جو اہلِ دل تھے ان کو عقیدت تھی فیض سے
اہلِ نظر کی بزم میں وہ باوقار تھے

محسن وقار تاب نہیں اب بیان کی
وہ چل بسے جو دل کا ہمارے قرار تھے

سید حیدر مہدی رضوی

بیادِ فیض بھرتپوری مرحوم
(تاریخِ وفات)

وہ جو کرتے رہے آرائشِ فردوسِ سخن — چل بسے چھوڑ کے اب اپنے مراثی کا چمن
مرثیہ گوئی ملی تھی جو بطورِ میراث — ان کو تھا پیشِ نظر اپنے اب و جد کا چلن
اس کو کیوں کیجئے پابندِ رسوم اور قیود — کس لئے نالۂ بے نے پہ لگائیں قدغن
یہ نہ شرقی ہے نہ غربی، یہ ہے بس آفاقی — نہ لسانی ہے نہ قومی، نہ کوئی اس کا وطن
نہ مسدس، نہ مخمس، نہ قطعہ اور نہ بند — نہ تو اسلوب کی بندش، نہ کوئی مشقِ سخن
مرثیہ دل پر اترتا ہے بہ اندازِ شعور — نہ تو ابلاغ کی حاجت، نہ کوئی اور جتن
رزمیہ، بزمیہ و بینیہ و موضوعی ہے — کس قدر بوجھ ہے لیکن نہیں چہرے پہ شکن
ہو فضائل پہ درود اور مصائب پہ بکا — یہ ہے آمیزۂ جذباتِ نشاط اور محن
مرثیہ گوئی سے ہے توشۂ عقبیٰ مقصود — ظلم ہے، اجرِ رسالت کو بنالیں گر فن
اس میں بکھری ہوئی رودادِ شہیدانِ وفا — اس میں ابھرے ہوئے سب نقشِ شہنشاہِ زمن
وہ جری جن کو ہوئے باعثِ تزئینِ حیات — آبِ شمشیر ہو یا مرحلۂ دار و رسن
جن کے لاشے ہوئے زیرِ سمِ اسپاں پامال — جو کڑی دھوپ میں رکھے گئے بے گور و کفن
جن کے سر کٹ کے سنانوں پہ ہوئے سرافراز — بیبیاں جن کی پھریں دربدر آوارہ وطن
ان حقائق کا بر تنا ہی ہے معراجِ کلام — حسن آمد میں ہے، آورد نہیں مستحسن
فیض کے مرثیوں میں ہے انہیں قدروں کا رچاؤ — یا مزید ان میں ہے گلہائے خطابت کی پھبن

صلۂ خلد جو لینا ہے فرزدق کی طرح
زیبِ مجلس کے لیے فیض بھرتپوری بن

۱۹ ۱۴۴ ۳۰ ۴۰ ۸۹۰ ۸۱۵ ۵۱

۱۹۸۹ء

اے فیضؔ کبھی بجھ تو پڑی کے... — فیض امروہوی

انتہائی رنج و غم کے ساتھ ایک قطعہ اور ایک یقینیہ نظم پیشِ خدمت ہے۔
— فیض امروہوی

قطعہ

غم کی روداد کیا سنائیں ہم
وہ کلیجہ کہاں سے لائیں ہم
یاد تھی جن کی زندگی سے عزیز
ان کو کس طرح بھول جائیں ہم

نظم

چپکے سے خزاں آجاتی ہے یوں بھیس بدل کر بھی اکثر
خوش رنگ بہاروں کا موسم کب راس کسی کو آیا ہے
محشر میں ملو تو جانیں گے سب لوگ تمہیں پہچانیں گے
یہ راز تھا جاتے جاتے جو دیدار ہمیں دکھلایا ہے
اس شہر میں جو بھی جائے گا بس اوڑھ زمیں سو جائے گا
در ہے نہ دریچہ، نہ آنگن، یہ کیسا مکاں بنوایا ہے
حلقے میں لیے تھے دیوانے ہوں شمع پہ جیسے پروانے
فیضانِ نظر جس پر بھی ہوئی وہ اہلِ سخن کہلایا ہے
سب رشتے ناطے ٹوٹ گئے کیوں بزم سے اپنی روٹھ گئے
اے فیضؔ! صدارت کی خاطر محفل میں تمہیں بلوایا ہے

سید کرار حیدر راہی

نذرانۂ عقیدت

مجلسِ شاہ شہیداں جو ہوئی جنت میں
اس میں شرکت کے لیے سارے حسینی آئے
مرثیہ فیضؔ ابھی کرنے نہ پائے تھے شروع
آئی آواز کہ آقائے خمینی آئے

کم سے کم ایسی تو انسان کو تقدیر ملے
دارِ فانی سے اٹھے خلد میں جاگیر ملے
مرثیہ گوئی سے فرزند کو یہ فیض ملا
حوضِ کوثر پہ انہیں شبرؑ و شبیرؑ ملے

فیضؔ بھرتپوری ارم چل

وحید الحسن ہاشمی
امامیہ مشن، محافظ پلازہ، انارکلی
لاہور

مکتوب
جناب وحید الحسن ہاشمی
بنام
جناب باقر زیدی
فرزند اکبر
حضرت
فیضؔ
بھرتپوری
مرحوم

عزیز برادرم، تسلیم
اس سے قبل ایک خط مضمون کے بارے میں ارسال کیا، جواب ندارد۔
رسالہ "شام و سحر" بھیجا، اس کا جواب غائب۔
اب تیسرا خط تاریخ کے متعلق ارسال کر رہا ہوں۔
خدا جانے اس کا بھی جواب آئے یا نہ آئے ۔۔۔ اگر ۱۶ جون کو کوئی مجلس ہے تو اس میں شرکت کے لئے کراچی آ رہا ہوں، الحاج صاحب کو مطلع کر چکا ہوں۔
"فیضؔ بھرتپوری ارم چل" ۱۹۸۹ سے ظہور حیدر جارچوی نے نثر میں تاریخ نکالی ہے اور نظم میں موصوف نے درج ذیل چار مصرعے ارسال کیے ہیں :-

فیض رسان و فیض یاب فیض بھرتپوری رسید
طالب فیض بوتراب فیض بھرتپوری رسید
فیض سلام و مرثیہ یافت بہ فیض فاطمہ
خلد بہ فیض آنجناب فیض بھرتپوری رسید

۵۶ ۱۹۸۹ء

۲۰۴۵ بکرمی

فقط وحید، لاہور

اظہارِ تعزیت

حضرت فیض ؔ تجربتوری کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملتے ہی مرحوم کے معاصرین، عقیدتمندان اور احباب کی جانب سے ادارۂ فیض ادب اور حضرت فیض ؔ تجربتوری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان خصوصاً جناب باقر زیدی کو بے شمار تعزیتی پیغامات موصول ہوئے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے ـــــ اس یادگاری مجلہ میں تمام پیغامات شاملِ اشاعت نہیں کئے جا سکے کیونکہ مجلہ کی تیاری اور اشاعت کا کام شروع ہو چکا تھا..

(ادارہ)

ہجومِ غم میں بھی گھبرا کر الم نہیں ہوتا
گلۂ ستم کا خدا کی قسم نہیں ہوتا
غمِ حسینؑ ہے ایسے جن کے قلوب ہیں معمور
انہیں زمانے کا پھر کوئی غم نہیں ہوتا

○ فیض ؔ تجربتوری

نیساں اکبرآبادی

۵۰۰-۲۴ گوالمنڈی
مدن پورہ - راولپنڈی

○

۴۸۶

۸ر مئی ۱۹۸۹ء

باقر زیدی صاحب، السلام علیکم

آپ کے والد صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر مجھے میرے چچا زاد بھائیوں اور سرفراز ابد کے ذریعہ ٹیلی فون پر مل گئی تھی۔ سن کر انتہائی رنج ہوا اور میں نے فوراً ہی ایک تعزیتی خط مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجا:

۵/۱۱، سی/۵ - ناظم آباد - پاپوش نگر، کراچی

خدا معلوم میرا وہ خط آپ کو ملا بھی یا نہیں ___ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

فیضت مہر تونکی صاحب صرف ایک ممتاز شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت اچھے، مخلص انسان تھے ___ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا ہو۔ میری بیوی کی طرف سے بھی مضمون واحد ہے۔

میں بوجوہ چند، چہلم یا تعزیتی جلسہ میں تو شریک نہ ہو سکوں گا البتہ میں نے ان کے لئے دو نظمیں ایک نام کی رعایت سے اور ایک تخلص کی رعایت سے صنعتِ توشیح میں کہی ہیں اور تین قطعاتِ تاریخ بھی کہے ہیں، وہ سب نقل کر کے بھیج رہا ہوں۔ رسید سے ضرور مطلع کریں۔ سب کی طرف سے سب کو علیٰ قدر مراتب دعا سلام۔ فقط

احقر

نیساں اکبرآبادی

رابعہ نہاں

۸۱- ہالے اسٹریٹ
راولپنڈی

۲۹ مئی ۸۹ء

عزیزم سلمہ، دعا

آپ کا خط محررہ ۱۲ ماہِ حال مجھے پرسوں ۲۷ کو وصول ہوا۔ بھائی فیضیؔ کی خبرِ مرگ سے سخت دکھ ہوا۔ ایسی بزرگ ہستیوں کا سر سے اٹھ جانا بڑی برکتوں اور محبتوں سے محروم ہو جانا ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا تازہ مرثیہ مجھے بھیجا کرتے تھے۔ افسوس صد افسوس! خداوندِ عالم سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں قربِ پنجتن عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل بخشے، آمین۔

.... ان حالات میں اور تنگئ وقت میں جو کچھ کہہ سکی ہوں، ارسال کر رہی ہوں۔ رسید سے مطلع کیجیے گا۔

میری طرف سے سب کو مناسبات، خدا حافظ۔

غم نصیب

سیدہ رابعہ نہاں

از میرپور
29-5-89

محترم باقر بھائی ۔ السلام علیکم

وحید الحسن ہاشمی صاحب کے ذریعے آپکے والد کے انتقال کی خبر سنی۔ تمام اہل خانہ کو شدید دلی دکھ ہوا۔

جب میں تیسری چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور علی پور میں رہتا تھا اس دوران میں فیض صاحب کا دو بار علی پور آنا ہوا۔ وہ کچھ دن وہاں مقیم بھی رہے اور دونوں مرتبہ انھوں نے بڑے ہال کمرے میں مجلس پڑھی۔ میں انکے پاس گھنٹوں بیٹھتا اور طرح طرح کے سوالوں کی بوچھاڑ کرتا رہتا۔ انھوں نے مجھے علم الاعداد کے بنیادی اسباق یاد کرائے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ انکے جدا ہونے کا جو دکھ آپکو ہے وہ کوئی اور محسوس نہیں کرسکتا۔ جن گوناگوں حوالوں سے آپ انکو یاد کرسکتے ہیں اور کوئی نہیں کرسکتا لیکن انکی منفرد شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن میں ہے۔ اسے بھی میرے ساتھ کوئی share نہیں کرسکتا۔

ہاشمی صاحب انکی شاعری پر مضمون لکھ رہے ہیں انھوں نے پیام عمل (ماہنامہ) کے مدیر کا چارج بھی سنبھال لیا ہے اور اپنی معاونت کیلئے مجھے اپنے ساتھ شریک کرلیا ہے۔ ہم انشاءاللہ اپنے پرچے میں بھی فیض صاحب پر مضمون شائع کریں گے۔

محمد نان عادل
29-5-89

سیّد مرتضیٰ میاں زیدی

۱۸/۱ سی، اسٹریٹ نمبر ۱۵
جی ۷-۲، اسلام آباد

۲۹ مئی ۱۹۸۹ء

محترم برادران جناب سیّد باقر زیدی صاحب،
جناب سیّد جعفر زیدی صاحب، جناب سیّد نسیم زیدی صاحب و
جناب سیّد مسعود زیدی صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ
آپ کا ارسال کردہ افسوس نامہ پیش نظر ہے۔ خداوند کریم آپ کو آپ کے والد محترم جناب فیضؔ بھرتپوری کے غم میں صبر عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ ——

اس وقت میرے سامنے آپ کا خط تو ہے ہی لیکن فیضؔ بھرتپوری صاحب کا ایک خط مورخہ ۱۵ جون ۱۹۸۶ء کا تحریر کردہ بھی ہے، جس کی نقل ہو بہو مندرجہ ذیل ہے:

۴۸۶
۱۱۰
۹۴

مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۶ء

مکرمی و محترمی'

سلام علیکم - امید کہ آنجناب خیریت سے ہوں گے - نوازش نامہ ملا - آپ کی عنایت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا - اسوقت عمر ۷۵ سال ہے - مائل بہ ضعیفی ہوں - ایک بحری جہاز کی کمپنی میں کام کرتا ہوں - سال ۶۳ء سے مرثیہ گوئی کی ابتدا کی - ہنوز ۲۷ مرثیے کہے ہیں جن میں سے ایک "گنج شہیداں" ایک بعنوان "تبرک" ایک "فلسفۂ تبرک" اور ۱۲ مرثیے جلد دوم میں ہیں - ۱۲ جدید مرثیے ابھی طبع نہیں ہوئے - فی الحال ارادہ ہے کہ یا تو قصائد یا رباعیات اور قطعات طبع کرادوں - اگر زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ یہ کام بھی ہو جائے گا ـــــ ایک مرثیہ بعنوان فلسفہ تبرک اور ایک جلد ۱۲ مرثیوں کی حاضرِ خدمت ہے - آج مورخہ ۲۵ جون کو بذریعہ بک پوسٹ رجسٹرڈ بھیج دیے ہیں - جب وہ آپ کو مل جائیں تو بذریعہ پوسٹ کارڈ اطلاع دیدیجئے گا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے ـــــ جب نیا کلام طبع ہوگا' آپ کو ضرور بھیجوں گا - اگر قطعات' رباعیات یا قصیدے کسی امام یا شہید کے درکار ہوں تو تحریر فرمائیں تاکہ قلمی نسخے آپ کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بھیج دوں -

آج کل کراچی میں گرمی شباب پر ہے - انیس مرحوم نے خوب فرمایا ہے ؎

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

دعا میں یاد رکھیئے گا - فقط والسلام

فیض بھرتپوری

خط کی نقل کر دی ہے - ان کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا خط میں نے محفوظ کر لیا ہے' اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو فوٹو کاپی بھیج دوں گا ـــــ ۱۹۸۶ء میں ایک خط ان کی خدمت میں خاکسار نے ارسال کیا تھا' اس وقت سے غائبانہ شناسائی ہوئی

— ان کی خواہش پر محترمہ اہلیہ فیض محمد تونوی کا نام اس فہرست میں درج کیا جن کو ماہِ رمضان المبارک میں قرآن کی تلاوت کا ثواب بخشتا ہوں۔ امسال ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں پانچ ختم قرآن کا ثواب حسبِ معمول مرحومین کو پہنچایا چنانچہ ایک فوٹو کاپی آپ کی خدمت میں بھی بھیج رہا ہوں!

جیسا کہ پہلے تحریر کر چکا ہوں اور مرحوم کے خطوط سے ظاہر ہے کہ ان کی خواہشات کیا تھیں۔ تھوڑی ہی مدت یعنی صرف پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں آسمانِ مرثیہ گوئی کے آفتاب بن کر ابھرے۔ زبان دانی میں محاورات کا استعمال 'روزمرہ کی بول چال' کو اشعار میں یوں سمویا کہ معمولی اردو بولنے والا بھی مطلب کو اچھی طرح سمجھ کر بغیر داد دیئے نہ رہے — ان کے مراثی میں رزمیہ شاعری اور نفسیات اسلوب، مناظرِ قدرت و مظاہرِ قدرت کا سماں خوب باندھا ہوا نظر آتا ہے۔ مراثی فیض محمد تونوی کے غم انگیز سانحے کے متعلق مرثیہ "گنجِ شہیداں" کے نام سے جو انہوں نے شائع کیا، وہ فیض صاحب کی قدرتِ کلام کا شاہکار ہے، شہدائے کربلا کے سینکڑوں ناموں کو اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ کہیں بھی یہ نام نام نہیں معلوم ہوتے بلکہ مرثیہ ہی کا جزو معلوم ہوتے ہیں، یہ بہت بڑا شاعرانہ کمال ہے — اسی طرح ایک اور مرثیہ 'تبرک' کے عنوان سے' ان مرحوم کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے جناب فیض محمد تونوی اپنی زندگی اہلِ بیت علیہم السلام کیلئے وقف کر چکے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کے ذکر فضائل و مصائب میں صرف ہوتا تھا بقولِ 'چاکوی' سے کچھ غرض ہے نہ سونے سے کام ہے، ہم کو فقط حسین پہ رونے سے کام ہے' — اور نتیجتاً بقولِ انیس ؎

جناں میں پائیں گے گھر اہلِ بیت کے مداح
صلہ خدا سے جدا لیں گے پنجتن سے جدا

آخر میں آپ سب کی خدمت میں التماس ہے کہ ایک سورۂ فاتحہ و تین مرتبہ سورۂ اخلاص مع درود شریف پڑھ کر ثواب جناب سید فرزند حسن زیدی فیض محمد تونوی کو پہنچا دیجیے — خداوندِ عالم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ (آمین) فقط

والسلام و التماسِ دعا

گنہگار سید تفضل امان زیدی

سید بنیاد علی تقوی

۳۴۵ - سائٹہ گوٹھ
خیرپور میرس

۳ جون ۱۹۸۹ء

محترم سید باقر زیدی صاحب

السلام علیکم

آج بھائی محمد عالم صاحب زیدی مقیم لقمان سے ملاقات ہوئی تو یہ بہت اندوہناک خبر سنی کہ بھائی فیض صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے اور یہ خبر اس مقام پر سنائی جہاں اور بھی خیرپور کے شعراء موجود تھے ـــــ میں کیا تحریر کروں کہ جو ہم پر گذر گئی اس کا اندازہ تو اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ مرحوم ہم سے جو محبت رکھتے تھے کہ جب بھی میں خیرپور سے کراچی گیا اور اگر ٹیلی فون پر اپنے قیام کی جگہ سے مطلع کر دیا تو عجلت میں وہیں پہنچ جاتے اور گھنٹوں ادبی ماحول میں گزر جاتے ـــــ میری فیض صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء میں ہوئی جب وہ شاعر آل محمد جناب مولانا نسیم امروہوی کے ہمراہ خیرپور تشریف لائے اور غریب خانہ کو رونق بخشی۔ اس لئے کہ مولانا نسیم یہیں قیام پذیر تھے ـــــ اس زندگی میں بہت سے شعراء سے ملاقات رہی مگر فیض صاحب ایک بیباک اور پختہ کار شاعر تھے ـــــ ان کی جدائی سے ایک خلاء پیدا ہوا ہے، وہ آسانی سے پُر نہ ہو سکے گا اور ہم سے ہمارا ایک مخلص دوست بچھڑ گیا۔

خداوند عالم سے دعا گو ہوں کہ مرحوم کو جوار چہاردہ معصومین میں رکھے اور آپ بھائیوں اور بہنوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آپ کے غم میں شریک
سید بنیاد علی

Port Gibson

JUNE 9, 1989

محترم مرزا باقر ماموں، آداب

گھر سے خط آیا تو آپ کے والدِ محترم کی رحلت کی خبر ملی۔ دلی دکھ ہُوا۔ خدا صبر کرنے والے کو دوست رکھتا ہے ـــــ انسان تو بے بس ہے، صبر ہی بہترین راستہ ہے۔ خدا آپ کو اس سانحہ پر صبرِ جمیل عطا کرے ـــــ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کے تحت انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہماری کوتاہیاں ہی خسارہ ہے۔ گو کہ اس خسارے کا اشارہ آخرت کی طرف ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ جب ایک محبِّ اہلبیت دنیا سے کوچ کرتا ہے تو خدا اس خسارے کا حساب دنیا ہی میں لے لیتا ہے۔ مختلف پریشانیوں اور بیماریوں کے ذریعے ـــــ ان کی وصال سے پہلے ناسازیٔ طبیعت خسارے کی ادائیگی ہی تو تھی اور پھر وہ تو شاعرِ اہلبیت اور ذاکرِ اہلِ بیت تھے۔ ان کے وصال سے جنت میں ایک جگہ اور بھر گئی ہو گی۔ اہلِ جنت، ایک نئے ساتھی کو پاکر خوش ہو گئے ہوں گے اور رسولؐ اور ان کے اہلِ بیت نے بڑھ کر ان کو خوش آمدید کہا ہو گا۔

خدا ان کو مزید اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کے سب برادران کو بھی صبر دے۔ قبرستان جانا ہو تو میری طرف سے بھی ایک سورۂ فاتحہ پڑھ دیجئے گا!

فقط

تحسین

شاہد حیدری
مدیر

ہفت روزہ شعاعِ دکن حیدرآباد
۲۲-۳-۳۵۸، منڈی میر عالم، بابِ نجف
حیدرآباد - بھارت

○

۱۴ جون ۱۹۸۹ء
یوم چہار شنبہ

برادرِ عزیز باقر زیدی صاحب!
سلام مسنون!

بڑے افسوس اور نمناک آنکھوں سے یہ خبر پڑھی کہ ہمارے ایک اور بزرگ کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا ۔ خداوندِ عالم انہیں بطفیل آئمہ معصومین و اہلِ بیتِ طاہرین، جوار سید الشہدا سلام اللہ علیہ میں جگہ عطا فرمائے ۔ ویسے بھی بحیثیت ناشر حسینیت و شاعرِ آلِ عبا وہ اسی درجہ کے حقدار ہیں ۔ اپنی پاکستان آمد کے موقع پر جس شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا، وہ عم محترم حضرت خیفری کی تھی ۔ ان کی سادگی، خورد نوازی اور ہمت افزائی نے بزرگی اور خوردی کی دیوار کو منہدم کر دیا تھا ---- بہر حال ماں باپ، بھائی بہن کی جدائی وہ عظیم غم ہے جس میں صرف کربلا والوں کی یاد ہی سے سہارا مل سکتا ہے ۔ میری اور تسکین کی دعا ہے کہ آپ اور آپ کے بہن بھائیوں کو غم شاہِ کربلا کے طفیل میں صبر عطا فرمائے ...

آپ کی خواہش کے مطابق تنویر صاحب، سہیل صاحب اور بھوپال والوں کو مطلع کر دیا گیا ہے ۔ اگر حالات سازگار ہوتے اور ہم لوگ سفر کے قابل ہوتے تو ایسے موقع پر ضرور آپ کے ساتھ ہوتے ۔

آپ کے غم میں برابر کے شریک
شاہد، تسکین

تعزیتی جلسہ کی روئیداد

حضرت فیض بھرتپوری کی شاندار ادب میں نصف صدی پر محیط گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ایک تعزیتی جلسہ ۱۵ جون ۱۹۸۹ء کو امام بارگاہ چہاردہ معصومین انچولی سوسائٹی، کراچی میں منعقد کیا گیا۔ صدارت پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم تقوی نے فرمائی جبکہ مہمانانِ خصوصی جناب ریٹائرڈ ایڈمرل ایم آئی ارشد اور جناب محسن برقی تھے۔ ملک کے نامور ادباء، شعراء اور دانشور حضرات نے فیض بھرتپوری اعلی اللہ مقامہ کے فن اور ان کی شخصیت پر اپنے مقالات، تاثرات اور نظمیں پیش کیں۔ جو حضرات کسی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے انہوں نے اپنی نگارشات ہمیں ارسال کر دی تھیں۔ ایسی تحریریں بھی ہم "تاثرات و مقالات" کے باب میں شامل اشاعت کر چکے ہیں ـــــ اس تعزیتی جلسہ کی روئیداد حضرت فیض بھرتپوری کے فرزند اکبر جناب باقر زیدی نے قلمبند کی ہے...

(ادارہ)

مولف:
باقر زیدی

تعزیتی جلسہ بیاد حضرت فیض بھرتپوری مرحوم

حضرت سید فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری اعلی اللہ مقامہٗ کی ذاتِ گرامی کے کئی رخ تھے۔ وہ ایک با اصول، شفیق اور اچھے انسان تھے۔ وہ محبِ اہلِ بیت تھے۔ وہ شاعرِ اہلِ بیت تھے۔ وہ ایک ممتاز و معروف مرثیہ گو تھے۔ ان کا رثائی کلام پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بھارت، برطانیہ اور امریکہ کے مختلف شہروں میں نہایت احترام اور عقیدتمندی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے ـــــ اس طرح حضرت فیض بھرتپوری کے لاکھوں دوست، عقیدتمندان اور چاہنے والے دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت فیض بھرتپوری کے ایصالِ ثواب کے لئے سوگواران نے کراچی میں ۲؍جون ۱۹۸۹ء کو بوقت ۴ بجے سہ پہر بمقام مسجد باب العلم، شمالی ناظم آباد، کراچی میں ایک مجلس عزا منعقد کی تھی جس میں جناب سید ابرار حسین و برادران نے سوز خوانی کی جبکہ الحاج سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے مجلس سے خطاب کیا۔ اس طرح کی مجالس عزا کے انعقاد کی اطلاعات پاکستان کے دیگر شہروں، بھارت، برطانیہ اور امریکہ سے بھی موصول ہو رہی ہیں ـــــ

حضرت فیض بھرتپوری مرحوم کی رثائی ادب میں نصف صدی پر محیط گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ایک تعزیتی جلسہ ۱۵؍جون ۱۹۸۹ء کو امام بارگاہ چہاردہ معصومین، انچولی سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی میں زیرِ صدارت جناب پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کے مہمانانِ خصوصی ریٹائرڈ ایڈمرل ایم آئی ارشد صاحب اور جناب محسن برقی تھے۔ جلسے میں حضرت فیض بھرتپوری کے احباب، عقیدتمندوں اور چاہنے والوں کے اجتماع سے جناب ساحر لکھنوی، جناب نیر اسعدی، جناب اقبال کاظمی، جناب الحاج سید ضمیر اختر نقوی، جناب قمر وارثی، جناب کوثر نقوی، جناب نجم الحسن عابد کے ـــــــــــــــ نے خطاب کیا۔

مقررین نے حضرت فیضؔ بھرتپوری کی شاعرانہ اہمیت اور انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں ایک کامیاب اور مقبول مرثیہ نگار قرار دیا۔ انہوں نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے رثائی کلام کو اردو شاعری میں اہم اور بامقصد اضافہ قرار دیا۔ مرحوم کے فن اور ان کی شخصیت کو بھی موضوع بنایا گیا۔ شعراء حضرات نے مرحوم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے مرحوم کو منظوم نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا۔

جلسہ کا آغاز

حافظ قاری حبیب الرحمٰن نقشبندی

نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا

جس کے بعد جناب اشرف عباس نے حضرت فیضؔ بھرتپوری کا معروف سلام پیش کیا۔ سلام کا مطلع یہ تھا

قدم اس راہ میں رکھیئے جناب آہستہ آہستہ
سمجھ میں آئے گا دیں کا نصاب آہستہ آہستہ

مرحوم کے اس سلام نے جلسہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور حضرت فیضؔ بھرتپوری کی کمی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ جلسہ کے مزاج اور حاضرین کی کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے فوری طور پر حضرت فیضؔ بھرتپوری کی وڈیو ریکارڈنگ دکھانے کا انتظام کیا گیا اور حاضرین نے کلامِ شاعر بہ زبانِ شاعر کے مصداق وڈیو پر حضرت فیضؔ بھرتپوری کو اپنا کلام سناتے ہوئے دیکھا اور سنا ـــــ اور تقریباً ویسی ہی فضا بندھ گئی جو مرحوم کی مجالس اور محافلِ سالمہ میں ہوا کرتی تھی ـــــ پیش کردہ ریکارڈنگ میں سے حضرت فیضؔ بھرتپوری کے کلام کے چند اشعار یہ تھے

ششماہے تھے تیر سے اصغرؑ ہوئے شہید
مادر کو انتظار تھا انؑ کے شباب کا

●

منکر نکیر قبر سے ہنس کر چلے گئے
جس دم قصیدہ میں نے پڑھا بوتراب کا

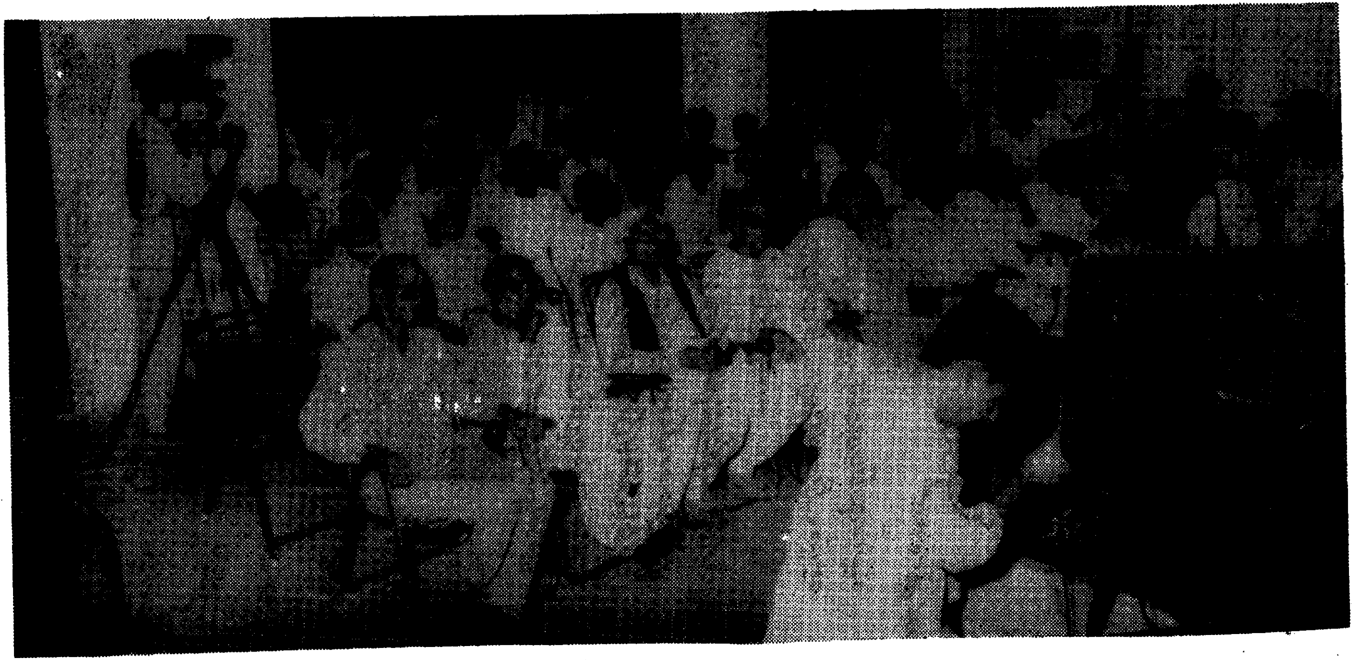

حاضرینِ جلسہ، حضرت فیضؔ بحر تنویری کے مرثیہ کی ریکارڈنگ دیکھ رہے ہیں

حضرتِ فیضؔ بھرتپوری کے ایک مرثیے کی ریکارڈنگ بھی حاضرینِ جلسہ کو دکھائی گئی۔ جلسہ گاہ میں حضرتِ فیضؔ بھرتپوری کی آواز گونجتی رہی اور حاضرین، مرحوم کو اپنے درمیان پاکر طمانیت کے احساس سے سرشار ہوتے رہے ـــــ اس کے بعد جناب نجم الحسن عابدی نے مرحوم کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

فیضؔ بے شک بالیقیں مداحِ اہلِ بیت تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے۔ وہ مجھ پر جتنے مہرباں تھے یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اب میں انہیں کہاں سے ڈھونڈ پاؤں گا... ایسے مخلص لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں جیسے کہ فیضؔ بھرتپوری تھے...

حافظ قاری حبیب الرحمٰن نقشبندی نے مرحوم کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

یاد آئے گی ہمیشہ اس کی وہ دریا دلی
چھوڑ کر مضطر سبھی فن کا سمندر اٹھ گیا
فطرتِ مستانہ سے تھا بہرہ مند و فیضیاب
یوں ہوا محسوس جیسے ایک قلندر اٹھ گیا

اس کے بعد جناب کوثر نقوی نے مرحوم کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ چند اشعار یہ تھے۔

فیضؔ کی قامتِ فن ذہن میں آئے کیونکر
بحر پھر بحر ہے، کوزے میں سمائے کیونکر

کیسے ذرّے میں بھلا وسعتِ صحرا سمٹے
کیسے مشعل میں یہ سورج کا اجالا سمٹے

○

آ کے معراجِ تفکر میں اذاں دی اس نے
نوکِ خامہ سے خیالوں کو زباں دی اس نے

نقش فن دستِ سکندر کی لکیروں جیسا
اس کا ہر شعر ہے آباد جزیروں جیسا

منزلیں ابھری ہیں ہر نقشِ قدم سے اس کے
بارشیں فکر کی برسی ہیں قلم سے اس کے
فیض کا قرب ہے خیالوں کو روانی دے دے
مجھ سا کوثر بھی کہے فکر کا پانی دے دے

شاعرِ شاہ کو حاصل ہوا یہ سوچ کے چین!
موت آ جائے تو بڑھ جائیگا یہ قربِ حسین
ہاں نئے طور سے ہو شاہ کا ماتم اب کے
خلد میں جا کے کروں گا میں محرم اب کے

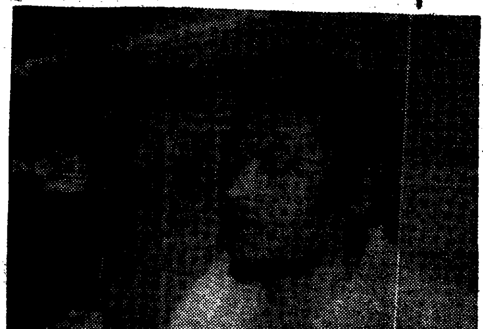

جناب قمر وارثی نے اپنے
منظوم نذرانۂ عقیدت میں
حضرت فیض جعفر ترویجی کے لئے کہا۔

آشنائے آدمیت واقفِ اخلاقیات
شاعرِ حسنِ مناظر، صاحبِ عرفانِ ذات
ہے یہ حسن نقشہائے اہلِ دل میں جلوہ گر
رونقِ مجلس تھے کیا کیا ہے ابھی یہ کل کی بات
سچ تو یہ ہے عاشقِ آلِ شہِ دیں کے لئے
آئینہ دار بقا ہے کیا حیات اور کیا وفات

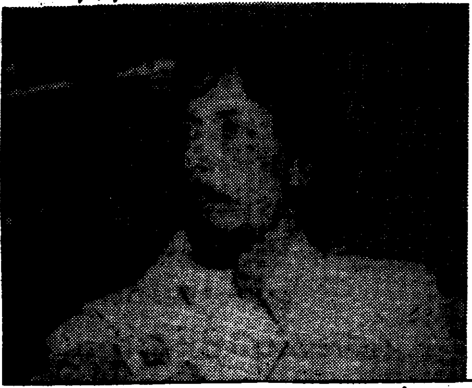

جناب ضمیر اختر نقوی نے
اپنے خطاب میں کہا کہ
حضرت فیض بھرتپوری کی یاد میں
یہ جلسہ ان کے فکر و فن، ان
کی شخصیت اور ان کی خدمات کو
نذرانۂ عقیدت ہے

انہوں نے کہا کہ فیض بھرتپوری مرحوم نے ۱۲۱ کے قریب مرثیے چھوڑے ہیں جو کہ جب تک پڑھے جائیں گے، اس کا ثواب اس وقت تک ان کو ملتا رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ فیض بھرتپوری نے نیک سیرت اولاد چھوڑی ہے جو ان کے نام کو بزم ایما میں زندہ رکھنے کے لئے کوشاں ہے۔ فیض بھرتپوری کے فن کے بارے میں الحاج ضمیر اختر نقوی نے کہا کہ فیض صاحب اچھا کہنے والوں میں سے تھے، بہتر کہتے تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ مرثیے کا رنگ کون سا ہے۔ وہ جدید مرثیے کے بارے میں بھی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ فیض بھرتپوری اچھے مرثیہ نگار تھے۔ شاعری وہ ہے جس سے قلب کو سکون ملے اور اگر شاعری میں فکر آ جائے تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ فیض صاحب نے شاعری میں فکر کے دامن کا ساتھ نہیں چھوڑا۔۔۔

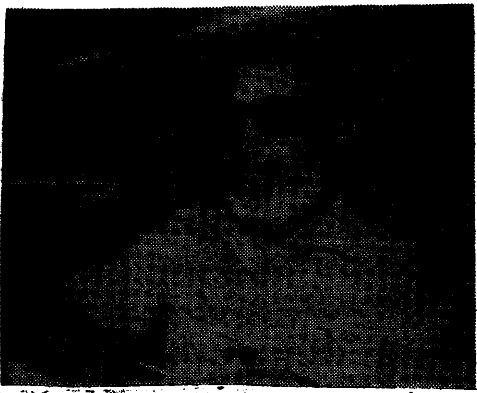

جناب الحاج ضمیر اختر نقوی کے طویل
خطاب کے بعد جناب اقبال کاظمی
نے چند اشعار بطور نذرانۂ عقیدت بحضور شاعرِ اہلبیت حضرت فیض بھرتپوری کے پیش کیے۔

بزمِ سخن ہے غمزدہ فیض کے انتقال پر
نوحہ بجاں ہے خوش نوا فیض کے انتقال پر

شاعر بے مثال تھے حامل ماضی و حال سے
مرثیہ خواں ہے مرثیہ فیضیؔ کے انتقال پر

o

افکار کو اوج آسمانی دے کر
اشعار کو دریا کی روانی دے کر
یوں فیضیؔ گئے ملکِ سخن سے، جیسے
حاکم کوئی جائے حکمرانی دے کر

پھر حضرت فیضی بھرتپوری کے شاگرد عزیز جناب نیر اسعدی نے اپنے استاد محترم کے لئے قطعات تاریخ کہے۔ ایک قطعہ تاریخ عیسوی اعداد میں ہے جبکہ دوسرا ہجری اعداد میں ہے۔ عیسوی اعداد میں جناب نیر اسعدی نے یہ قطعہ پڑھا۔

ذکرِ اہل بیت میں گذری تمام
شاعرِ آلِ محمدؐ السلام
بابِ جنت پر پکارا رضوان نے
مرثیے میں فیضیؔ کا اوّل مقام

معروف مرثیہ نگار اور ممتاز شاعر جناب ساحر لکھنوی نے مختصر خطاب کے بعد حضرت فیضی بھرتپوری کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

مزاجِ مدح سرائے حسینؑ ہے عجب
نہ اس کو موت کی پرواہ، نہ زندگی کی طلب
ملے گا تیوروں میں اس کے خاص تیکھا پن
غلامیِ شہِ مرداںؑ ہے جس کا خاص سبب
یہ اس کی جرأت حق گوئی اس سے کہتی ہے
ہو لاکھ حاکم و جابر کوئی، کسی سے نہ دب
بس ایک دھن کہ جیوں تو حسینؑ کی خاطر
مروں تو یوں کہ ہو مرثیہ ادھر سے طلب
عجب ہے شوق حضوری میں اسکو بے تابی
اسی پہ جان دیئے دیتا ہے یہ بندۂ رب

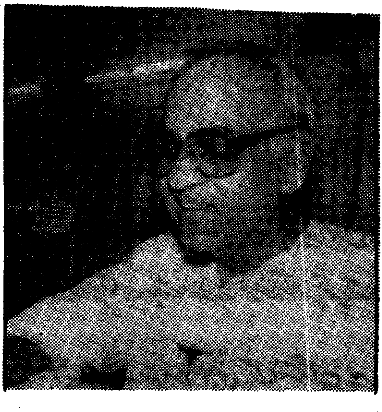

جب ہی تو دہر سے کس شوق سے سدھارے ہیں
جناب فیضؔ بھرتپوری تمناء مشرب
یوں آخرت کے سفر پر چلے ہیں وہ جیسے
شعاعِ نور رواں ہو میانِ ظلمتِ شب

ہم ان کے صدمۂ فرقت سے دل ملول و حزیں
وہ خوش کہ مل گئی خلدِ ولا کی بزمِ طرب

ملے یہ فیضِ شہیدانِ کربلا وہ مقام!
کہ جس کو دیکھ کے حیراں ہوں اہلِ خلد بھی سب

مصرعۂ تاریخ

جب ہی تو مصرعۂ تاریخ یہ ملا ساحرؔ
"جناں کو فیضؔ گئے مرثیہ سنانے اب"

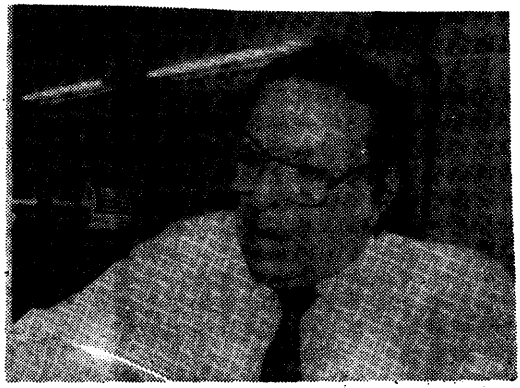

تعزیتی جلسہ کے مہمانِ خصوصی جناب محسنؔ برقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ فیضؔ بھرتپوری کا نام مرثیہ کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جناب محسنؔ برقی نے قرآن، واقعاتِ کربلا، زندگی اور مرثیہ کے حوالوں سے حقیقت پسندی اور شہادت کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مرثیہ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فیضؔ بھرتپوری کے مرثیہ کو ایک نیک عمل اور قابلِ قدر تخلیق قرار دیا۔

انہوں نے کہا کہ فیضؔ کے کلام میں ایک نے دیکھا ہے کہ انہوں نے مرثیہ، انسانوں کے لئے پیش کیا۔

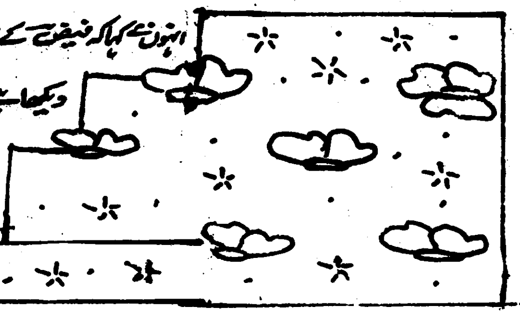

جلسے کے دوسرے مہمانِ خصوصی جناب ریٹائرڈ ایڈمرل ایم آئی ارشد نے اپنے خطاب میں فیض احمد فیض کو بحیثیت مرثیہ نگار خراجِ تحسین پیش کیا انہوں نے کہا کہ انیس و دبیر نے جو روایات قائم کی تھیں، لوگوں نے ان کی پیروی کی... ہمارے دور میں فیض صاحب کا اعلیٰ مقام ہے۔ فیض احمد فیض نے ان شہدا کے بارے میں کہا ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیئے... بعض لوگ مرثیے کو دینی ادب کہہ کر ادب سے الگ کر دیتے ہیں ــــــ انہوں نے کہا کہ ہماری روایات بیش بہا ہیں اور اس میں فیض نے اپنا ایک الگ مقام قائم کیا ہے۔ فیض کے مرثیے کو پڑھتے ہوئے محسوس

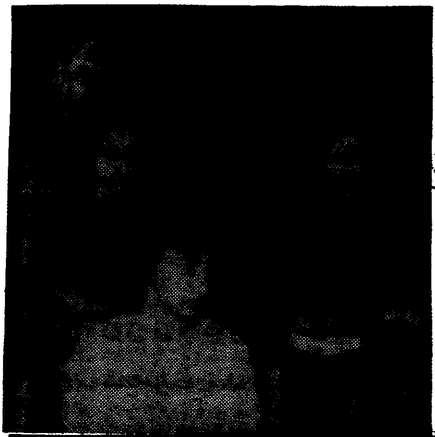

ہوتا ہے کہ ایک بہتا ہوا سمندر ہے اور اس سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے......

فیض صاحب نے اپنے کلام کو خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے...

فیض صاحب نے اپنی تمام تر توجہ مرثیے کی طرف رکھی اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا...

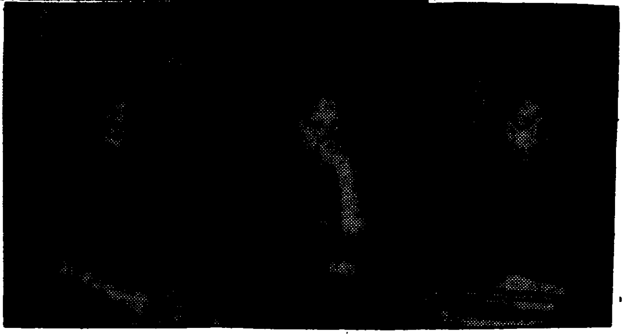

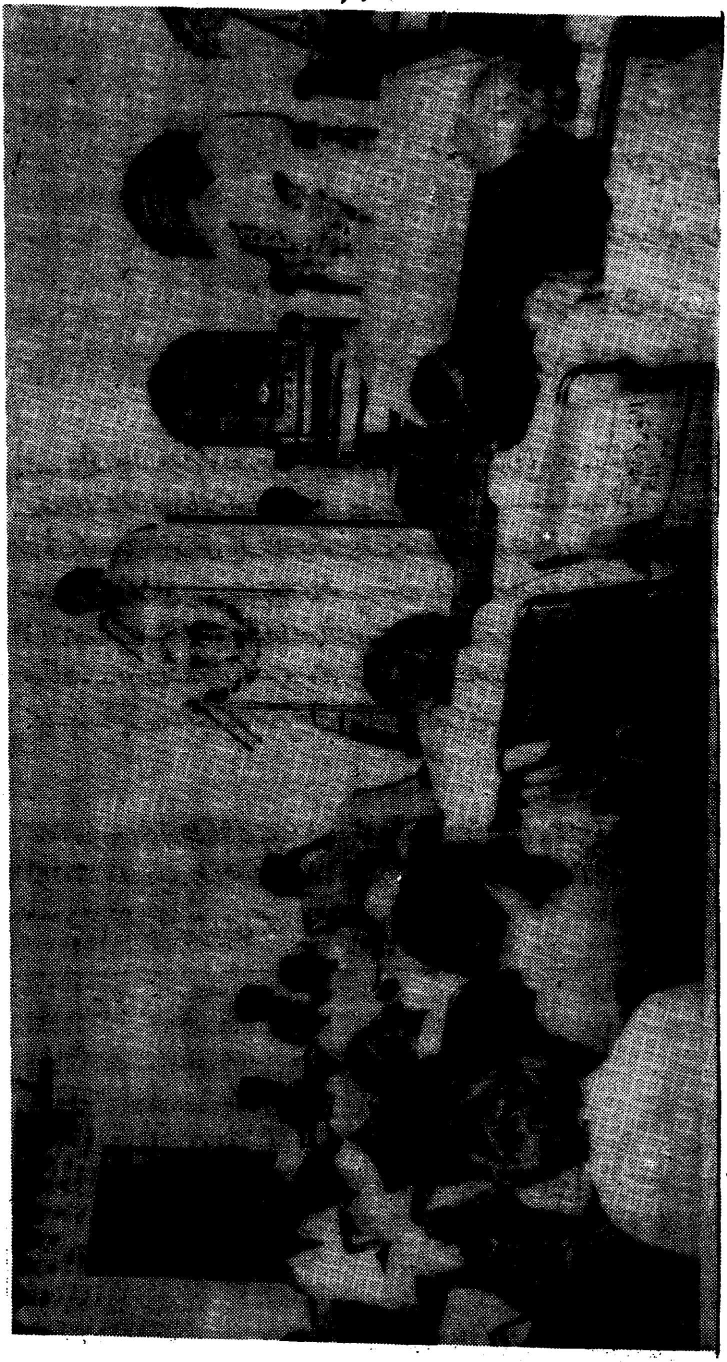

تعزیتی جلسہ کے اختتامی خطاب میں صدرِ جلسہ ممتاز ادیب و شاعر، محقق و ناقد پروفیسر ڈاکٹر سید نعیم تقوی نے حضرت فیض بھرتپوری کے فن اور شخصیت کا تجزیہ

..... پیش کیا اور مرحوم کو دورِ جدید کا ایک اہم مرثیہ گو شاعر قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ فیض صاحب نے شاعری کے تمام لوازمات کو خوبصورتی سے برتا ہے —————— فیض صاحب کو شاعری کی ضرورت نہیں تھی بلکہ شاعری کو فیض صاحب کی ضرورت تھی۔۔ فیض صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بنیادی طور پر انہوں نے کوئی اضافی فکر پیش کرنے کے بجائے قرآن اور اہلِ بیت کو سامنے رکھا اور انفرادیت اختیار کرتے ہوئے سعادت سے ہمکنار ہو گئے۔۔۔ انہوں نے قرآن کو مرکز و محور بنایا اور شہدائے کربلا کا تذکرہ دل کی گہرائیوں سے کیا ہے۔۔ فیض صاحب کے کلام میں سوز و گداز اور انیسیت پائی جاتی ہے۔۔۔

اس جلسے میں حضرت فیض بھرتپوری کے صاحبزادوں جناب سید باقر زیدی، جناب سید جعفر زیدی اور جناب سید مسعود زیدی نے بھی شرکت کی۔ جناب سید رضا حسن رضوی (فیض بھرتپوری کے داماد) مولانا راہی جہانگیر آبادی اور حضرت شفق اکبر آبادی بھی اس تقریب میں موجود تھے۔

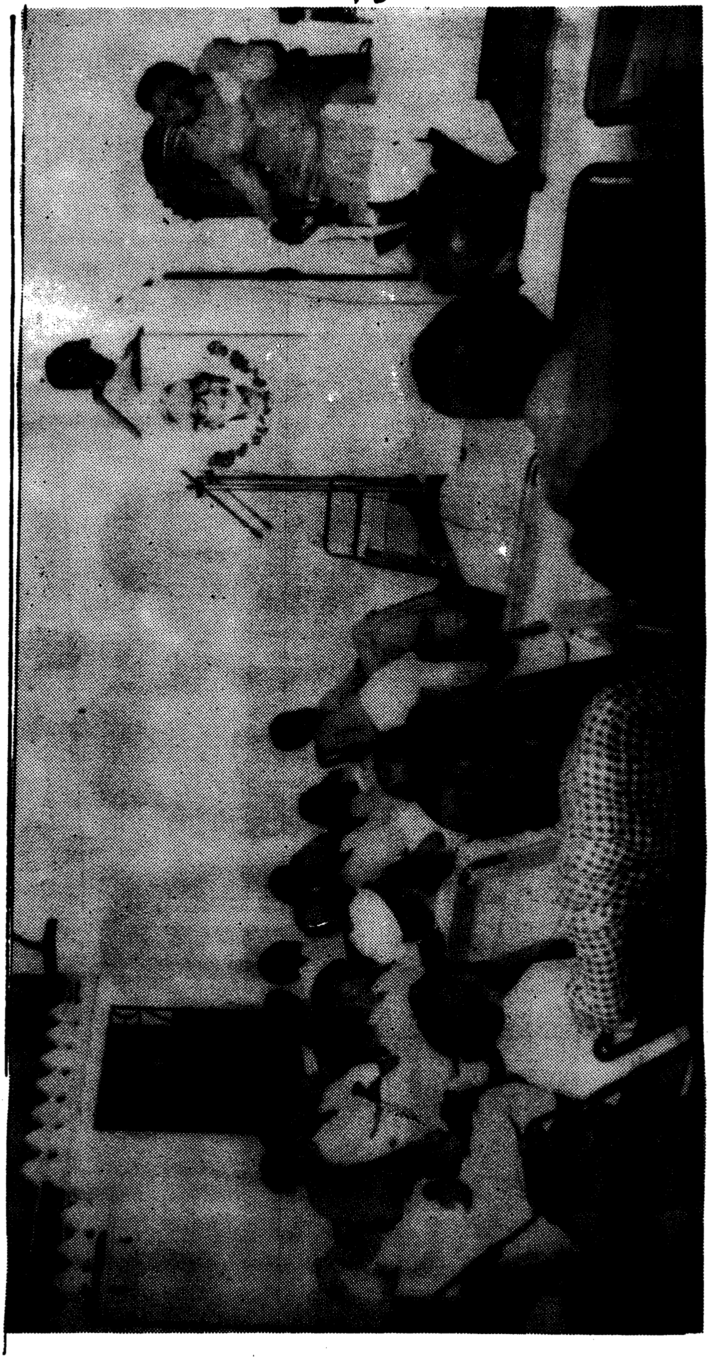

رضا حسن رضوی، باقر زیدی، مولانا راضی جہانگیر آبادی، صدرِ جلسہ ڈاکٹر نعیم تقوی، جناب محسن برنی، نیر اسعدی، — جبکہ عقب میں
مسعود زیدی اور جعفر زیدی

حضرت شفق اکبرآبادی، جعفر زیدی، باقر زیدی، صدرِ جلسہ ڈاکٹر نعیم تقوی، مہمانِ خصوصی ایم آئی ارشد، مہمانِ خصوصی محسن برنی اور مسعود زیدی۔

جناب محسن بن فرغ، پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی، جناب ایم آئی ارشد اور جناب پاشا قسمت زیدی کے

یادداشت

حضرت فیض بھرتپوری اعلیٰ اللہ مقامہ نے رثائی شاعری میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ خاص طور پر مرثیہ نگاری میں انہوں نے ممتاز حیثیت حاصل کی ــــــــ 'یادداشت' کے عنوان سے اس باب میں مندرجہ ذیل نگارشات پیشِ خدمت ہیں:

- مکتوبات بنام فیض بھرتپوری (انتخاب)
- فیض بھرتپوری کا مضمون "بھرتپور کی تاریخ مرثیہ گوئی" (۱۹۷۹ء)
- فیض بھرتپوری کی مرثیہ نگاری کے متعلق جناب پروفیسر منظور حسین شور اور علامہ طالب جوہری کے تاثرات (اقتباسات از "مراثیٔ فیض" مطبوعہ ۱۹۷۹ء)
- کلامِ فیض بھرتپوری (انتخاب) (ادارہ)

① مکتوبات بنام حنیف [illegible]

فون } دفتر ۔ ۶۱۳۳۲۳
مکان ۔ ۹۸۱۱۰۳
دفتر ۔ ڈی/۳۱، بلاک بی، ناظم آباد
مکان ۔ آر ۔ ۱۹/۱۲۸ فیڈرل بی ایریا
کراچی

۲۰ فروری ۷۶

مدیر لغت

محترم حنیف صاحب زاد لطفہ

تسلیم! جامعہ ادبیہ کی مجلس کا اعلان جنگ میں شائع نہیں ہوا، لہٰذا خاص طور سے یہ کام وسیم صاحب کے سپرد کیجیے۔ ہمدانی صاحب کیجیے تو بہتر ہے کہ جنگ کے ہیڈ جات بسین بخاری رہتے ہیں، ان کے پاس وسیم کو بھیج دیا جائے۔ پانچ روپیہ فی اعلان کا ان سے وعدہ کر لیجیے، اجرت کرانا ان کے یہاں اعلان دیا جاتا ہے اور یہ اپنی ذمہ داری پر چھپواتے ہیں۔

تسلیم تعارفی کا سے روپیہ ادا نہیں۔ ... آ گئے تھے، وہ بھی پچاس روپے آپ کے نام بھیجیں گے، انھیں آپ کا پتا لکھا دیا ہے۔

مجلس کی اشتہار کی زیارت کا منتظر ہوں۔ اردو کا ترجمہ درست کر کے بھیج دیا ہے، آپ اس کے لیے تاکہ صاف کرنے کے بعد ایک دفعہ آپ کو سنا دیں، سنا ہے کہ اس نے گوشوارے میں حرف بحرف گنتی کر حرف گنتی پڑھ دیا تھا۔

ایک خط بدر صاحب کے نام لکھا ہے، ان کا پتا معلوم نہیں، ورنہ ڈاک سے بھیج دیتا۔ آپ یہ خط ان تک پہنچا دیں اور جواب لکھوا دیں۔

صدیقی صاحب کا کرسی سے اٹھنا کیسا گزرا۔ آپ نے نہیں لکھا، اس کی طرف بھی توجہ رکھیے۔

دیگر حالات سے مطلع کریں۔ یہ بھی تحریر کریں کہ شب بیداریوں کا اب کیا عالم ہے۔ باقی خیر۔ شب گئی یا رات گئی۔ زیادہ قابل ہرگز یا کہیں۔

بچوں کو دعا کہیے۔

نسیم امروہوی

ایک خط وسیم صاحب (ابن نزار) کے نام ملفوف ہے، وہ انھیں دے دیں۔

برمکان مسز ... امداد علی خان صاحب
کرشنا نگری ..، ضلع فیروزپور ...

Dr. Syed Safdar Husain
M.A., LL.B., Ph.D.
BARGAH-E-ADAB
Muzaffar Manzil.
64 Haider Road Islampura.
LAHORE. (Pakistan).

بارگاہِ ادب

Date ۱۰ ستمبر ۱۹۶۹ء

برادرِ گرامی - آداب و نیاز - جناب کا مجموعۂ مراثی دیدہ زیب ہوا - سلیقۂ ترتیب و طباعت لائقِ تحسین ہے - آپ نے شعرائے ہجرت پور کا حال قلمبند کر کے محققینِ مرثیہ کے لئے گویا ایک اشاریہ مہیا کیا ہے - آپ کا کلام اس بات کا مستحق ہے کہ اسے توجہ سے مطالعہ کر کے تاریخِ مرثیہ میں آپ کی جگہ متعین کی جائے - آپ کے فرستادہ تبرکات میرے پاس محفوظ ہیں - آپ کی شخصیت سے میرا محض غائبانہ تعارف ہے - صورت آپ کی بعض محفلوں میں دیکھی تھی لیکن ہمکلامی کی سعادت سے اب تک محروم ہوں - چاہتا ہوں کہ آپ سے قرب کی کوئی راہ نکلے تو آپ کے کلام بلاغت نظام کا مطالعہ آپ کی شخصیت کے حوالے سے کروں اور اپنے تاثرات ایک مقالے کی صورت میں قلمبند کر کے اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہوں جو آپ کے التفات و محبت نے مجھ پر واجب کیا ہے - سرسری مطالعے سے بھی آپ کی وسعتِ نظر، حسنِ تنظیم اور بلندیِ فکر و فن کا میں قائل ہو گیا ہوں - وہب و اکتساب کے ساتھ ساتھ اسلاف کے پُرعزم خون کی جولانیاں بھی آپ کے کلام میں جلوہ گر ہیں - آپ کی جدت پسند طبیعت نے تاریخ و مطالباتِ عصر کا نہایت عمدہ امتزاج مرثیہ میں قائم کیا ہے - خدا آپ کی شاعری کو اس سے زیادہ تابندگی عطا فرمائے - آمین

مخلص : صفدر حسین

۱۵/۸۹ کرشن نگر لاہور

۸/۱/۸۰ء مخدومی و مکرمی فیض صاحب تسلیمات

آپ کا خط اور کتاب کا رجسٹرڈ پیکٹ قبل محرم وصول ہوئے تھے لیکن مجھ تک تاخیر سے پہنچے۔ اسے آپ اپنی کتاب کی مقبولیت کہیے یا میری کم نصیبی کہ خواتین کی مجالس میں وہ کتاب دست بدست گھومتی رہی اور بعد محرم مجھ کو ملی وہ بھی آپ کا دوسرا خط آنے پر اور خاصی تگ و دو کے بعد۔ میں اپنی اولین فرصت میں انشاء اللہ جلد اپنی گزارشات کتاب کے بارے میں لکھ کر معارف اسلام لاہور یا کسی اور رسالہ میں شائع کراؤں گا اور آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔

آپ کے فکر و فن کے بارے میں ایک مقالہ بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔
دعا فرمائیے کہ جلد از جلد یہ کام مکمل ہو جائے۔

نیازکیش
مسعود رضا خاکی

S.A.M. Zaidi,
A/Cs. Branch,
Water Division
P.O. Box No. 150,
SHARJAH (UAE)

پنجشنبہ ۱۹ر شوال ۱۳۹۹ھ
۱۳ر ستمبر ۱۹۷۹ء

فیض مجسم حبیب محترم و برادر مکرم و معظم جناب بھائی فیض صاحب ۔ وعلیکم السلام ۔

سلام علیکم ۔ بہت انتظار کرایا ۔ جواب کی طرف سے مایوسی تو نہ تھی مگر جتنی دیر ہوتی جاتی تھی بے چینی بڑھتی جاتی تھی ۔ یہ بھی یقین تھا کہ آپ مجھ سے خلوص رکھتے ہیں اسلئے میرے کئے ہوئے کسی اعتراض پر بھی چیں بجبیں ہونگے اگرچہ بہت سے اعتراض برائے اعتراض ہی سمجھتا تھا اور وہ میری جہالت تھی جسکو آپنے ایک مسکراہٹ سے معاف بھی کر دیا ہوگا ۔ مجھے آج تک توفیق نہ ہوئی کہ ایک مرثیہ بھی لکھ لیتا اور اصل سبب یہ ہے کہ مرثیہ لکھنے کے لئے صرف ادبیت یا شاعری یا زبان دانی کافی نہیں ۔ علم کلام و علم بیان پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ آیات احادیث تفسیر اصول و فروع پر بھی عبور ہونا ضروری ہے اور تاریخ پر آیات و احادیث کی کسوٹی پر سیر ہونا ضروری ہے جو میرے بس کی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نسیم صاحب قبلہ کے مقابلہ میں متقدمین و متوسطین یا متاخرین میں کسی کو بھی نہیں پاتا ۔ وہ جہاں رہیں خدا انکو خوش رکھے ۔ آمین ثم آمین ۔ میں اگرچہ پاکستان میں نہیں تاہم ان کا کراچی سے چلا جانا مجھے بہت شاق ہے ۔ آپ کی ذات میری نگاہوں میں وہ ہے کہ نسیم صاحب قبلہ کے بعد مرثیہ گوئی میں کسی کو بھی پاکستان میں آپ کا مقابل نہیں سمجھتا ۔ یہ بات میں کراچی میں اکثر ملنے والوں سے کہہ چکا ہوں اور یہاں بھی ہمیشہ کہتا رہتا ہوں اسلئے آپکے کلام پر کسی قسم کی اصلاح کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا سمجھتا ہوں لیکن بڑے سے بڑے مصنف کی نگاہ یا ذہن دھوکا کھا سکتا ہے اور اس دھوکہ کی طرف کوئی بھی مخلص نشان دہی کر سکتا ہے ورنہ فیض بھائی صحیح بات یہ ہے کہ نسیم صاحب قبلہ کے چلے جانے کے بعد کراچی میں کوئی اصلاح کرنے والا نہیں ہے جو آپکے کلام پر صحیح اصلاح کر سکے اور میرے جیسے جاہل معترض ہر قدم پر مل جائینگے ۔ خداوند عالم بیس نہیں بلکہ لاتعداد مراثی لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر مرثیہ نایاب و مقبول عام ہو اور امام المصائب آپکو دین دنیا دونوں میں جزا دیں اور دلائیں آمین ثم آمین ۔ خدا زندگی اور روزگار میں صحت و عزت و اقبال کے ساتھ روز افزوں ترقیاں عطا فرمائے کہ آپکے صاحبزادے کہ نے طباعت کا انتظام کیا اور مزید کر رہے ہیں ۔ جو کچھ تیار ہے وہ سبط جعفر سلمہ کو دیدیں ۲۳ر ستمبر تک کراچی سے کچھ لوگ آ رہے ہیں وہ آپکا معزز تحفہ مجھ تک پہنچا دیں گے ۔ گذشتہ دو ماہ قبل زیارات کے لئے قم گیا تھا عریضہ میں آپ کو بھی یاد رکھا ہے ۔ اس وقت سمجھدار شعراء مخلصین میں ایک پڑھے لکھے شاعر پروفیسر عزیزی لبغیم ضیائی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے یا پھر مولانا جوہر صاحب قبلہ پر ۔

کبھی کبھی محبت نامہ سے سرفراز فرماتے رہا کریں ۔ میں بھی اعتراضات کے تیر چلاتا رہوں گا ۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں مودبانہ سلام خوردان عزیز سلمہم کو دعائیں ۔

والسلام آپ کا خادم
راہی جہانگیر آبادی

۲۳ جون ۱۹۸۲ء

نفیس صاحب

آداب۔

"مراثی نفیس" جلد دوم اسد صاحب سے مانگ کر لایا ہوں۔ [illegible] اس کی

ضرورت تھی۔ اس کتاب کی بہت سی معلومات میں مجھے [illegible] ہے کہ [illegible] مرثیہ کی

تاریخ مرثیہ گوئی۔ مجھے آپ کا مقالہ بہت اہمیت کا حامل ہے اس سے بہت سی راہیں ملی ہیں۔ لیکن چند

سوالات آپ سے کرنا ہیں جواب عنایت فرما دیں گے۔

(۱) صفحہ نمبر ۱۱ پر آپ نے لکھا ہے — "راقم الحروف نے کل سو مرثیے کہے ہیں" اب ۱۹۸۲ء میں غالباً

مرثیوں کی تعداد کیا ہو گئی ہے۔؟

(۲) صفحہ نمبر ۱۶ پر مرثیہ گو شعراء کا آپ نے ذکر کیا ہے آپ نے لکھا ہے کہ [illegible] ان کا کراچی میں انتقال

ہوا ہے۔ [illegible] کہ اس میں [illegible] شعراء [illegible] کے متعلق آپ نے [illegible] کہ ان کا انتقال کراچی میں

ہوا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں [illegible] (مقالہ میں) کہ [illegible] شعراء کراچی میں انتقال

کر گئے ان میں تحقیق [illegible] ہے۔

(۳) صفحہ نمبر ۱۳ پر آپ نے سید فرحت حسین رضوی کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی فہرست [illegible]

یہ ماشاءاللہ بقید حیات ہیں اور [illegible] کراچی میں ہیں [illegible] معلومات میں اضافہ کیجئے۔

(۴) [illegible] آپ نے [illegible] "دیانت" کسی [illegible] میں آیا!

جواب کا منتظر رہوں گا

آپ کا اپنا ہلال نقوی

ADDRESS:
HILAL NAQVI
1094/9 DASTAGIR SOCIETY
F-B-AREA KARACHI-38

[illegible] صاحب
۵ بستی ۱۱/۵ ناظم آباد کراچی

SHUA-E-DECCAN
(WEEKLY)

EDITOR
SHAHID HYDERI

22-3-368, Mandi Miralam,
Babe Najaf, Hyderabad.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Ref.

Date : ١٩-١١-٨٢

مکرمی حضرت مفتی بھرت پوری

تسلیمات :- گزشتہ ہفتہ تو تصنیف مطبوعہ مرثیہ کی دو کاپیاں بذریعہ ڈاک وصول ہوئیں
میں رسیدی خط لکھنے والا ہی تھا کہ کل منظور صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی۔
مرثیہ بہت پسند آیا اور آپ نے اصلاحی رنگ اپنا کر لکھنے والوں کو راہ دکھائی
ہے اس طرح شاعری سے نہ صرف تبلیغ حسینیت کا کام لیا ہے بلکہ حق منبر
بھی ادا فرما کر قوم کے کردار کو سنوارنے کا فرض بھی ادا کر دیا ہے۔
لیکن "علامہ" لوگوں سے لگتا ہے شاید انہیں غلط پروپیگنڈے پر آمادہ کر دیا
ہے مولانا سید علی نقی صاحب - قبلہ کا حال برا ہے یا پھر حیدرآباد سے جو سیاسی کا
سے بیٹھے ور ذاکرین یا علامہ "حضرات" کو اپنا مخالف بنا لیا ہے
بہر حال میری دعا ہے کہ قوم کے نوجوان شعراء آپکی تقلید کے ذریعہ
قوم کی تعمیر کریں فقط آپکا مداح شاہد حیدری

۸۶ ـ

اے-۳۱۶ بلاک آئی
شمالی ناظم آباد
کراچی ۳۳

[illegible] ۳ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ
مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء

محترمی حنیف صاحب آداب عرض

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو آپ تشریف لائے تھے میں کراچی یونیورسٹی گیا تھا اس لئے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی واپس آیا تو سخت شرمندہ ہوا

حسب معمول ٹیلیفون پر تعلق نہیں ملا اس لئے خط لکھ رہا ہوں

جناب کریم عباسی صاحب کا آپ کے نام مرسلہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء موصولہ احقر نے حسب ہدایت ٹرسٹ کو بھیج دیا ہے
حنیف صاحب کے ویزے پر ان شاء اللہ جو کچھ ہو سکا حاضر کر سکوں گا۔ ان شاء اللہ احقر
حافظ ...

چند روز ہوئے آغا صاحب قزلباش کے ہاں تشریف لائے اور ایک ڈبیہ

تبرک کا تذکرہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس میں تمام کاغذ پڑا ہے مختلف حضرات کے نام

لکھے جا چکے ہیں اس لئے وہ ہمراہ دے رہا ہوں۔ آپ طلب فرمالیں

تبرک بطور تبرک تقسیم کر دیا گیا۔ بہت سے ادبی ذوق رکھنے والے

حضرات تبرک سے محروم رہ گئے

نوٹ: جن حضرات کو آپ نے تبرک

عنایت فرمایا ان کے رقعے حوالے ہیں

مطلع فرمائیے گا

دیرینہ نیازمند
لعل
طالب دہلوی
[illegible]

(۴)

فیض بھرتپوری

بھرتپور کی تاریخِ مرثیہ گوئی

ہندوستان کے صوبہ راجپوتانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست بھرت پور بھی تھی۔ جہاں علم و ادب کے چرچے تھے۔ چونکہ ریاست بھرت پور کے مشرق میں آگرہ اور متھرا تھا غرب میں ریاست جے پور اور مالور جنوب میں قرولی وغیرہ شمال میں ضلع گوڑگانوہ تھا۔ یہاں اچھی خاصی تعداد مسلمانوں کی تھی جو اردو بولتے تھے اور خاص کر سادات حضرات شان و شوکت کے ساتھ محرم میں عزاداری کے اہتمام کرتے۔ محرم کی

مجالس میں مرثیہ خوانی کو اولیت حاصل تھی اس لئے بھرت پور میں مرثیہ گو شعراء کی تعداد خاصی نظر آتی تھی۔ محفل مشاعرہ اور مقاصدہ بھی منعقد ہوتی تھیں ان محفلوں نے شعر و سخن کو پروان چڑھایا اور اُردو ادب میں نسیم بھرت پوری اور قتیل جیسے نامور استادوں کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں بھرت پور کے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ کچھ مرثیہ گو شعراء ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے چند مرثیہ نگار جو حیات تھے وہ پاکستان آئے لیکن ابتداء میں یہاں مرثیہ گوئی کا چرچا نہ ہونے کی وجہ سے وہ گوشۂ گمنامی میں انتقال کر گئے خاصہ ذخیرہ تصنیف یادگار چھوڑ گئے۔ بھرت پور کی تاریخ مرثیہ گوئی میں جن مرثیہ نگاروں کے نام زندہ رہ گئے اور جن کا کلام کچھ گردش زمانہ سے بچ گیا۔ ان مرثیہ نگاروں کا مختصر تذکرہ یہاں کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے نام بھی تاریخ مرثیہ گوئی میں زندہ رہیں۔

سید علی اصغر رضوی اصغر

والد کا نام سید سجاد حسین رضوی ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے کراچی آئے یہیں نسیم امروہوی سے تلمذ حاصل کیا اور مندرجہ ذیل مراثی نظم کئے۔ کراچی میں انتقال ہوا۔

۱۔	ہجرت ہر ایک قوم کی تازہ حیات ہے	درحال حضرت علی اکبرؑ
۲۔	اے طبع نوربار دکھا آب و تاب نظم	درحال حضرت عباسؑ
۳۔	بھائی کی موت دوسرے بھائی سے پوچھئے	درحال حضرت عباسؑ
۴۔	میں نخل ہند گلشن توصیف آل ہوں	درحال حضرت امام حسینؑ

سید علی اطہر جعفری اطہر

۱۹۰۰ء میں بمقام ڈیگ ریاست بھرت پور میں ولادت ہوئی۔
والد کا نام مقصود الحسن جعفری تھا جو صبر تخلص کرتے تھے نسیم امروہوی کے شاگرد

تھے ۱۹ اگست ۱۹۶۵ء میں اطہر نے بمقام کراچی انتقال کیا۔ ان کے مندرجہ ذیل مرثیے "گلدستۂ اطہر" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں:۔

۱۔ میں گیسوئے عروس ولا کا اسیر ہوں	درحال حضرت قاسمؑ
۲۔ راہِ عمل میں مشعل عرفاں ہیں پنجتنؑ	درحال حضرت امام حسینؑ
۳۔ میں شمع فروزِ حرم مدحِ علیؑ ہوں	درحال حضرت عباسؑ
۴۔ اے وارثہ دار خونِ شہیداں ظہور کر	درحال حضرت علی اصغرؑ
۵۔ بنتِ زہراؑ نے بھی کیا نورِ نظر پائے ہیں	درحال حضرات عون و محمد
۶۔ حق کی کنیز بنتِ پیمبر ہیں فاطمہؑ	نامکمل

سیّد باقر حسین زیدی باقر

والد کا نام سیّد صابر علی زیدی۔ تلمذ کا علم نہ ہو سکا۔ مراثی جو دستیاب ہوئے ان کے مطلع حاضر ہیں، انھوں نے بعض مرثیے ہندی زبان میں بھی تصنیف کئے ہیں۔

۱۔ اے طبع رسا اہل مودت کا بیاں ہو	درحال حضرت علی اکبرؑ
۲۔ عروس لیل کی چوٹی جو تا کمر آئی	درحال حضرات عون و محمدؑ
۳۔ اے قلم بحر تاسف کی روانی دکھلا	درحال حضرات عون و محمدؑ
۴۔ مخزن عقد مضامیں ہے گلستاں میرا	درحال حضرت حرؑ
۵۔ حرم رسول کے زنداں میں جب اسیر ہوئے	درحال اسیری اہلبیتؑ
۶۔ انقلابات کا مرکز دل عالم دیکھا	درحال حضرت امام حسینؑ
۷۔ عہد عروج جب تھا رسول انام کا	درحال حضرت امام حسینؑ
۸۔ طوبیٰ کی اک ڈار ہری ہو وا کی لکھنی بن کر آئے	بزبان ہندی
۹۔ چلی پُروا ہوا۔ آکاش میں پھرنے لگے بادل	بزبان ہندی

سید مصطفیٰ حسین رضوی بدرؔ

قصبہ پہرسر ریاست بھرت پور کے رہنے والے تھے لیکن ان کے آباواجداد نے مدت سے بھرتپور کو وطن قرار دے لیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے ۱۸ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے نسیم بھرتپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ریاست کے محکمہ جنگلات میں محافظ دفتر تھے۔ بدرؔ نے صرف دو مرثیے کہے ایک دستیاب ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

۱۔ شانۂ گیسوئے لیلائے طلاقت ہوں میں — درحال حضرت عباسؑ

سید علی ناصر جعفری تبسمؔ

والد کا نام سید امیر حسن جعفری اخترؔ پہرسری تبسم ۱۲ رجب ۱۳۳۹ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ کو ۳۸ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے دو مرثیے "اشک تبسم" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ ہاں اے زبانِ فکر فصاحت بیاں ہو آج — درحال حضرت علی اکبرؑ

۲۔ کر گیا نام وفا میں حرؑ غازی اپنا — درحال حضرت حرؑ

سید آل نبی جعفری ثمرؔ

والد کا نام سید وارث علی جعفری۔ حضرت نفیس لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ مراثی کے مطلع حاضر ہیں۔

۱۔ مجلس ماتم شبیر ہے جان اسلام — درحال حضرت امام حسینؑ

۲۔ ہزار شکر کہ منبر ہوا مقام مرا۔ — درحال حضرت علیؑ

سید محمد جعفری

والد کا نام سید محمد علی جعفری۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۵ء میں ریاست بھرتپور

کی مردم خیز بستی پیر سر میں پیدا ہوئے۔ شاداں بلگرامی کے شاگرد تھے۔ ۴ محرم ۱۳۹۶ھ میں بمقام کراچی انتقال کیا۔ اُن کا اصل فن طنز و مزاح تھا لیکن انھوں نے دو مرثیے بھی تصنیف کئے ہیں۔ صرف ایک مرثیہ دستیاب ہے۔

۱۔ سلام اس پر کہ جس نے لاج رکھ لی نوعِ انساں کی

مرزا حیدر حسین حیدر

والد کا نام مرزا عاشق حسین۔ حالات کا علم نہ ہو سکا اور نہ مرثیہ دستیاب ہے ایک مرثیہ کہا جو دستیاب نہ ہو سکا۔

سید حسن اکبر جعفری حسن

والد کا نام سید حامد حسین جعفری۔ شاعری میں ثمر بھرتپوری کے شاگرد تھے۔ حالات دستیاب نہیں ہیں۔ مراثی کے مطلع مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شاہدِ معنیٰ بستاں ہے فصاحت میری — درحال حضرت حرؑ
۲۔ شور ہے رن میں کہ عباسؑ علیؑ آتے ہیں — درحال حضرت عباسؑ
۳۔ فیضِ شبیر سے گلزارِ سخن ہے میرا — درحال حضرت قاسمؑ
۴۔ یارب ضیائے حسن امام مبیں دکھا — درحال حضرت عباسؑ
۵۔ لکھا ہے راویوں نے یہ احوال دل حزیں

سید موسیٰ رضا رضوی شاد

والد کا نام سید قاسم حسین رضوی۔ شاعری میں حضرت نسیم بھرتپوری سے تلمذ حاصل تھا۔ بھرت پور میں ولادت ہوئی کراچی میں انتقال ہوا۔

مراثی کے مطلع مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ میں ہوں اورنگ نشیں سر دیوان سخن — درحال حضرت عباسؑ

۲۔ حیدرؑ کا لال روح روانِ رسول ہے	در حال حضرت امام حسینؑ
۳۔ ضیائے مہر درخشاں کلام ہے میرا	در حال حضرت امام حسینؑ
۴۔ ثنائے حرؑ سے مزین ہے آفتاب سخن	در حال حضرت حرؑ
۵۔ نمک کان سخن ہے بخدا مدحت حرؑ	در حال حضرت حرؑ
۶۔ آئی ہے طبیعت میری پیلائے سخن پر	در حال حضرت قاسمؑ
۷۔ ملے ہیں حضرت زینبؑ کو خوش نصیب پسر	در حال حضرات عون و محمدؑ
۸۔ حسینؑ کا سفر آخری تمام ہوا	
۹۔ شاگرد کا شاگرد ہوں میں خلق میں گویا	
۱۰۔ آج پھر جلوہ رُخ نظم ضیا بار دکھا	

مرزا غضنفر حسین عروج

مرزا عباس حسین کے فرزند تھے غزل میں اپنے نانا ظہیر الدین ظہیر دہلوی شاگرد ذوق سے تلمذ تھا۔ مرثیہ میں میر علی محمد عارف لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ریاست بھرت پور میں ادبی خانوادہ میں ولادت ہوئی۔ عربی۔ فارسی اردو اور سنسکرت میں عبور حاصل تھا۔ علم عروض کے ماہر تھے ان کی تصانیف لاتعداد ہیں۔ تمام تصانیف قلمی ہیں۔ خطاطی کے ماہر تھے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف نادر مخطوطات ہیں۔

جب ریاست بھرت پور میں عدالتی زبان ہندی ہوئی تو ایک قصیدہ ہندی میں لکھ کر مہاراج کو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ کوئی بھی ریاست کا ہندو اس سے بہتر ہندی لکھ دے تو عدالتی زبان ہندی رکھو ورنہ اردو کر دو وہ قصیدہ ۱۹۴۶ء تک موتی محل میں آویزاں تھا۔ حکیم مرتضیٰ حسین الہ آبادی وحدانیت کے واحد لیکچرار تھے انہوں نے ایک شام عروج سے کہا کہ کچھ ہندو مذہب کے متعلق تفصیل سے بتائیے چنانچہ کہنا شروع کیا حتیٰ کہ نماز صبح کا وقت ہوگیا اور دونوں حضرات نماز میں مشغول ہوگئے،

بعد نماز مومنین کی موجودگی میں حکیم مرتضیٰ حسین صاحب نے فرمایا کہ آج سے میں عروج صاحب کو پنڈت کا خطاب دیتا ہوں ان کو اس مذہب کی اس قدر معلومات ہیں کہ کسی پنڈت کو بھی نہ ہوں گی۔

۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے کراچی پہنچے اور یہیں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی مشہور تصنیف "عروج المجالس" ہے جس کی دس جلدیں ہیں۔ کچھ جلدیں حجۃ الاسلام طالب جوہری کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ مراثی کے مطلع جات حسب ذیل ہیں۔

۱۔	زمزمہ سنج ہے پھر بلبل شیدائے حسینؑ	درحال حضرت عون و محمدؑ
۲۔	نغمہ پرداز ہے پھر بلبل بستان حسینؑ	درحال حضرات عون و محمدؑ
۳۔	کربلا میں جو نمایاں شب عاشور ہوئی	درحال حضرات عون و محمدؑ
۴۔	عالم افروز ہوا جب رخِ تابان سحر	درحال حضرت قاسمؑ
۵۔	ہے نشاں دین کا دنیا میں ثنائے عباسؑ	درحال حضرت عباسؑ
۶۔	یاد آتی ہے ضعیفی میں جوانی مجھ کو	درحال حضرت علی اکبرؑ
۷۔	سبق آموز زمانہ ہے وفاداری حرؑ	درحال حضرت حرؑ
۸۔	دن گذر کر جو نویں کا شب عاشور ہوئی	بیان شب عاشور
۹۔	مداح اہلبیتؑ رسول خدا ہوں میں	
۱۰۔	گلگونہ بہار چمن ہے سخن مرا	
۱۱۔	سدا بہار بنا ہے مرا ریاض سخن	
۱۲۔	جلوہ فگن ہوا جو رُخِ زرنگار صبح	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۳	پایا ہے شرف ہم نے بھی قسمت سے زیادہ	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۴۔	حسن تخلیق دو عالم ہے مشیت اس کی	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۵۔	جب طے کیا مدار فلک ماہتاب نے	جملہ شہدائے کربلا
۱۶۔	کربلا سے جو وطن میں شہ والا پہنچے	بحال زعفر جن

۱۷۔ داخل ہوئے جو اہلِ حرم ملکِ شام میں

۱۸۔ لوگ کہتے ہیں ترقی کا زمانہ ہے آج

سید اکرام حسین کلیم

سید اکرام حسین زیدی نام کلیم تخلص کرتے تھے ۱۸۸۴ء میں بمقام ریاست بھرت پور ولادت ہوئی۔ ان کے والد حکیم سید اصغر حسین زیدی بصیر تخلص کرتے تھے بصیر کا تمام کلام ضائع ہوگیا۔

کلیم فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکومت کے محکمہ عدلیہ سے منسلک ہوگئے اور ترکِ وطن تک وہیں رہے۔ نوعمری میں غزل گوئی شروع کی اور نسیم بھرت پوری شاگرد داغ دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

نہ صرف یہ کہ مرثیہ کہتے تھے پڑھتے بھی خوب تھے۔ آخر عمر میں صرف مدحِ اہلبیتؑ کو شعار بنایا۔

تمام عمر اپنے اور اپنے استاد نسیم بھرت پوری کے مراثی پڑھے۔ ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے پاکستان آئے اور یہیں کراچی میں ۱۳ جون ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ قبرستان ناظم آباد میں دفن ہیں۔ قیس فرخ آبادی نے تاریخ کہی۔

قصرِ جنت میں لے کے اے اکرام
تم نے پائے نگین باغ ارم

۱۳۷۴ھ

دو مرثیوں کے مطلعے دستیاب ہوئے حاضر ہیں۔

۱۔ سبق آموز زمانہ ہے وفائے عباسؑ

۲۔ آج پھر مائل مدحت ہے طبیعت میری

سید فضل رسول رضوی فضل

والد کا نام سید وزیر حسین رضوی۔ شاعری میں میرانیس لکھنوی کے

شاگرد تھے اور تمام عمر لکھنو میں گذری مراثی کے مطلع حسب ذیل ہیں نسیم بھرت پوری کے انتقال پر بھرت پور آئے اور ان کے ایصال ثواب کی مجلس میں مرثیہ پیش کیا۔

۱۔ فرمانروائے ملک سخن ہے زباں میری
۲۔ جب دشت کربلا میں شہ کربلا گرا — درحال حضرت امام حسینؑ
۳۔ بحر مواج بلاغت ہے طبیعت میری — درحال حضرت امام حسینؑ
۴۔ آئی ہے میرے باغ سخن میں بہار پھر — درحال حضرت امام حسینؑ
۵۔ زینت مجلس ماتم ہے فسانہ حرؑ کا — درحال حضرت حرؑ
۶۔ آمد ہے شاہزادہ زریں کلاہ کی — درحال حضرت علی اکبرؑ

سید حمید الحسن جعفری قتیلؔ

مولوی سید حمید الحسن میر باقر حسین کے صاحبزادے تھے اول شبر حسین نسیم سے اصلاح لی پھر مرزا داغ کے شاگرد ہوئے۔ مرثیہ گوئی میں نفیس لکھنوی سے تلمذ تھا۔ مرثیہ کہتے بھی تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے متعدد مراثی کہے مگر دستیاب نہیں ہیں اور نہ مطلع معلوم ہو سکے۔ ۶۔ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو جے پور میں وفات پائی تمام کلام ضائع ہو گیا۔

سید محمود الحسن جعفری محمودؔ

والد کا نام سید علی حسن جعفری
حالات کا علم نہ ہو سکا۔

۱۔ حمد خدا بہار ریاض سخن کی ہے — درحال حضرات عونؑ و محمدؑ

سید شبیر حسین نسیم

شبیر حسین نام۔ التماس حسین جعفری کے صاحبزادے تھے تحصیل علم مولوی سید محمد ساکن سونی پتی سے کی جو شاعری میں امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے ابتداء میں اصلاح لی بعد میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ مرثیہ گوئی میں میر نفیس سے تلمذ حاصل کیا۔ ان کی غزلوں کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔ مراثی جو دستیاب ہوئے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میں شانہ کش گیسوئے لیلائے سخن ہوں	درحال حضرات عون و محمدؑ
۲۔ جب بے چراغ مرقد خیر الوراء ہوا	پامال لاشہائے شہداء
۳۔ بہار باغ ارم ہے گل سخن میرا	درحال حضرت عباسؑ
۴۔ طرہ تاج فصاحت ہے طبیعت میری	درحال حضرت عباسؑ
۵۔ لے تیغ نظم آج تو کس بل دکھا مجھے	درحال حضرت علی اکبرؑ
۶۔ میں ہوں زینت دہ ایوان طلا کار سخن	درحال حضرت علی اکبرؑ
۷۔ عروس نظم دل افسردہ ہے کلام مرا	درحال حضرت قاسمؑ

بھرت پور کے مرثیہ نگار شعراء میں میرے علاوہ سید فرحت حسین جعفری ہیں جو فرحت تخلص کرتے ہیں ان کے والد سید اقبال حسین جعفری ہیں حسب ذیل مراثی کے مطلعے حاضر ہیں۔

۱۔ غار حرا کے فکر کی تجدید کربلا	درحال حضرت امام حسینؑ
۲۔ نام حسینؑ باعث تالیف قلب ہے	درحال حضرت امام حسینؑ
۳۔ بیج مٹی میں کرے صبر تو بن جائے حیات	درحال حضرت امام حسینؑ
۴۔ صبر و ثبات و عزم کی ہے جستجو مجھے	درحال حضرت علی اکبرؑ
۵۔ اللہ و غنی حضرت اکبرؑ کی جوانی	درحال حضرت علی اکبرؑ
۶۔ اُلٹا عروس فکر نے جب ذہن میں نقاب	درحال حضرت علی اصغرؑ

(۳۰)

فیض اور فن

عہدِ حاضر کے مرثیہ نگار

پروفیسر منظور حسین شور

دورِ حاضر کے پاکستانی مرثیہ نگاروں میں جناب فیض بھرت پوری کا نام نامی ہر چند محتاجِ تعارف نہیں، تاہم چونکہ اس خاص سمت میں فیض صاحب کا فکری سفر تیزی سے جاری ہے اس لئے وہ جس جس روش پر جس انداز سے اپنے نقشِ قدم چھوڑتے چلے جائیں گے، ان کے فن کی اندیابی ہر ادیب کیلئے ایک ایسا ادبی فرض ہو گی، جس کی ادائیگی کے بغیر کوئی ناقد "مرثیہ" کے ساتھ انصاف نہیں برت سکتا، ...

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فیض صاحب ایک پختہ نگار مرثیہ گو کی حیثیت سے شاعری کے اس تخلیقی عمل پر بھی بدرجۂ احسن دسترس رکھتے ہیں، جس کو ادب کی عام زبان میں "موضوعاتی شاعری" کہا جاتا ہے ..."

صنائعِ شعر میں کامیابی کے لیے [illegible]

کا سب سے زیادہ گراں سنگ ہونا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح "مرثیے" کی صنف میں، مرثیے کا کوئی بند اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا، جب تک ہر بند کے آخری بیت کے دونوں مصرعے اتنے توانا ہوں، کہ وہ پورے بند کے بوجھ کو سنبھال لیں، فیض بھرت پوری اس نکتے کے رمز سے بخوبی آشنا معلوم ہوتے ہیں، اُن کے مرثیوں کی ہر آخری بیت اتنی توانا ہوتی ہے کہ ہر بند کے پورے وزن کو ذمہ داری کے ساتھ سنبھال لیتی ہے، اور اس بے تکلفی کے ساتھ اس مقام سے وہ گزر جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کی فکر کی سرعتِ انتقال پر حیرت ہوتی ہے، اس نوعیت کی مثالوں سے اُن کے مرثیے مالا مال ہیں، لیکن ایک خاص موضوع کے متعلق کسی بند کے آخری بیت میں اس فصاحت کے ساتھ ایسا مصرعہ بے ساختہ کہہ جانا کہ ع

وہ ہر قدم پہ ہے ماضی یہ حال ہے گویا

یا

تمام عمر کا گویا نچوڑ ہوتا ہے

یہ فکر و فن کے اظہار کا وہ قرینہ ہے، جس سے صاحبِ فن کی فنی تخلیق اُس کی انفرادیت پر روشنی پڑتی ہے۔

وہ واقعات نگاری میں جہاں محاکات سے کام لیتے ہیں، وہاں زبان کی فصاحت اور بیان کی سادگی میں بڑی نشریت کارفرما ہوتی ہے،

محاکات میں "مرئی" چیزوں کی کامیاب تصویرکشی صرف اُن ہی لوگوں کا حصّہ ہوتی ہے، جو میدانِ فن کے چابک سوار ہوتے ہیں، لیکن جذبات کو محاکات میں ڈھال دینا اس سے بھی زیادہ دشوار امر ہوتا

ہے۔ فیض بھرت پوری مرثیہ نگاری کے اس انتہائی نازک اور دشوار گزار مرحلے سے بھی بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔۔۔

یہ فیض صاحب کے فنِ شعور کا وہ تعمیری زاویۂ نظر ہے جو اُن کی فکر کے انفرادی حدود کو عالم گیر انسانیت کے اُن حدود سے ملا دیتا ہے، جن میں صرف کوئی مخصوص فرقہ ہی نہیں بستا، بلکہ بلا قیدِ نسل و رنگ، ساری قومیں بستی ہیں، اور اگر چہ پوچھا جائے تو مرثیہ نگار کے تفکر کی یہی وہ جامعیت ہے جو مرثیہ کو اخلاق کی تربیت اور نفس کی شرافت کا بہترین لٹریچر بنا دیتی ہے۔۔۔

فیض بھرت پوری اس اعتبار سے بڑے کامیاب اور ادب آفرین صاحبِ فن ہیں۔ اُن کے یہاں مطالب کی صحت اور فکری توازن کے ساتھ زبان کی سادگی اور بیان کا جو بے ساختہ پن ملتا ہے وہی اُن کے شعور کی پختگی اور فکر کی بلوغت کا ایسا جوہر ہے جو اُن کو معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت سے مشخص کرنے کے لیے کافی ہے۔

حجۃ الاسلام طالب جوہری

جناب فیض بھرتپوری نے مرثیہ گوئی کا آغاز اس وقت شہر کراچی میں کیا جب کہ یہاں لکھنو اور عظیم آباد کے بعد تیسرا مرثیہ کا بڑا دبستان قائم ہو چکا تھا۔ یہاں کلاسیکی مرثیہ کا ذوق بھی باقی ہے اور جدید مرثیہ کے اثرات بھی موثر ہیں اس لئے یہاں وہی شاعر

زیادہ مقبول رہے ہیں جنہوں نے ان دونوں مکاتب کے مطالبات کو ملحوظ رکھا ہے ۔
جناب فیض نے رنگِ قدیم میں رنگِ جدید کی آمیزش بہت احتیاط اور ہنرمندی کے ساتھ کی ہے ۔ ۔ ۔

جناب فیض کے زیادہ تر مرثیے بیانیہ ہیں سوائے ایک مرثیے کے جو پانی کے موضوع پر کہا گیا ہے اور جو اس صنف سخن سے مماثلت رکھتا ہے جسے اب اصطلاحاً بعض حضرات مسدس کہتے ہیں۔ پانی کی جو اہمیت واقعۂ کربلا کے سیاق و سباق میں ہے اس نے اسے ایک بہت نمایاں موضوع بنا دیا ہے چنانچہ فیض صاحب کے علاوہ جناب جوش ملیح آبادی، مرحوم راجہ صاحب محمود آباد اور جناب نسیم امروہوی نے اس موضوع پر مستقل مراثی کہے ہیں ۔ ۔ ۔

پانی چونکہ عناصر فطرت میں ہے اس لئے پانی سے متعلق شاعری میں منظر نگاری کا وسیع حصہ رہا ہے ۔ فطری مناظر کی کیفیت کو اجاگر کرنے میں فیض صاحب نے زبان کی ملائمت، لوچ اور نزاکت سب سے کام لے کر ایسے مرقعے پیش کئے ہیں ۔
گریز کا بے ساختہ پن بھی لائق داد ہے :

اتنی افراط سے دنیا میں ہے آیا پانی
پھر بھی احمد کے نواسے نے نہ پایا پانی

جناب فیض نے رزم کے گوشوں پر خاص توجہ دی ہے ۔ گرچہ فی زمانہ یہی وہ گوشہ ہے جس سے شعراء عموماً گریز کرتے ہیں ۔ ۔ ۔
فیض صاحب کی زبان رواں ہے اور خطابت مطلق نہیں ہے ۔ رجز کے مواقع پر بھی مفرس اور پرشکوہ ترکیبوں سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ سادگی و پرکاری کے لئے ملائم الفاظ کے کشیدہ اصوات سے گونج کی کیفیت پیدا کی گئی ہے ۔ ۔ ۔

جناب فیض کی مرثیہ نگاری مسلسل عمل ارتقاء میں مصروف ہے اور مجھے یقین ہے کہ دائمی اور عصری تقاضوں کو انہوں نے جس انداز سے ملحوظ رکھا ہے وہ ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا باعث ہوگی ۔

کلام فیض بھرتپوری

(۴)

حضرت فیض بھرتپوری نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس یادگاری مجلہ میں نعت، منقبت، قصیدہ، نوحہ، سلام، نظم، قطعہ، مرثیہ اور غزل سے ان کی تخلیقات کا انتخاب بطورِ نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارۂ فیضِ ادب، کراچی کے زیرِ اہتمام حضرت فیض بھرتپوری کا غیر مطبوعہ کلام کتابی شکل میں زیرِ اشاعت ہے۔ یہ ادارہ مذکورہ کلام کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی شائع کرے گا۔

کعبہ

خدائے عزّوجل کا مکان ہے کعبہ — زمیں پر ہے مگر آسمان ہے کعبہ
بنائے دستِ خلیلؑ، خشتِ اول تہذیب — بشر کے واسطے پہلا مکان ہے کعبہ
یہ چشمۂ برکت بھی ہے اور ہدایت بھی — حیات و مرگ میں انساں کی جان ہے کعبہ
یہ معجزہ نہ سمجھئے تو اور کیا ہے کہیے — کہ سب سے پیر ہے اور پھر جوان ہے کعبہ
بنا گئے ہیں خلیلؑ و ذبیحؑ ایسے معمار — وہ خاص خلت و ہمت کی شان ہے کعبہ
یہ آنے والوں کو دعوت ہے طہارت کی — خلیلؑ پاک کی گویا زبان ہے کعبہ
زمیں کی ناف اور عبدِ مناف کی میراث — جہاں کی شان، محمدؐ کی آن ہے کعبہ

جو بتکدہ تھا بنو جُرہُم و خزاعہ کا
وہ اب شکستِ بتاں کا نشان ہے کعبہ

یہیں علیؑ، سرِ دوشِ نبیؐ نظر آئے
زمین کے مہ و خور کا قران ہے کعبہ

خدا نے جس کی قسم کھائی ہے ز روئے شرف
قسم خدا کی وہی آستان ہے کعبہ

وہ والد اور ولد بھی ہیں اس قسم میں شریک
جو شانِ کعبہ ہیں اور ان کی شان ہے کعبہ

علیؑ ہوں یا کہ محمدؐ، خلیلؑ ہوں کہ ذبیحؑ
بجائے خود بھی تو یہ خاندان ہے کعبہ

بڑا مزہ ہے یہاں حج میں ترکِ لذت کا
عجیب نعمتِ عقبیٰ کا خوان ہے کعبہ

صمیمِ قلب سے آ، جنسِ معرفت لے لے
خلوصِ دل کا بڑا قدردان ہے کعبہ

شکار جس کی حدوں میں ہے منع، جنگ حرام
وہ جائے امن، وہ دار الامان ہے کعبہ

ضمیر کانپ اٹھے ہو یہاں جو عزمِ گناہ
خود اپنی اس عظمت کا بیان ہے کعبہ

گدا و شاہ کا جس میں لباس تک یکساں
حقوقِ ناس کا وہ پاسبان ہے کعبہ

رجوعِ قلب سے جب رخ کیا، سکون ملا
دلِ ضعیف کی تاب اور توان ہے کعبہ

خدا کا گھر اسے کہتے ہیں جب تو حق یہ ہے
مکان کا ہے کہ جو ہے لامکان ہے کعبہ

بہت گراں ہے جو تطہیرِ نفس کا سودا
اس ایک جنس کی سستی دکان ہے کعبہ

نبیؐ کا قبلہ، ید اللہ کا زچہ خانہ
بس اب میں کیا کہوں کس کا مکان ہے کعبہ

دفورِ درد میں کیوں مضطرب ہو بنتِ اسد
یہاں تو آؤ، تمہارا مکان ہے کعبہ

خلیلؑ آپ کی محنت بروئے کار آئے
کہ میہماں ہیں علیؑ، میزبان ہے کعبہ

امینِ عقدہ کشائی کی ہے ولادت گاہ
اسی سبب سے تو دار الامان ہے کعبہ

اگر یہ چرخ پہ ہوتا، نہ جانے کیا ہوتا
زمیں پہ ہو کے بھی جنت نشان ہے کعبہ

جہاں سے چل کے پڑے ٹھیک زد پہ تیرِ دعا
خدا شناس کی ایسی کمان ہے کعبہ

خلاف سب جسے کہتے ہیں، یہ غلط نہیں
سفینۂ آلِ نبیؐ، بادبان ہے کعبہ

[illegible] سے فیضِ حق، مشعلِ اہلِ عزا
[illegible] ماتمِ شہؑ کا نشان ہے کعبہ

نعتِ رسولؐ

○

مرکزِ حسن ہے محبوبِ خدا کا چہرہ
کیوں اڑا دے نہ بھلا کفر کا خاکہ چہرہ

جس کو آیا نہ نظر لطف و عطا کا چہرہ
کیسے دیکھے گا وہ اس ماہ لقا کا چہرہ

خود بخود پائے مبارک پہ جھکی پیشانی
نظر آیا ہے جونہی شاہ ھدیٰ کا چہرہ

یہ علمدارِ مساوات ہیں خالق کی قسم
ایک ہے ان ؐ کے لئے شاہ و گدا کا چہرہ

نئے مضموں جو ملے نعت پیمبرؐ کے لئے
اور بشاش ہوا فکرِ رسا کا چہرہ

ہوں میں مشغولِ عبادت بخدا آٹھ پہر
میری نظروں میں ہے محبوبِ خدا کا چہرہ

تابِ نظارۂ محبوبِ خدا مشکل تھی
میں نے وزدیدہ نظر ڈال کے تاکا چہرہ

وہ جسے رحمتِ کونین سے اخلاص نہیں
وہ ہی دیکھے گا سدا رنج و بلا کا چہرہ

بخدا رحمتِ کونین سخی تھے ایسے
ہل اتیٰ دیکھتی تھی ان کی عطا کا چہرہ

حسنِ کونین نگاہوں سے ابھی گر جائے
گر کوئی دیکھ لے ان کے کفِ پا کا چہرہ

وصف مخصوص ہے ان کے لئے معراج کی شب
دیکھ کر آئے ہیں یہ عرشِ علیٰ کا چہرہ

جس پہ پڑھتے ہیں سدا خالق و مخلوق درود
وہ فقط ایک ہے محبوبِ خدا کا چہرہ

اب بھٹک سکتا نہیں منزلِ مقصود سے میں
دیکھ کر آیا ہوں اس راہ نما کا چہرہ

یاد آجاتے ہیں عباسؑ علمدار مجھے
دیکھتا ہوں جو تصور میں وفا کا چہرہ

فیض کے واسطے وا کر دیئے بابِ فردوس
دیکھا رضواں نے جو ہی مدح سرا کا چہرہ!

فخر سے اونچا ہے اسلام کا سر آج کی رات
کفر و الحاد ہوئے زیر و زبر آج کی رات

چارہ گر سب برکت یہ شب معراج کی ہے
خود بخود بیٹھ گیا درد جگر آج کی رات

مومنین خوش ہیں کہ محبوب خدا لائیں گے
اپنی امت کی شفاعت کی خبر آج کی رات

فرش پر ڈھونڈنے والے یہ ہے معراج کی شب
مصطفیٰ عرش پہ آئیں گے نظر آج کی رات

کوئی شب اس سے فضیلت میں نہیں ہے بڑھ کر
عبد و معبود ہوئے شیر و شکر آج کی رات

سرخرو ہو گیا اسلام ابد تک کے لئے
کفر نے ڈال دی شمشیر و سپر آج کی رات

قطعہ بند

اس میں ہے عیب کلف اور بھی [illegible]
یہ نہ کہئے کہ یہ ہیں مثل قمر آج کی رات
نور میں عیب نہیں، نور مکمل ہے یہی نور کا
نور ہی آتا ہے ہر سمت نظر آج کی رات

کچھ طلب سے بھی سوا مل گئے الطاف [illegible]
ہم نے دیکھا یہ دعاؤں کا اثر آج کی رات

نعتِ رسولؐ

○

سچ بات تو یہ ہے عالم میں بندہ کوئی ایسا ہو نہ سکا
کونین کی رحمت ہو نہ سکا، محبوب خدا کا ہو نہ سکا

مابعد ہر اک پیغمبرؑ کے، یہ آئے بظاہر دنیا میں
اس پر بھی وقار و عظمت میں ہمسر کوئی ان کا ہو نہ سکا

واللیل نبیؐ کی زلفیں تھیں، والشمس تھی صورت احمدؐ کی
لاکھوں ہی پیمبرؑ آئے مگر ان کا سا سراپا ہو نہ سکا

نعلین کو پہنے پہنچے یہ جس وقت کہ عرشِ اعظم پر
اک شور ملائک میں یہ ہوا ہمسر کوئی ان کا ہو نہ سکا

یہ نورِ خدا تھے سر تا پا اور نور مبرا وزن سے ہے
یوں نقشِ کفِ پا گیتی پر احمدؐ کا ہویدا ہو نہ سکا

معراج کی شب میں خالق نے جب عرش پہ انکو بلوایا
وہ راز فلک کا کون سا تھا جو ان پہ ہویدا ہو نہ سکا

لاکھوں ہی پیمبرؑ بھیجے ہیں قدرت نے بنا کر دنیا میں
نبیوں میں مگر کوئی بھی نبی محبوبِ خدا سا ہو نہ سکا

ہر چیز وہی تھی پیشِ نظر پہلے کی جو دیکھی بھالی تھی
معراج کی شب بھی میرا نبیؐ مسحورِ نظارا ہو نہ سکا

محبوبِ خدا تھے پیغمبرؐ اور آل سے ان کو الفت تھی
جیسے کہ نواسے تھے ان کے فرزند کسی کا ہو نہ سکا

ایک نور کے یہ دو ٹکڑے تھے، محبوبِ خدا ؐ اور دستِ خدا ؑ
جز حیدرؑ صفدر کوئی بھی، داماد نبی ؐ کا ہو نہ سکا

تکمیل کو دیں کی خالق نے مخصوص تمام خُم کو کیا
یہ فخر اسی کو حاصل ہے اعلان کسی جا ہو نہ سکا

ہاں مہدیٔ دیں کے قدموں سے یہ فخر رہے گا تا بہ ابد
تا حشر امامت جس کی رہے مرسل کوئی ایسا ہو نہ سکا

یہ وجہ وجودِ عالم ہیں ان سے ہی قیام دنیا ہے
اے فیضیؔ یہی وہ بندہ ہے ثانی کوئی جس کا ہو نہ سکا

وہ شورِ ختمِ نبوت کا دو جہاں میں ہے
جواب جس کا زمیں پر نہ آسماں میں ہے

بغور پڑھ تو سہی منکرِ وقارِ رسول ؐ
ہر ایک آیۂ قرآں ان ہی کی شان میں ہے

پھر اور کیا ہے نہیں گر یہ خوبیٔ کردار
کہ غیر ہو کے بھی سلمان خاندان میں ہے

خدا کی حمد ہے، نعتِ نبی ؐ، علی ؑ کی ثنا
ہر ایک چیز مرے دل کی اس دکان میں ہے

خدا بھی پڑھتا ہے ان پر درود، بندے بھی
ان ہی کا ذکر ہے جاری جو دو جہاں میں ہے

نبی ﷺ کی نعت میں پڑھتا ہوں جب بھی بخدا
اسی سبب سے کشش میرے ہر بیان میں ہے

جو چاہوں موڑ دوں رُخ گردشِ زمانہ کا
کہ نعت گوئی سے اتنا اثر زبان میں ہے

بشر نبی ﷺ کو تو کہتا ہے بے بصر کی طرح
کسی کا ذکر نبی ﷺ کی طرح اذاں میں ہے؟

یہ دیکھ آ کے ابھی جا کے منزلِ معراج
بلا کا زور مری فکر کی اڑان میں ہے

یہ سنگریزوں کو دیتے ہیں قوتِ گفتار
عدو ہے وصفِ پیمبر ﷺ تو کس گمان میں ہے

فقط عقیدہ نہیں فیضی یہ حقیقت ہے
جو آستانِ پیمبر ﷺ پہ ہے اماں میں ہے

جس نے بھی پیا بادۂ عرفانِ محمد ﷺ
وہ ہو کے رہا خلق میں سلطانِ محمد ﷺ

کہنے کو ہے اللہ کا بھیجا ہوا لیکن
قرآن حقیقت میں ہے قرآنِ محمد ﷺ

پہچاننا ہے حق کو تو پہچانو نبی ﷺ کو
اللہ کا عرفان ہے عرفانِ محمد ﷺ

محشر کا انہیں خوف نہ دوزخ کا ہے کھٹکا
جو ہو گئے وابستۂ دامانِ محمدؐ

پہنچے معہ نعلین سرِ عرش پیمبرؐ
اے منکرِ اوصاف یہ ہے شانِ محمدؐ

کہنے لگے رضوان سے مَلک دیکھ کر ہٹو
جانے دو، یہ ہے فیضِ ثنا خوانِ محمدؐ

مَلک کیوں نہ ہوں مدح خوانِ محمدؐ
سرِ عرش دیکھی ہے شانِ محمدؐ

سرِ بزم ہوں نعت خوانِ محمدؐ
درود اب پڑھیں عاشقانِ محمدؐ

ہے ہر وقت لب پر کلامِ الٰہی
زبانِ خدا ہے زبانِ محمدؐ

یہ نعلین پہنے سرِ عرش پہنچے
نمایاں ہے اس سے ہی شانِ محمدؐ

حبیبِ خداؐ ہیں، یہ محبوبِ ربؐ ہیں
مَلک کیوں نہ ہوں پاسبانِ محمدؐ

وہؑ پہنچے فلک پر، یہؑ دوشِ نبیؐ پر
یہ شانِ علیؑ ہے، وہ شانِ محمدؐ

ہے لے دے کے اب تو یہی دل کی خواہش
جبیں سے مَلوں آستانِ محمدؐ

علیؑ، فاطمہؑ اور شبیرؑ و شبرؑ
یہی ہیں فقط رازدانِ محمدؐ

علیؑ ہیں وصی بعد میرے یہ سن لو
یہ کہتی ہے خُم میں لسانِ محمدؐ

علومِ نبیؐ یوں لیے جا رہے ہیں
علیؑ چوستے ہیں زبانِ محمدؐ

فقط فرق ہے عبد و معبود کا،
جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ

سرِ طورِ موسیٰؑ، سرِ عرش احمدؐ
وہ ہے شانِ موسیٰؑ، یہ شانِ محمدؐ

یہ بیدار بختی ہے فرشِ نبیؐ پر
علیؑ سو رہے ہیں یہ شانِ محمدؐ

حقیقت ہے اے فیضؔ قرآں کی اتنی
کلامِ خدا ہے، زبانِ محمدؐ

نعت

سیدفرزندِ حسن زیدی فیض بھرتپوری

○

بصد جان و دل ہوں نثارِ مدینہ — اگر دیکھ لوں میں دیارِ مدینہ
کہاں تک بیاں ہو وقارِ مدینہ — گیا عرش پر تاجدارِ مدینہ
چمن پھر چمن ہے یہ صحرا کی رفعت — ہے رشکِ چمن خارزارِ مدینہ
حقیقت میں ہے سرمۂ چشمِ مومن — جسے کہہ رہے ہو غبارِ مدینہ
سکون دل کو ملتا ہے اس سرزمیں پر — رہِ خلد ہے رہگزارِ مدینہ
زمانے کی شاہی ہے ٹھوکر میں ان کی — ہے اس شان کا تاجدارِ مدینہ
شہنشاہ اس جا جھکاتے ہیں سر کو — یہ ہے منکرو اقتدارِ مدینہ
یہ نعلین پہنے، سرِ عرش پہنچے — یہ ہے رفعتِ تاجدارِ مدینہ
بلا لیجئے اپنے روضہ پہ مولا! — کہاں تک کروں انتظارِ مدینہ
سرِ طورِ موسیٰؑ، سرِ عرش احمدؐ — یہ ہے رفعتِ تاجدارِ مدینہ
شہنشاہِ کون و مکاں ہیں محمدؐ — نہیں یہ فقط تاجدارِ مدینہ
دعا ہے زیارت بہ فیضِ خدا ہو — ہے جس جس کا دل بیقرارِ مدینہ

○

منقبت در شان جناب بی بی خدیجہؑ

کچھ کم جو ہوئی یورشِ آلام کی شدت — آمادہ ہوئی مدحِ خدیجہ پہ طبیعت
قرطاس پہ رکتی نہیں خامے کی روانی — پھر اور بڑھا کیا ہے۔ جو نہیں حسنِ عقیدت
بے زر کوئی تحریک نہیں چلتی جہاں میں — تبلیغ ہوئی۔ انکی ہی دولت کی بدولت
سرِ وقت ہی ہیں خدمتِ محبوبِ خدا میں — پچیس برس ان پہ رہا سایۂ رحمت
شکوہ کبھی فاقوں کا زباں پہ نہیں لائیں — کس درجہ تھیں شائستۂ آدابِ محبت
تھے لازم و ملزوم۔ نبیؐ اور خدیجہ — وہ انکی ضرورت تھے تو یہ اُن کی ضرورت
اوروں کی طرح گھر سے نہ نکلیں کبھی از خود — اس درجہ تھیں یہ پیروِ احکامِ شریعت
اک طرح سے محبوبِ خدا باپ ہیں سب کے — حق ہے جو کہا جائے انہیں مادرِ اُمت
گنجینۂ عصمت تھی ملی اِن کو وہ دختر — جو طاہرہ تھی آیۂ تطہیر کی صورت
ہر آن رہے الفتِ اولادِ خدیجہ — کرنا ہے اگر تم کو ادا اجرِ رسالت
یہ آنکھ پہر دیکھتی تھی روئے پیمبر — یہ جملہ عبادات سے افضل ہے عبادت
اس بی بی کا شوہر ہے یا... فاطمہ دختر — وہ شافعِ امت ہیں۔ یہ خاتونِ قیامت
اب اس کے سوا مدحِ خدیجہ میں کہوں کیا — یہ اسکی ہیں ہمراز۔ جو ہے شافعِ امت
ان کی ہی نواسی تھی وہ۔ جس کشتۂ غم نے — خطبوں سے ہلا ڈالی تھی کوفے کی حکومت
نانی ہیں یہ سردارِ جوانانِ جناں کی — وا ان کے لئے آٹھوں پہر ہے درِ جنت
کرتے تھے بیاں بیویوں سے مدحِ پیمبر — جس وقت ستاتی تھی خدیجہ کی محبت
اس مادرِ خوش ذات کو کیا آپ کہیں گے — ہے پارۂ دل جس کا کہ خاتونِ قیامت
زر دے کے غریبوں کو یہ خود ہو گئیں مفلس — یہ دولتِ ایثار تھی دولت کی بدولت
محبوبِ خدا اُس کو نہ محبوب رکھیں گے — جس کو نہیں اولادِ خدیجہ سے محبت

مقبول دعا خیقق کی فرمائیے بی بی
تا عمر نظر آئے نہ افلاس کی صورت

منقبت

در مدح جناب فاطمہ زہراؑ

مرکز تطہیر ہیں۔ جانِ طہارت فاطمہؑ
گود میں تیس کی ہیں۔ قرآں کی صورت فاطمہؑ

اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا کسی کا بھی شرف
رحمتِ کونین کی ہیں وجہِ راحت فاطمہ

شانِ زہراؑ میں حقیقت میں ہے یہ محکم حدیث
یعنی محبوبِ خدا کی ہیں بضاعت فاطمہؑ

تھا توکل۔ درحقیقت۔ نقطۂ معراج پر
مطمئن تھیں۔ فقر و فاقہ میں نہایت فاطمہؑ

اس سے روشن ہے جہاں پر باپ بیٹی کا وقار
ہیں نبی رحمت تو ہیں رحمت کی صورت فاطمہؑ

باپ ختم المرسلیں۔ شوہر وصی۔ بیٹے امام
ان فضائل میں ہیں یکتا درحقیقت فاطمہؑ

بات جو کہہ دی۔ وہی پوری بحکمِ حق ہوئی
سچ تو یہ ہے فیض ہیں منشائے قدرت فاطمہؑ

منقبت

در شانِ امام حسن علیہ السلام

فیضؔ یاں مدحِ حسنؑ کو مائلِ تحریر ہے
اس طرف جاری جناں میں قصر کی تعمیر ہے

مصطفےٰؐ آئینہ ہیں حسنِ حسنؑ تنویر ہے
یا یہ کہہ لیجئے وہ قرآن اور یہ تفسیر ہے

میں ہر اک مسلم نما کافر کو کرتا بے نقاب
کیا کروں، خلقِ حسنؑ کی پاؤں میں زنجیر ہے

انبیا کے وصف ان میں بھی ہیں مثلِ مرتضےٰؑ
خلقِ پیغمبرؐ کی یہ منہ بولتی تصویر ہے

ہیں براہِ راست، پہلے جانشینِ مرتضےٰؑ
کوئی ایسا بھی جہاں میں صاحبِ توقیر ہے

صنعتِ تجنیسِ خطی۔ اس کو کہتے ہیں عوام
حسنؑ پڑھ جاتے ہیں اکثر۔ گو حسنؑ تحریر ہے

کس لئے چارہ گر و منت کشِ درماں ہوں میں
خاکِ پائے مجتبےٰؑ میرے لئے اکسیر ہے

لاش پر تیروں کی بارش ہو گئی معصومؑ کی
یہ تو بتلائے کوئی۔ کس جرم کی تعذیر ہے

اس کے قبضے میں عنانِ گردشِ دوراں ہے فیضؔ
صدقِ دل سے جو غلامِ شبرؑ و شبیرؑ ہے

منقبت در امام حسینؑ علیہ السلام

یہ پوچھتا ہے تیسری شعباں کی سحر سے　　ایسا کوئی مولود بھی گزرا ہے نظر سے
شبیر کے شیدائی گزرتے ہیں جدھر سے　　بو گلشن فردوس کی آتی ہے ادھر سے
الفت ہے جنہیں فاتح خیبر کے پسر سے　　مانندِ ابوذر انہیں نفرت رہی زر سے
اٹھا کوئی بدبخت جو شبیرؑ کے در سے　　گر جائے گا واللہ دو عالم کی نظر سے
اشکوں کی جھڑی غم میں لگی دیدہ تر سے　　دل خوش ہوا ابر فلک برسے نہ برسے
شبیرؑ مع اہل حرم نکلے جو گھر سے　　نظریں رہیں انجام پہ آغاز سفر سے
بندش ہو اگر۔ رسمِ عزائے شہِ دیں پر　　مومن نکل آتے ہیں کفن باندھ کے سر سے
میں پیرو اخلاقِ حسینی ہوں سراسر　　دشمن کو بھی دیکھا تو محبت کی نظر سے
مل جائے گا کچھ وسعت دامن سے زیادہ　　مانگو تو ذرا فاطمہ زہراؑ کے پسر سے
کس طرح پسِ مرگ رہا کرتے ہیں زندہ　　دنیا کو ملا درس یہ شبیرؑ کے در سے
ہے عیبِ کلف ماہ میں یہ جو ہیں پاک　　نسبت نہ انہیں دیجئے للہ قمر سے
پڑھنے کے لئے آ گیا فردوس سے رضواں　　لکھی جو ثنا شاہ کی جبریل کے پر سے
شبیر کو بیٹھا ہوا دیکھا جو ملک نے　　دیکھا کئے صورت مری دزدیدہ نظر سے
ہاں ڈوب کے خود اپنے لہو میں شہِ دیں نے　　اسلام کی کشتی کو نکالا ہے بھنور سے
قدرت مجھے حاصل ہے ہر اک صنفِ سخن پر　　یہ بات تو پوشیدہ نہیں اہلِ نظر سے
لیتے ہی قلم ہاتھ میں لکھتا ہوں قصیدہ　　یہ قوتِ گویائی ملی علم کے در سے

میں پنجتن پاک کا کہتا ہوں قصیدہ
یہ فیض ملا فیض مجھے علم کے در سے

منقبت در شان جناب ثانیٔ زہراؑ

خیال رکھتے تھے اتنا امام زینبؑ کا   بوقتِ ذبح بھی تھا لب پہ نام زینبؑ کا
ابھی تو کرنا ہے شام اور کوفے کو   حسینؑ سے بھی کچھ آگے ہے کام زینبؑ کا
بھلا ہی دیتا زمانہ شہادتِ شبیرؑ   جو شہر شہر نہ جاتا پیام زینبؑ کا
امامِ وقت کو جلتے خیام سے لائیں   یہ حوصلہ تھا فقط تشنہ کام زینبؑ کا
وہیں وہیں پہ ہے قائم عزائے سبطِ نبیؐ   جہاں جہاں بھی گیا ہے پیام زینبؑ کا
وہ ضرب صبر لگائی کہ بے نقاب ہوا   جہاد دیکھ لیا میرِ شام زینبؑ کا
یزید تختِ حکومت کی ہل گئیں چولیں   ہوا نہ تھا ابھی خطبہ تمام زینبؑ کا
ہو صبر و ضبط کی معراج ابتلا میں نصیب   رہے جو صبح و مسا لب پہ نام زینبؑ کا
نہ تھی۔ نہ حشر تلک ایسی صابرہ ہوگی   رقم ہے برسرِ فہرست نام زینبؑ کا
ذلیل خطبوں سے تجھ کو کیا سرِ دربار   یزید دیکھ لیا انتقام زینبؑ کا
شہادتوں کو یہ زندہ رکھیں گی تا محشر   حسین کرتے تھے یوں احترام زینبؑ کا
نبیؐ کی آل کو پیاسا شہید کر ڈالا   پیام اب بھی ہے دنیا میں عام زینبؑ کا
حبیبؑ نصرتِ شبیر کے تصدق میں   خوشا نصیب کہ آیا سلام زینبؑ کا

قصیدہ اُن کا جو میں نے پڑھا تو قبر سے فیض
فرشتے چل دیئے سنتے ہی نام زینبؑ کا

قصیدہ در مدح حضرت علیؑ ابنِ ابی طالبؑ

چلے تھے آج ہم اچھی گھڑی کے ساقیا گھر سے
ہوئی مڈبھیڑ آتے ہی یہاں مینا و ساغر سے

ہیں بادہ خوار، پیمانہ بکف، مشغولِ مے نوشی
اٹھا رکھا ہے میخانے کو سر پہ ذکرِ حیدر سے

ملائک شکل انساں میں ہیں۔ پیمانہ بکف حاضر
شمیمِ خلد مہکی ہے۔ ہر اک کے جسم اطہر سے

طبیعت سیر ہونے پر، سرِ عرش بریں جا کر
کیا آگاہ سب کو اس نویدِ روح پرور سے

ہوئے ہیں خانۂ حق میں۔ علیؑ مرتضےٰ پیدا
جونہی پہونچی خبر یہ عرش پر اللہ کے گھر سے

کیا سامان فراہم تہنیت کا پھر تو رضواں نے
لئے گل باغِ جنت سے تو دھوئے آبِ کوثر سے

چنے کچھ کشتیوں میں تحفۂ خوش رنگ منگوا کر
ستارے چرخ سے، بو گل سے اور گوہر سمندر سے

مناسب جو بھی سمجھا لے لیا اس نے اسی شے کو
اجالا شمس سے اور چاندنی ماہِ منور سے

پئے نازک بدن۔ نازک سے نازک چن لئے تحفے
نزاکت گل سے شوخی حسن سے، بو مشک و عنبر سے

کئے پھر منتخب گلہائے رنگیں، بہر گلدستہ
لکھا نام علیؑ مرتضےٰ، جبریلؑ کے پر سے
چلا بیساختہ سوئے زمیں، شوقِ زیارت میں
پہنچتے ہی جبیں کو کر لیا مس پائے حیدرؑ سے
گذارش دست بستہ کی ابوطالب کی خدمت میں
مبارکباد کو آیا ہے خادم عرشِ داور سے
پئے اسپند رکھ کر آتشِ گل پرستاروں کو
کہا یارب بچانا اس کو چشمِ فتنہ پرور سے
کہاں رضواں، کہاں میں، عشق لیکن عشق ہے پھر بھی
تصور ہو گیا بے چین شوقِ دید حیدرؑ سے
نہ تھا شایاں جو خالی ہاتھ بہر تہنیت جانا
چلا میں نقد جاں لے کر، مبارکباد کو گھر سے
نظر ملتے ہی سر کو رکھ دیا پائے مبارک پر
سخی نے بھر دیا دامن کو میرے لعل و گوہر سے
کلیم و طور کا نقشہ ابھی آنکھوں میں پھر جائے
ہٹا کر دیکھئے دامن ذرا روئے منور سے
خوشی سے ان کا ننھا سا کلیجہ پھول جاتا تھا
نبیؐ کی گود میں آتے تھے جب آغوش مادر سے
نظر بنتِ اسد کی، دو قدم آگے ہی رہتی تھی
ذرا یہ گھٹنیوں چل کر نکل جاتے تھے جب گھر سے

انہیں کی شان میں قرآنِ صامت اک قصیدہ ہے
مدارج پوچھنے ہیں ان کے گر، پوچھو پیمبرؐ سے

حسین یوسفؑ سے کہہ دے . فکر کی پستی انہیں ورنہ
ہے بالا حسن حیدرؑ سرحدِ ذہن سخنور سے

سند بھی جانشینی کی تجھے . مل جائے گی منکر
شب ہجرت کے بستر سے غدیر خم کے منبر سے

علیؑ ہیں سابق الاسلام بت توڑے ہیں کعبے کے
سند اس امر کی مل جائے گی دوشِ پیمبرؐ سے

سخاوت یہ کہ دی انگشتری سائل کو مسجد میں
شجاعت ان کی سن لینا زبانِ بابِ خیبر سے

عقیدہ ہی نہیں۔ یہ بات ہے قرآن سے ثابت
علیؑ بعدِ نبیؐ. کونین میں بہتر ہیں بہتر سے

نصیری ان کو کہتے ہیں . خدا . دنیا پہ روشن ہے
علیؑ کیا ہیں یہ پوچھو بوذرؓ و سلمانؓ و قنبر سے

حقیقت میں غدیرِ خم کا منبر اس کا شاہد ہے
نبیؐ کے بعد مولا ہیں یہ اعلان پیمبرؐ سے

یہ آڑے وقت میں پیغمبروں کے کام آئے ہیں
بھلا غیروں کو کیا نسبت ہے داماد پیمبرؐ سے

شمار اپنا ہوا ہے جب سے ان کے مدح خوانوں میں
مقدر فیض اپنا بڑھ گیا . بختِ سکندر سے

قصیدہ در مدح حضرت عباسؑ علمدار

بہت ایسے زمانوں سے بھی گزری ہستی فانی
گراں جنس وفا تھی۔ بیوفائی کی تھی ارزانی

صفیؑ کے دور میں قابیل نے ہابیل کو مارا
خجل ہے فعل سے اک شخص کے کل نوع انسانی

ہوئی تھی قوم برگشتہ مخالف اک زمانہ تھا
سفینہ زندگی کا نوح کی تھا جس سے طوفانی

کریں کیا ذکر غیروں کا پسر تھا باپ کا دشمن
جناب نوح کو پہونچی اذیت جس سے روحانی

وفا کیا ہے۔ یہ ہر ہر زادے سے گو کہ سمجھایا
نہ صالح کی نصیحت۔ ان کی مفسد قوم نے مانی

زباں زد حضرت یوسف کا قصہ ہے زمانے میں
برادر کے برادر ہو گئے تھے دشمن جانی

وہ دن آیا۔ کیا فرعون نے دعویٰ خدائی کا
لب دریائے نیل۔ اک بیوفائی کی تھی طغیانی

خدا شاہد ہے اک ایسا بھی گذرا دور دنیا میں
خدا سے منہ پھرائے جب صنم کرتے تھے من مانی

کچھ ایسے بھی وفا دشمن۔ نبیؐ کے پاس آتے تھے
دلوں میں کفر اور لب پہ تھا دعویٰ مسلمانی

ہوا وہ دور دورہ انقلابات مسلسل کا
پریشانی پہ ماتم کر رہی تھی خود پریشانی

وفا نا آشنا۔ انسانیت کی حد سے باہر تھے
بھٹکتی پھر رہی تھی منزلوں سے فکر انسانی

وفا والے تھے کم اور بیوفا سارا زمانہ تھا
وفا کی کر رہی تھی بیوفائی فاتحہ خوانی

وفا کا درس۔ ذرہ بھر نہ بھایا۔ بیوفاؤں کو
کہ زنگ آلود تلواروں پہ چڑھتا ہی نہیں پانی

لگا دے ڈوبتی کشتی کو ساحل سے کوئی غازی
وفا نے اس توقع پر جہاں کی خاک تک چھانی

یکایک بابِ علم مصطفٰے کے گھر سے غلُ اٹھا
کہ وہ آیا۔ وفا میں جس کا ممکن ہی نہیں ثانی

سنا جب یہ کہ شیر حق کے گھر شیر جری آیا
وفا نے بڑھ کے قدموں پر جھکا دی اپنی پیشانی

تصدق ہو گئی کرکے طواف چہرہ اقدس
وفا نے جب کہ اپنے ناخدا کی شکل پہچانی

ندا دی فیض کو یہ دیکھ کر جوش عقیدت نے
پڑھو اب مدحِ عباس جری میں مطلع ثانی

وفا کی سرپرستی کو بصد اجلال عمرانی
اٹھا لبیک کہہ کر۔ حیدر کرار کا جانی

سہارا دے دیا بڑھ کر کٹے شانوں سے کچھ ایسا
وفا نے پائی رفعت ماورائے حدّ امکانی

وفا کو سیر کر کے۔ اٹھ گئے پیاسے زمانے سے
کرم سے اپنے اس کو کر گئے دنیا میں لافانی

تقاضا ہے یہ دل کا شاہِ اقلیم وفا کہیئے
عمل بولا۔ وفا کو ان کی کہئے جزو ایمانی

وفا کا پاس تھا اتنا۔ لگا یا منہ نہ پیاسے ہونٹ نے
لب عباسؑ چھونے کو تڑپتا رہ گیا پانی

وفا والے ہیں۔ ان کو کیا علاقہ بیوفاؤں سے
یزید نحس کا ٹھوکر پہ ان کی تاج سلطانی

نہیں ممکن کہ ابھرے نقش کوئی سطح دریا پہ
مگر غازی نے تفسیر وفا لکھ دی بہ آسانی

نہ ہوگا۔ بند اب پانی کسی پہ۔ تادم محشر
کہ ہے عباسؑ کے حصے میں دریا کی نگہبانی

نہ ہوتے حضرت عباسؑ دنیا میں اگر پیدا
تو قتل ہوتا محبت کا۔ وفا کی فاتحہ خوانی

دعا ہے فیضؔ کی دست بریدہ کے تصدق میں
نہ چھوٹے ہاتھ سے تا مرگ۔ مولا کی ثنا خوانی

✿

سن معرفت نام عباسؑ
بحساب ابجد

○

فیضؔ ہیں 'ع' کے ستر تو ہیں دو 'ب' کے عدد
یہ بہتر شہدا ہیں بحساب ابجد
ہے احد کا جو 'الف' 'س' کی ہے ساٹھ یہ حد
اور یہ اکسٹھ سن ہجری ہے بصد شد و مد

سن بھی تعداد شہیدان وفا چہرہ ہے
کربلا نام میں عباس کے پوشیدہ ہے

سلام

قدم اس راہ میں رکھئے جناب آہستہ آہستہ
سمجھ میں آئے گا دیں کا نصاب آہستہ آہستہ

میانِ طفلی و پیری یہ منظر ہم نے دیکھا ہے
کہ آتا اور جاتا ہے شباب آہستہ آہستہ

فرشتو، پوچھ لینا پوچھنا جو کچھ ہے تربت میں
ذرا لینے دو دم، دوں گا جواب آہستہ آہستہ

یہ اطمینان دیکھو بعد قتلِ مرحب و عنتر
نبیؐ کے پاس پہنچے بوترابؑ آہستہ آہستہ

گلا شبیرؑ کا، اے شمر ہے اسلام کی گردن
رگِ دیں کاٹ اے خانہ خراب آہستہ آہستہ

شہادت پا چکے اصغرؑ، ہجوم یاس میں لیکن
جھلائے جاتی ہے جھولا ربابؑ آہستہ آہستہ

کہا شہؑ نے علی اکبرؑ، بعجلت رن کو مت جاؤ
پدر سمجھا ہے تمہارے ہمرکاب آہستہ آہستہ

قدم اٹھتے نہ تھے شہزادیوں کے فرطِ غیرت سے
گئے دربار میں عصمت مآب آہستہ آہستہ

کھڑے تھے سر جھکائے تشنہ لب اہلِ حرم شہ کے
یزیدِ شوم پیتا تھا شراب آہستہ آہستہ

عدو سمجھے نواسے کی مدد کو آئے پیغمبر
جو الٹی رن میں اکبر نے نقاب آہستہ آہستہ

گلے میں طوق بیڑی پاؤں میں ہاتھوں میں رسی تھی
گئے دربار عابد دل کباب آہستہ آہستہ

طلب لب تک نہ آئی بھر دیا مولا نے دامن کو
ہوا ہوں فیض میں کب فیضیاب آہستہ آہستہ

مل گیا قسمت سے ایسا ناخدا میرے لئے
پار بیڑا بحرِ غم میں کر دیا میرے لئے

واہ رے بخشش جو بھی پیاسا گیا حیدر کے پاس
جام کوثر کا لبالب بھر دیا میرے لئے

کربلا جاتی تو ہے اتنا کرم کیجو صبا
واپسی پر لائیو خاکِ شفا میرے لئے

سینکڑوں کی مشکلیں حل کی ہیں اے مشکل کشا
دیر کیوں ہوتی ہے یہ ناحق سوا میرے لئے

ساتھ کے بچوں سے کہتی تھی سکینہ ہو کے خوش
پانی اب لاتے ہیں دریا سے چچا میرے لئے

بعدِ اکبرؑ، شاہؑ کہتے تھے کروں گا جی کے کیا
خاک ہے اب زندگانی کا مزا میرے لئے

کہتے تھے سجادؑ ہو گا کون مجھ جیسا اسیر
روتی ہے زنداں میں زنجیرِ پا میرے لئے

شاہؑ کہتے تھے یہ رو کر لاشۂ عباسؑ پر
میرے اکبرؑ کو بتا دو کچھ پتا میرے لئے

اے مسلمانو دوا کیسی، کہا سجادؑ نے
بند اک مدت سے ہے آب و غذا میرے لئے

کیسے ماں جائے کو کفن دوں، رو کے زینبؑ نے کہا
خود نہیں ملتی ہے بھیّا اک ردا میرے لئے

کربلا، مولاؑ بلا لو تاکہ صحت ہو نصیب
ہند کی اچھی نہیں آب و ہوا میرے لئے

داغ ہیں دل پر بہت کربلا والوں کے غم سے
دل مرا چھوٹی سی کربلا ہو گیا میرے لئے

فاتحِ خیبر نہ ہو گا، فاتحِ خیبرؑ کے بعد
جس طرح ممکن نہیں حیدر کوئی حیدرؑ کے بعد

جس طرح کوئی نبی ہوگا نہ پیغمبرؐ کے بعد
اس طرح ممکن نہیں کوئی وصی حیدرؑ کے بعد

ختم ہے قولِ مصطفےٰؐ سے سب پہ واضح ہو گیا
حکمِ خالق سے علیؑ مولا ہیں پیغمبرؐ کے بعد

سلسلہ در سلسلہ پہنچیں گے آیات اللہ تک
جاؤں گا قبرِ نبیؐ پر تربتِ حیدرؑ کے بعد

مان لے اب یہ نیابتِ مصطفےٰؐ اے معترض
ہے شبِ ہجرت علیؑ بستر پہ پیغمبرؐ کے بعد

جو بنا خم میں کجاووں سے برائے مرتضیٰؑ
چڑھ نہ منبر پر سکا ایسا کوئی منبر کے بعد

مثلِ فضہؑ مل نہیں سکتی کنیزِ فاطمہؑ
اور غلامِ مرتضیٰؑ ممکن نہیں قنبرؑ کے بعد

تا بہ محشر خلق فرمائے جو خلاقِ جہاں
صابرہ ممکن نہیں ہے زینبِ مضطر کے بعد

جو بہ تسکینِ دلِ شبیرؑ [illegible] ان کی تھی
ہم شبیہِ مصطفےٰؐ ممکن نہیں اکبرؑ کے بعد

جو شخص پاسباں ہے درِ بوترابؑ کا
رُخ موڑ دے گا دہر کے ہر انقلاب کا

زاهد نہیں ہے خوف مجھے کچھ عذاب کا
پیتا ہوں روز جام ولاکے شراب کا

ہے ضعف پر یہ ضیف رسالت مآب کا
پیری کے دور میں بھی ہے عالم شباب کا

سر کٹ گیا جو سبط رسالت مآب کا
دہشت سے زرد ہو گیا رخ آفتاب کا

سبط نبی نے ریش مبارک پہ مل لیا
اصغرؑ کے خون سے کام لیا ہے خضاب کا

جھولا جھلاتی رہتی تھیں خالی بصد الم
اصغرؑ کے بعد شغل یہی تھا ربابؑ کا

لاتے ہیں قتل گاہ سے لاشِ پسر حسینؑ
پیری کے دوش پر ہے جنازہ شباب کا

اصغرؑ پدر کی گود میں پیاسے ہوئے شہید
مرجھائے جیسے طرح سے شگوفہ گلاب کا

ٹکرا رہا ہے ساحلِ دریا سے اپنا سر
تشنہ لبوں کے غم میں یہ عالم ہے آب کا

ششماہے تھے کہ تیر سے اصغر ہوئے شہید
مادر کو انتظار تھا ان کے شباب کا

خیبر کا در علیؑ نے، تو شہؑ نے اٹھائی لاش
وہ باعثِ سکون، یہ سبب اضطراب کا

پھر جاتے ہیں نظر میں علیِ اکبرؑ و سنان
چھڑتا ہے ذکر بزم میں جب بھی شباب کا

منکر نکیر قبر سے ہنستے چلے گئے
جس دم قصیدہ میں نے پڑھا بوترابؑ کا

کھل جائے گا یہ راز مودت ہے چیز کیا
کیجے مطالعہ کبھی ام الکتاب کا

یوں جا رہے ہیں اکبرِؑ ذیشاں پئے جہاد
خیمے سے جا رہا ہے جنازہ شباب کا

تربت میں محوِ دیدِ رُخِ مرتضیٰؑ ہوں میں
منکر نکیر، وقت نہیں یہ حساب کا

اصغرؑ کا رتبہ ناقۂ صالح سے کم نہیں
لاریب یہ ورق ہیں خدا کی کتاب کا

ڈھالے ہیں موتی تحفۂ زھراؑ کے واسطے
ممنون فیضؔ کیوں نہ ہو چشمِ پُرآب کا

کی مدحِ پنجتن میں بسر زندگی تمام
دھڑکا نہیں ہے فیضؔ کو یومِ حساب کا

نبیؐ کا دین کبھی اوج پر نہیں جاتا
اگر حسینؑ کا نیزے پہ سر نہیں جاتا

جو سیر ہو کے بھی پی لیتا اصغرِؑ معصوم
یزید، نہر کا پانی اتر نہیں جاتا

درِ علیؑ پہ میں دھونی رمائے بیٹھا ہوں
تلاشِ حق میں ادھر اور ادھر نہیں جاتا

عزائے سبطِ نبیؐ جس جگہ نہیں ہوتی
ادھر کو طائرِ فکر و نظر نہیں جاتا

غمِ حسینؑ میں گریاں رہے جو آٹھ پہر
اس آنکھ کا کبھی نورِ بصر نہیں جاتا

غمِ حسینؑ کا درماں نہیں زمانے میں
یہ درد وہ ہے جو اے چارہ گر نہیں جاتا

جہاں پہ ذکرِ شہِؑ کربلا نہیں ہوتا
اس انجمن میں کوئی دیدہ ور نہیں جاتا

جہاں سے جاؤں گا میں زیرِ سایۂ شبیرؑ
سفر پہ کوئی بلا راہبر نہیں جاتا

درِ بہشت پہ رضوان نہ کرتا استقبال
یہ راہِ کرب و بلا فیضی گر نہیں جاتا

نوحہ

بین تجھے ماں کے یہ تربت پر اندھیری رات سے
ڈر نہ جانا قبر میں اصغرؔ اندھیری رات سے

شب کا سناٹا ہے آتی ہیں صدائیں ہولناک
نیند آئے گی ہتھیں کیونکر اندھیری رات سے

یاد کر کے ماں کو تربت میں نہ رونا میرے لال!
کون بہلائے گا اے دلبر اندھیری رات سے

قبر ہے تاریک تنہائی ہے، جنگل ہے خوفناک
ماں کو آئے چین پھر کیونکر اندھیری رات سے

جب کسی پہلو نظر آتے نہیں اے مہ لقا
ڈھونڈتی ہوں تم کو اٹھ اٹھ کر اندھیری رات سے

چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر جگر میں تیری یاد
اس لئے رہتی ہے ماں مضطر اندھیری رات ہے

کون ہے، جلوائوں جس سے تیری تربت پر چراغ
ہر قدم کھاتی ہے ماں ٹھوکر اندھیری رات ہے

پیاس کی شدت، جدائی ماں کی اور گردن کا زخم
کم سنی میں اتنے غم دلبر اندھیری رات ہے

ہے چراغاں شام سے فوجِ یزیدی میں مگر
شمع بن ہے تربتِ اصغرؑ اندھیری رات ہے

کس طرح کاٹے دکھیا ماں بھلا پھر زندگی
تم نہیں پہلو میں اے دلبر اندھیری رات ہے

کس خطا پر ہو خفا بولو تو منہ سے میرے چاند
آئی ہے ماں ننگے سر اصغرؑ اندھیری رات ہے

لاکھ امیدیں تھیں وابستہ تمہارے دم سے لال!
مل گئیں سب خاک میں یکسر اندھیری رات ہے

شکوۂ جور و جفا دادی سے یہ کرنا بیاں
قبر میں آئیں گی وہ دلبر اندھیری رات ہے

فیضیؔ غم کی داستاں اور اس زمینِ سخت میں
شعر کہنا ہو گیا دوبھر اندھیری رات ہے

نوحہ

یادِ پدر میں کہتی تھی صغراؑ کہاں ہو تم
فرقت میں مر رہی ہوں مسیحا کہاں ہو تم

بنتِ شہِ ہدیٰ نے پکارا کہاں ہو تم
بابا، طمانچہ شمر نے مارا کہاں ہو تم

زینبؑ پکاری، نہر سے عباسؑ جلد آؤ !
اک تم ہی تھے حرم کا سہارا کہاں ہو تم

اکبرؑ کو یاد کر کے سکینہؑ یہ کہتی تھی
کانوں سے خون بہتا ہے بھیّا کہاں ہو تم

جب شمر مارتا تھا طمانچے یتیم کو
رو کر سکینہؑ کہتی تھی بابا کہاں ہو تم

زخمی ہیں کان، رخ پہ طمانچوں کے نیل ہیں
کرتا بھرا ہے خون میں سارا کہاں ہو تم

ہم کو دکھا کے پیتی ہے پانی سپاہِ شام
دم پیاس سے لبوں پہ ہے آیا کہاں ہو تم

بابا، تمہارے بعد سپاہِ یزید نے
گھر لوٹ کر جلا دیا سارا کہاں ہو تم

بیووں کے بین تھے پئے امداد آیئے
عقدہ کشائے خلق خدارا کہاں ہو تم

کچھ ایسی کس کے باندھی ہے ظالم نے رسیاں
بازو پھوپی کا زخمی ہے سارا کہاں ہو تم

زینبؑ پکاری، بھائی مرا صبر دیکھئے
سب مر گئے پہ دم نہیں مارا کہاں ہو تم

تم کو خبر نہیں، یہاں محشر ہوا بپا
پیاسا مرا ہے ہنسلیوں والا کہاں ہو تم

قطعات

دنیا نگۂ نور سے منھ دیکھ رہی ہے
مومنی کی نظر طور سے منھ دیکھ رہی ہے۔
دل پر جو رقم ہے مرے۔ یا حضرتِ عباسؑ
مشکل بھی کھڑی دور سے منھ دیکھ رہی ہے۔

...

یزید تخت پہ فرقِ حسینؑ نیزے پر،
کسے شکست ہوئی اور کسے نصیب ظفر
جہاں پہ ہو گیا روشن یہ خونِ ناحق سے
کٹی حسینؑ کی گردن جھکا یزید کا سر

...

مہرِ مادر میں ہو۔ اور پائے دلِ بر پانی
فیضؔ کی آنکھوں سے گر جائے نہ کیونکر پانی
یاد آجاتی ہے جب تشنگیٔ سبطِ رسولؐ
حلق میں میرے اٹک جاتا ہے اکثر پانی

...

سر دیکے یہ گھر لٹا کے شہ مشرقین نے
حق کو بچایا فاطمہ کے نور عین نے
پیغمبروں سے ہو نہ سکا جو۔ خدا گواہ
وہ کام کربلا میں کیا ہے حسینؑ نے

- - -

الفتِ عباسؑ شامل میرے آب و گل میں ہے۔
کیوں نہاں رکھوں اسے۔ جو کچھ بھی میرے دل میں ہے
ہے وظیفہ لب یہ میرے حضرت عباسؑ کا
پاس آسکتی نہیں مشکل بھی اب مشکل میں ہے

- - -

سنا دو فیض کا پیغام یہ زمانے کو
دبا سکو گے۔ نہ اس غم بھرے فسانے کو
ابھر کے کہتا ہے ہر سال ماتم شبیرؑ
مٹو گے خود۔ جو اٹھو گے اسے مٹانے کو

- - -

یہ مرثیہ بکف۔ جو لحد زیب و زین ہے
مداح ہے۔ غلام شہ مشرقین ہے
لو لی نجات کھول دے رضوان در بہشت
یہ فیض۔ فیضیاب یہ فیض حسینؑ ہے

- - -

کس لئے گھبراؤں میں۔ آخر ہجوم یاس سے
جب دبے پاؤں نکل جاتی ہے مشکل پاس سے
مجھکو دنیا اور مافیہا کا غم مطلق نہیں
صبر شاہِ دیں سے سیکھا ہے وفا عباسؑ سے

شاعرِ آلِ محمدؐ
نسیمؔ امروہوی

قطعہ

تمام عمر رہے زیب و زینتِ منبر
انہیں تھا مرثیہ گوئی کا شغل آٹھ پہر
صدا یہ ہاتفِ غیبی نے دی، کلام اپنا
نسیمؔ سب کو سنائیں گے خلد میں جاکر

۱۴۰۷ھ

نظم

مرثیہ گوئی میں کردی زندگی اپنی تمام
مرثیے ان کے پڑھے جائیں گے مجلس میں مدام
قدسی و رضواں بھی آئے ان کے استقبال کو
دیکھ کر موجودگی ان کی ریاضِ خلد میں
کیا تعجب ہے کہ ان کو قصرِ جنت بخش دیں
منقبت میں پنجتن کی تھے سدا رطب اللسان
اب انیسؔ و مونسؔ و عشقؔ و تعشقؔ اور وحیدؔ
مرثیہ گو سب ہیں اس کے معترف بعد انیسؔ

السلام اے شاعرِ آلِ محمدؐ، السلام
مرثیے سے تا ابد قائم رہے گا ان کا نام
جب درِ فردوس پر پہنچا ہے مداحِ امام
خازنِ جنت کرے گا مجلسوں کا اہتمام
قائمِ آلِ محمدؐ سن کے قائمؔ کا کلام
عمر اپنی اس طرح کی ہے عبادت میں تمام
مجلسِ شہؑ میں سنیں گے حشر تک ان کا کلام
شاعرِ آلِ محمدؐ، مرثیے کے ہیں امام

اے زہے معراجِ مداحِ شہیدِ کربلا | پنجتن فرشِ عزا پر، ان کا منبر پر قیام
جب فرشتے قبر میں ان سے کریں گے باز پرس | یہ سنا دیں گے جواباً مرثیہ، نوحہ، سلام
دے کے جنت کی سند واپس فرشتے جائیں گے | مدح گو کے باتوں باتوں میں سنور جائیں گے کام

مرثیہ گویوں میں میرا نام شامل ہو گیا
ان کے ہی فیضِ تلمذ سے یہ پایا ہے مقام

نجم آفندی اکبر آبادی

(تاریخِ وفات)

○

شاعرِ اہلِ بیت نجم افسوس | موت تیری ہے دل کی بربادی
تیرے مرنے سے ہو گئی سنسان | نوحۂ دل گداز کی وادی
اپنی دنیا تو ہو گئی برباد | بڑھ گئی گو جناں کی آبادی
تو نہیں جب تو اب ملے گی کہاں | نظم رنگین اور روش سادی
تو جہانِ ثنائے مولا میں | راہِ نو کا ہے بانی و ہادی
نوحہ و منقبت کی دنیا میں | کر گیا انقلاب بنیادی
طمع دنیا سے دور گوشے میں | شہ کا تھا مدح خواں بہ آزادی
تیری تاریخِ مرگ لکھتا ہے | فیض جو مرثیے کا ہے عادی

رحلتِ شاعرِ فنا فی اللہ
نجم آفندی، اکبر آبادی

۱۹۷۵ء

مرثیہ

در حالِ شہادت حضرت سکینہ ع زندانِ شام میں

○

قطعہ:

یہ فرمایا پیمبر ص نے غدیرِ خم کے منبر سے
علی ع مولا ہے تم کے ہیں یہ بعد میرے، حکم داور سے
اسے انساں نہ کہیے، اصل میں ابلیس ثانی ہے
جو روگرداں رہے اے فیضیؔ اعلانِ پیمبر ص سے

●

جب مومنو! حسین کی دختر ہوئی اسیر
عباس سے دلیر کی خواہر ہوئی اسیر
بعدِ حسین، زینب مضطر ہوئی اسیر
ہیہات جملہ آلِ پیمبر ص ہوئی اسیر
اطفال خوفِ شمر سے دم بھر نہ سوتے تھے
سر زانوؤں پہ رکھ کے وہ زنداں میں روتے تھے

آ بیٹھتی تھی بالی سکینہ قریبِ در
ہر راہ گیر کو، یہ سناتی تھی بے پدر
عشرے کو، بعدِ عصر لٹا کربلا میں گھر
کانوں سے میرے کھینچ لیے شمر نے گہر
شدت سے بھوک پیاس کی ہم سب نڈھال ہیں
اور شمر کے طمانچوں سے رخسار لال ہیں

کہتی تھی: جانیوالو! سنو یہ بھی داستاں ہم آلِ مصطفےٰ امام ہیں، مدینہ میں ہے مکاں
دیں کی مدد کو نکلے وطن سے شہِ زماں اترا جو کربلا کی زمیں پر یہ کارواں
بولا یہ ابنِ سعد شہِ کائنات سے
اتریں گی فوجیں، خیمے اٹھالو فرات سے

واقف تھے آنیوالے زمانے سے حق شناس صحرا میں نصب کر لیے خیمے بصد ہراس
فوجیں لگا دیں شمر نے ساحل کے آس پاس وہ سرزمیں آئی نہ غربت زدوں کو راس
پردیسیوں پہ ساتویں سے بندِ آب تھا
شدت سے تشنگی کی کلیجہ کباب تھا

آغازِ جنگ دسویں محرم کو ہو گیا بیٹے، بھتیجے، بھانجے، انصارِ باوفا
سب تشنہ لب شہید ہوئے وا مصیبتا ششماہے شیرخوار کو بھی قتل کر دیا
فرقِ حسین کو جو چھری قطع کر گئی
ہر ایک پر قیامتِ صغریٰ گزر گئی

جب سارے قتل ہو گئے طفل و جوان و پیر گھیرے تھا چار سمت سے اک لشکرِ کثیر
پھر ظلم پر یہ ہو گئے آمادہ سب شریر اسباب لوٹا، خیمے جلائے، کیا اسیر
سر ننگے لے گئے وہ ہمیں اژدہام میں
پھر لا کے بند کر دیا زندانِ شام میں

پھر اس نے سننے والوں سے رو کر کیا بیاں — ڈرتی ہوں میں کہ شمر نے سن لی اگر فغاں
مارے گا ہم کو آ کے طمانچے وہ بے گماں — گھبراؤ، شب ہے، کل یہ سناؤں گی داستاں
زنداں میں تیرگی جو ہر اک سمت چھا گئی
پھوڑا ہے سر کو، پاس وہ زینب کے آ گئی

دن دوسرا جو آیا تو مظلومہ وقتِ شام — زنداں کے در پہ آن کے بیٹھی بہ اہتمام
روداد درد سننے کو آئے وہاں عوام — تھی غم سے غیر حالت، انبوہ لا کلام
حق بات کی، دلوں پہ جو تاثیر ہو گئی
زنداں کے در پہ مجلسِ شبیر ہو گئی

زنداں میں محوِ خواب تھی اک شب اسیرِ غم — دیکھا کہ آئے رویا میں شاہنشہِ امم
فرمایا آج ختم ہیں سب صدمہ و الم — آئے ہیں اپنی بیٹی کو لینے جناں سے ہم
بیدار ہو کے روئی جو وہ اضطراب میں
زینب نے پوچھا بی بی نے کیا دیکھا خواب میں

وہ رو کے بولی آئے تھے زنداں میں پدر — اللہ یہ بتائیے بلائے گئے کدھر
پہنچی جب اس یزید کو اس خواب کی خبر — بھجوا دیا یزید نے زنداں میں شہ کا سر
سر دیکھ کے روتے روتے جہاں سے گزر گئی
منہ اپنا رکھ کے باپ کے منہ پر وہ مر گئی

زنداں کے در پہ جمع ہوئے لوگ وقتِ شام　　آئی نظر کسی کو نہ جب وہ مہِ تمام
زنداں بان سے یہ کسی نے کیا کلام　　تشویش کی یہ بات ہے حیرت کا ہے مقام
کرتی تھی اپنا غم جو بیاں وہ کدھر گئی
درباں بولا، یادِ پدر میں وہ مر گئی

زینب نے قید خانے میں غسل و کفن دیا　　اب تک نشاں طمانچوں کے رخ پر تھے برملا
زخمی جو تھے ورم بھی تھا کانوں پہ جابجا　　کہتی تھیں یہ ہی زینبِ مضطر بصد بکا
ایسا کوئی اسیر نہیں ہے زمانے میں
جس کو لحد نصیب ہوئی قید خانے میں

یہ سوچ کر رہا نہ مرے دل کو کچھ قرار　　عابد سنبھالیں بیڑیاں یا طوقِ خاردار
یا قبر میں بہن کو اتارے وہ دلفگار　　تاریخِ شام سے یہ ہوا ہم پہ آشکار
یہ بیکسی نظر کہیں اب تک نہ آئی ہے
قیدی کی قیدیوں ہی نے تربت بنائی ہے

یہ وہ اسیرِ ظلم ہے زنداں میں ہے مزار　　محشر تلک رہے گا رہائی کا انتظار
آتے رہیں گے قبر پہ زوار بے شمار　　اب بھی صدا یہ آتی ہے تربت سے بار بار
میں دخترِ حسین علیہ السلام ہوں
بعد فنا بھی قیدیٔ زندانِ شام ہوں

مرثیہ

در بیانِ شہادت
حضرت عباسؑ علمدار

اے شوقِ نظم جرأت و ہمت سے کام لے اے ذوقِ مدح لطفِ حیاتِ دوام لے
کر حوصلہ بلند تو اعلیٰ مقام لے مشکل پڑے تو دامنِ حیدرؑ کو تھام لے
خیبر میں ان کے دم سے بلا وقت ٹل گیا
نادِ علیؑ، نبیؐ نے پڑھی کام چل گیا

جرأت حسینؑ ہے کیوں نہ حسیںؑ ہو مآل بھی یہ راہ پُر جلال بھی ہے خوش جمال بھی
میرے لئے ہے سہل، عدو کو محال بھی یہ مدح بے زوال بھی ہے اور کمال بھی
زندہ ہیں جب تو نظم کے پھولوں کا باغ ہے
مرنے کے بعد قبر کا گویا چراغ ہے

لے دے کے فکر اب تو یہی ہے کہ کیا لکھوں — نوحہ لکھوں، سلام لکھوں، مرثیہ لکھوں
یا حالِ سر فروشیِ اہلِ وفا لکھوں — یا شہؑ کے ساتھ بنتِ علیؑ کی ثنا لکھوں
زینب جہاں ملیں، وہیں شاہِ زمن ملے
ہر منزلِ عمل میں یہ بھائی بہن ملے

یہ عاشقِ حسینؑ، وہ ہمشیرؑ پر فدا — یہ منزلِ جفا میں تو وہ حاملِ وفا
یہ ثانیِ بتولؑ، وہ ہم شانِ مرتضیٰؑ — دو مبتلائے کرب و بلا سے ہے کربلا
دونوں نے مل کے دینِ نبیؐ دین کر دیا
اس داستاں کو اور بھی رنگین کر دیا

شبیرؑ بے کفن ہیں تو زینب ہیں بے ردا — دونوں ہیں آلِ ختمِ رسلؐ ان میں فرق کیا
حق نے حسینؑ کو جو فضائل کیے عطا — وہ سب ملے انہیں بھی امامت کے ماسوا
شہؑ لائے قافلے کو حدِ احتشام تک
زینب گئی ہیں لے کر اسے ملکِ شام تک

دونوں یتیم، باپ نہیں، سر پہ ماں نہیں — صابر، حلیم جیسے دہن میں زباں نہیں
حق پر جو آنچ آئے تو انہیں خوفِ جاں نہیں — ہمت ذرا بھی پست دمِ امتحاں نہیں
ان میں بھی اور ان میں بھی خو ہے بتولؑ کی
وہ ہیں نواسے اور یہ نواسی رسولؐ کی

دختر یہ شیرِ حق کی تو وہ شبیرؑ کے پسر — دونوں کا صبر، فاطمہؑ کے شیر کا اثر
یکساں نہ کیوں ہوں یہ کہ ہیں اک نخل کے ثمر — زہرہ جبین یہ ہیں تو وہ زہراؑ کے ہیں قمر
یہ ان کی ہیں مثال وہ ان کی مثال ہیں
اولادِ فاطمہؑ ہیں، محمدؐ کی آل ہیں

سرورؑ نے تیغ رن میں چلائی ہے لا کلام — تیغِ زباں سے بنتِ علیؑ نے لیا ہے کام
پڑھتے تھے وہ رجز سرِ میداں بہ احتشام — یہ خطبے پڑھتی جاتی تھیں کوفہ سے تا بہ شام
کرب و بلا کی فتح تو حق ہے امام کا
تختہ الٹ کے آئی ہیں یہ ملکِ شام کا

شہؑ نے جو حق پہ اکبرؑ و اصغرؑ کیے نثار — دو اپنے لعل آپؑ نے شہؑ پر کیے نثار
کم سن، جوان و پیر برابر کیے نثار — امت کی بہتری کو بہتر کیے نثار
حیدرؑ کا بھی، رسولؐ کا بھی نام رکھ لیا
سب کچھ لٹا دیا مگر اسلام رکھ لیا

طوفان آندھیوں کے ہوں یا دھوپ کی تپش — جاری ہے حق کی راہ میں ان کی دوا دوش
اخلاق میں وہ جذب ہے باتوں میں وہ کشش — روحِ عمل بنے یہ کریں جس کی پرورش
اس کا کھلا ثبوت وہ ایک نیک نام ہے
عباسؑ نام ہے تو وفا کا امام ہے

سقائے شاہؑ، شیرِ الٰہی کا شیر ہے　　غازی ہے، صف شکن ہے، جری ہے، دلیر ہے
محشر بپا کرے گا کہ دنیا سے سیر ہے　　جنگاہ تک دلیر کے جانے کی دیر ہے
برسے گا خون، تیغ جری سے ترائی میں
تصویر کھینچ دے گا علیؑ کی لڑائی میں

کیا کیا صفات پائی ہیں غازی نے مرحبا　　ضیغم، جری، دلیر، وفادار، باخدا
جانباز، تیغ زن، پسرِ شاہِ لافتےؑ　　ثابت قدم، شکوہِ حرم، شیرِ کربلا
حمزہؑ کی آن بان تو جعفرؑ کی شان ہے
حامل نشان کا ہے، علیؑ کا نشان ہے

احمدؐ کا حلم بھی ہے، علیؑ کا جلال بھی　　سبطینِ مصطفےٰؐ کی ہر اک چال ڈھال بھی
سقا بھی اور ساقیٔ کوثر کا لال بھی　　بازو بھی شاہؑ کا ہے، مصیبت میں ڈھال بھی
ہٹ جائیں شہؑ ابھی تو قیامت بپا کرے
صابر کے زیرِ حکم شجاعت ہے، کیا کرے

بچوں کی پیاس سے جو بہشتی ہے بے قرار　　رہ رہ کے ہاتھ جاتا ہے قبضہ پہ بار بار
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں امامِ فلک وقار　　رہ جاتا ہے ادب سے لرز کر وفا شعار
شفقت کے ساتھ شاہؑ یہ کہتے ہیں بھائی سے
بھیا! جہادِ نفس ہے افضل لڑائی سے

عباسؑ ہاتھ جوڑ کے کرتے ہیں یہ بیاں مولا، عطش سے بالی سکینہ ہے نیم جاں
دم توڑتا ہے اصغرؑ بے شیر و بے زباں بابا کا حکم یاد تو ہوگا شہؑ زماں
فرما گئے تھے، منہ نہ وفا سے پھرائیو
سقائی کیجیو، مری جرأت دکھائیو

نشتر کا کام کر گیا ذکرِ ابوترابؑ بابا کو یاد کر کے تڑپنے لگے جناب
جھکنے لگا جو پاؤں کی جانب وہ دل کباب خود بڑھ کے تشنہ غم نے سینے سے لپٹا لیا شتاب
بولے کہ خیر جائیے، مرضی حیدر کی ہے
تعمیل کیجئے جو وصیت پدر کی ہے

اتنا رہے خیال مگر وقتِ کارزار وہ ہے جری جو دل پہ کرے جبر اختیار
غصہ میں حلم اپنے بزرگوں کا ہے شعار گھر جل گیا نہ گرم ہوئے شیرِ کردگار
تم کو تو یاد ہوگا کہ بابا نے کیا کیا
قاتل کو اپنے ہاتھ سے شربت عطا کیا

تم کو بھی پاس شیوۂ خلقِ پدر رہے بھیا، لحاظِ امتِ خیر البشرؐ رہے
جرأت کے جوش میں سر و پا کی خبر رہے دشمن پہ غیظ میں بھی کرم کی نظر رہے
لازم ہے ضبط و صبر کہ صابر کے لال ہو
اس کو قلم نہ کیجیو، جو نونہال ہو

ناگہہ محل سرا سے اٹھا شورِ آہ آہ ! / ہم سے ملے بغیر چلے سوئے قتل گاہ
چلاتی تھی کوئی کہ ہمیں کر چلے تباہ / ماتم تھا بیکسوں میں کہ اللہ کی پناہ
سب بیبیوں کے ہاتھ تھے زینبؑ کے ہاتھ میں
بچے بھی پیٹتے تھے سکینہؑ کے ساتھ میں

مولاؑ سے اذن لے کے علمدارؑ باوفا / آئے جو مشک لینے کو سوئے حرم سرا
دوڑی سکینہؑ پیار سے کہہ کر چچا چچا / باہیں گلے میں ڈال کے بولی وہ مہ لقا
دریا تو ہے قریب میں واری چلے چلو
مرتی ہوں پیاس سے مجھے ہمراہ لے چلو

اس ایک بات پر ہوئے دل میں ہزار گھاؤ / دل تھام کر کہا کہ میں قربان، غم نہ کھاؤ
پانی کی آرزو ہے تو سقہ ہمیں بناؤ / بچی نے مشک دے کے کہا، خیر جلد جاؤ
بر آئے گی مراد جو مجھ تشنہ کام کی
صحنک کروں گی فاطمہؑ زہرا کے نام کی

بچی کو پیار کر کے علمدارِ باوقار / مشک و علم اٹھا کے چلے بہرِ کارزار
رن پر چڑھا جو دلبرِ ضرغامِ کردگار / گردوں کو گرد اٹھ کے پکاری کہ ہوشیار
اے ترکِ چرخ پھینک سروہی ہلال کی
آمد ہے ضیغمِ اسدِ ذوالجلال کی

نا بجھہ چراغِ مہرِ مبیں جھلملا گیا — کیواں زمیں کے چرخ پہ چکر میں آ گیا
دہشت سے آسماں زمیں میں سما گیا — ہیبت سے آبِ نہر، عرق میں نہا گیا
فوجوں میں شور کرکے یہ سب تھرتھرا گئے
وہ جھک گئے عَلم وہ علمدارؑ آ گئے

غازی نے فوجِ شام سے بڑھ کر کیا خطاب — میں ہوں غلامِ بادشہِ آسماں جناب
آئے، نظر ملائے کسی میں اگر ہو تابؔ — عباسؑ میرا نام، پدر میرے بوترابؑ
دنیا ہو اک طرف تو نہ میداں میں زیر ہوں
پہچان لو کہ بیشۂ حیدرؑ کا شیر ہوں

میرا پدر وصیِ رسالت مآبؐ ہے — تھا اور نہ ہوگا اور نہ ان کا جواب ہے
دشمن جو ہے علیؑ کا وہ خانہ خراب ہے — ہر معرکہ میں ضربِ علیؑ کامیاب ہے
اب تک جو دہر میں سپروں سے نہ رک سکی
کیسی سپر ملک کے پروں سے نہ رک سکی

حق نے علیؑ کو مالکِ فتح و ظفر کیا — ہر معرکہ کو غرقِ پیمبرؐ نے سر کیا
اوّل خدا کے گھر سے بتوں کو بدر کیا — پھر در اکھاڑ کر دلِ احمدؐ میں گھر کیا
یہ وصف ہے رسولؐ کے کس خیرخواہ میں
میرے پدر جنوں سے لڑے حق کی چاہ میں

خیبر کی فتح، خاص علیؑ کا کمال تھا — اسلام کی فنا و بقا کا سوال تھا
غازی ہر ایک فوجِ نبیؐ میں نڈھال تھا — پیروں کا ذکر کیا یہ جوانوں کا حال تھا
لڑنے کو جو بڑھا وہ بصد رنج و غم پھرا
جو لے گیا علم وہی لے کر الم پھرا

چالیس دن ہوئی جو ہزیمت یہ رو بکار — یہ وجہ تھی کہ رن میں نہ تھے شیرِ کردگار
آئی ندائے غیب پیمبرؐ کو ایک بار — نادِ علیؑ، علیؑ کو بلا، شیر کو پکار
بڑھ کر پلٹ کے آئے جو جرار وہ نہیں
کرار بھی ہے، مرد بھی، فرار وہ نہیں

آواز دی رسولؐ نے حاضر ہوئے علیؑ — رن کو چلے تو عرش سے فتحِ مبیں چلی
بھاگے یہود، فوجِ خدا کی بلا ٹلی — جب در کھلا، رسولؐ کے دل کی کلی کھلی
حیدرؑ تھے ہاتھ پر درِ خیبر لیے ہوئے
یا دستِ حق، وقارِ پیمبرؐ لیے ہوئے

ایسے دلیر و اشجع و غازی کا ہوں میں لال — لیکن جہاد و جنگ و جدل کا نہیں خیال
جاتا ہے نہر پر مجھے اے قومِ بدخصال — مانع ہوا کوئی تو یہ ہے تیغِ بے مثال
غیظ آ گیا تو جان لو، حیدرؑ کا لال ہوں
رن کو لہو سے لال کروں گا کہ آل ہوں

آئے یہ سن کے تیر تو جھپٹا غضب میں شیر چمکی جو برقِ تیغ، سمٹنے لگے دلیر
حکم آیا قہر کو کہ سپاہِ جفا کو گھیر کاوہ تھا رخش کا کہ نصیبِ عدو کا پھیر
تیغ تھی تیغ فرقِ عدو کاٹ کاٹ کے
ہوتی تھی تازہ دم وہ لہو چاٹ چاٹ کے

وہ تیغ تھی کہ موت کا گویا پیام تھا روح و جسد میں تفرقہ بس اس کا کام تھا
اعداء کشی کا شغل اسے صبح و شام تھا جس کے گلے لگی اسے جینا حرام تھا
دل میں جو تھے بھرے ہوئے سب جوش اڑ گئے
جس پر پری کا سایہ پڑا ہوش اڑ گئے

تسمہ لگا نہ رکھتی تھی مطلق وہ دم معاف یہ جس طرف گذر گئی رن میں صفیں تھیں صاف
قلبِ سپاہِ ظلم میں پڑنے لگے شگاف آیا جو دست بستہ کوئی، کر دیا معاف
سر خم کیے تھی، چشمِ جہاں میں جلیل تھی
جھک جھک کے مل رہی تھی کہ تیغِ اصیل تھی

جس سمت آئی حشر اٹھاتی ہوئی چلی بجلی سپاہِ شر پہ گراتی ہوئی چلی
ہر بادہ کش کے ہوش اڑاتی ہوئی چلی دنیا کی الجھنوں سے چھڑاتی ہوئی چلی
چھینا جو اس شقی کا جگر، اس کا دل لیا
وہ سرخرو ہوا جو گلے اس سے مل لیا

یہ معجزہ نہیں ہے تو کیا ہے خطا معاف کب سے تمہارا ہی ہے لہو میں مگر ہے صاف
پہنچی صدائے ضرب جو واں تک دمِ مصاف دہشت سے پڑ گیا درِ خیبر میں پھر شگاف
دہرا دیا جو شیرِ خدا کی لڑائی کو
مرحب کی خاک بڑھنے لگی پیشوائی کو

کرتی تھی یہ گلے سے لگا کر عدو کو پیار پل میں ہزار فرد کو کرتی تھی دو ہزار
تعدادِ فوجِ شام بڑھاتی تھی بار بار کشتے تھے بے شمار کوئی کیا کرے شمار
مارا جنہیں سند انہیں دے دی عذاب کی
روزِ شمار فکر سے چھوٹے حساب کی

اڑتا تھا راہوار صفوں پر بسانِ تیر تلوار یوں چلی کہ گریزاں ہوئے شریر
بھاگے جوان بیٹھ گئے سر پکڑ کے پیر وہ دار و گیر اور وہ شورِ بزن بگیر
حملہ کیا الٹ کے جو چاک آستین کے
لی سانس اس دلیر نے دریا کو چھین کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے زبوں خصال پہنچا ترائی میں اسدِ کبریا کا لال
پانی کو آبرو جو ملی دیکھ کر جمال گرداب آفتاب تو موجیں بنیں ھلال
چمکا رہا تھا آب کو پرتو جناب کا
کیا اوج موج پر تھا ستارہ حباب کا

بچھڑے ہوئے نظر میں جو بچھڑے تھے بار بار
پیاسوں کے لاشے دیکھ کے ضیغم تھا بیقرار
فوجوں کی سمت تن کے پکارے یہ افتخار
ہاں اب کہو، فرات پہ کس کا ہے اختیار
اب بھی جو اذن ہو شۂ عالی مقام کا
دریا کے پاس نصب ہو خیمہ امام کا

یہ کہہ کے جلد ڈال دیا نہر میں سمند
موجوں نے پاؤں چومے تو رو کر کئے بلند
فرمایا تشنہ لب ہیں ابھی شاہِ ارجمند
پانی تو کیا، تری بھی ہے پانی کی ناپسند
آب خنک سے مس ہوں مرے پاؤں قہر ہے
وہ تشنہ لب ہو جس کی یہ مادر کا مہر ہے

شبدیز بھر کے گھر کو پھرے صورتِ نگاہ
دریا پہ مثلِ ابر امڈنے لگی سپاہ
ظلمت میں شام کی ہوا پنہاں وہ رشکِ ماہ
پھر تیغ سے چمن ہوا صحرائے رزم گاہ
دامانِ زخم خون میں بھرنے لگے شفق
تیغِ دو دم کے گھاٹ اترنے لگے شفق

جب کچھ نہ بن پڑی تو بڑھا لشکرِ کثیر
چاروں طرف سے گھیر کے لڑنے لگے شریر
پھینکے کسی نے سنگ کسی نے کمانِ تیر
ناگاہ ہاتھ کٹ گئے ہنگامِ دار و گیر
اس پر بھی شیر نے نہ ذرا رن میں دم لیا
دانتوں میں مشک اور بغل میں علم لیا

خیمہ کو بڑھتے جاتے تھے یہ مثلِ شیرِ نر — فوجیں مچا رہی تھیں قیامت کا شور و شر
کھڑکیں کمانیں، روحِ بتولؑ آئی نوحہ گر — اک آنکھ میں اور ایک لگا تیر مشک پر
پانی بہا تو ثانیٔ الیاسؑ گر گئے
غل پڑ گیا کہ گھوڑے سے عباسؑ گر گئے

ناگہ ندا یہ آئی کہ مولا اب آئیے — اٹکا ہے دم گلے میں مسیحا اب آئیے
افتادہ ہے غلام یہ آقا اب آئیے — ہے وقتِ نزع سیّدِ والا اب آئیے
مولا یہ آرزو ہے دلِ ہے غلام کی
وقتِ اخیر کر لوں زیارت امام کی

عباسؑ کی صدا پہ چلے شاہِ مشرقین — گونجی خیامِ شاہ میں آوازِ شور و شین
اکبرؑ تھے ساتھ تھامے ہوئے بازوئے حسینؑ — گر گر کے شاہؑ اٹھتے تھے دل کو نہ تھا چین
قوت کی کب کمی تھی شہؑ کم سپاہ میں
بھائی کے ہاتھ ڈھونڈھتے تھے گر کے راہ میں

دستِ بریدہ شہؑ نے جو پائے میانِ راہ — دامن میں رکھ کے آنکھوں سے ملتے تھے آہ آہ
پہنچے لبِ فرات جو بہ حالتِ تباہ — رکھنے لگا قدم پہ سر اپنا وہ رشکِ ماہ
دیکھا گیا نہ اکبرؑ مہرو سے، ہٹ گئے
آپس میں دونوں بھائی گلے سے لپٹ گئے

مہر و وفا کے تذکرے تھے جانبین سے　دیکھی گئی نہ بھائی کی حالت حسینؑ سے
زہراؑ کے لال رونے لگے شور و شین سے　اکبرؑ بھی بولے بڑھ کے شہِ مشرقین سے
بابا' بس اب قریب مصیبت کا وقت ہے
عموّ سدھارتے ہیں' وصیّت کا وقت ہے

بولے اک آہ کھینچ کے عباسؑ نامدار　مولا بس ایک میری وصیّت ہے' میں نثار
رہنے دیں میری لاش یہیں شاہِ ذی وقار　آجائے گر سکینہ یہاں ہو کے بیقرار
لطف و کرم سے بارِ خجالت کو ٹال دیں
دامن عبا کا چہرۂ خادم پہ ڈال دیں

یہ کہہ کے کوچ کر گئے عباسؑ باوفا　ناگاہ آئی خیمہ کی جانب سے یہ صدا
عموّ کدھر ہیں کوئی بتا دو بپئے خدا　پیاسے وہ تھے ترائی کی کیا بھا گئی ہوا
بے وجہ مجھ سے روٹھ گئے ہیں مناؤں گی
شرمندہ ہوں چچا سے میں گھر لے کے جاؤں گی

نزدیکِ لاش آئی جو بچی یہ شور و شین　بولا چچا سے رو کے یہ بانوؑ کا نورِ عین
لیجے سکینہ آگئی کرتی ہوئی وہ بین　بسمل ہوئے یہ سن کے شہنشاہِ مشرقین
گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے دل کو سنبھال کے
دامن عبا کا' بھائی کے چہرے پہ ڈال کے

پائیں پا تھے اکبرؑ ذی جاہ بے حواس
بالیں پہ سر جھکائے شہِؑ دیں بہ دردو یاس
رکھے ہوئے تھے دستِ بریدہ علم کے پاس
آئیں قریبِ لاش سکینہؑ بصد ہراس
دیکھے چچاؑ کے شانے کٹے اور آہ کی
پیاسی تھیں پر نہ مشک کی جانب نگاہ کی

روتے تھے منہ کو پھیر کے سلطانِ دیں پناہؑ
بچیؑ بکھیرے بالوں کو با حالتِ تباہ
لاشے سے کہہ رہی تھی لپٹ کر بہ اشک و آہ
جلدی چلو کہ میری چچی دیکھتی ہیں راہ
اب نہر سے تمہیں نہ اگر لے کے جاؤں گی
عمّو کہو، چچی کو میں کیا منہ دکھاؤں گی

مانا کہ مرگ و زیست پہ ہے اختیارِ رب
میری عطش بنی ہے مگر موت کا سبب
پانی نہ مل سکے تو نہ آنا، کہا تھا کب
جلدی چلو کہ رن میں کہیں ہو نہ جائے شب
اس کشمکش میں رُخ سے جو دامن پلٹ گیا
تھرا کے اس غیور کا لاشہ اُلٹ گیا

غزل

تا سحر میتیں اٹھیں نہیں پروانوں کی
کیا یہ بستی نہیں اے شمع مسلمانوں کی

آمدِ گل پہ یہ حالت ہوئی دیوانوں کی
دھجیاں بینتے پھرتے ہیں گریبانوں کی

شمع روتی ہے عبث خاک پہ پروانوں کی
یہ تو وہ ہیں جنہیں کچھ فکر نہ تھی جانوں کی

حد تواضع کی ہے اک رات کے مہمانوں کی
شمع سر دھنتی رہی خاک پہ پروانوں کی

جستجو برق کو ہوتی نہ سیہ خانوں کی
دیکھ لیتی جو وہ بستی مرے ارمانوں کی

ایسی حالت ہے تری قید میں دیوانوں کی
اشک آنکھوں سے نکلتے ہیں نگہبانوں کی

نظریں ٹکرائیں گی جس وقت بھی مستانوں کی
مے چھلک جائے گی ساقی تیرے پیمانوں کی

زخم کچھ اور ہرے ہو گئے ساقی دل کے
رو دیا دیکھ کے جب گردشیں پیمانوں کی

آپ اٹھیں تو سہی چاند سے چہرے سے نقاب
آگے جو کچھ بھی ہو تقدیر ہے دیوانوں کی

قتل کرنے میں پس و پیش ہے کیوں مقتل میں
وہی آئے ہیں جنہیں فکر نہیں جانوں کی

نامہ بر اپنا سا منہ لے کے پھر آئے مجھ تک
بات تک پوچھی نہیں آپ نے مہمانوں کی

دعویٰ اس فن میں اور اس دور میں توبہ توبہ
فیض دنیا میں کمی کب ہے غزل خوانوں کی

فیض ہر حال میں رکھ قادرِ مطلق پہ نگاہ
وہی لیتا ہے خبر بے سر و سامانوں کی

غزل

شبِ فرقت کسی صورت نہ جب دل کو قرار آیا
خدا معلوم کتنی بار لب پر نامِ یار آیا

کبھی خنجر تلے آیا کبھی بالائے دار آیا
نہ آیا عشق پر اس حسن کو پھر بھی نہ پیار آیا

مریضِ غم کی بالیں پر عدو همراہ یار آیا
غمِ دنیا تو آیا ہے مگر لے کر قرار آیا

نہ آنا تھا نہ دل کی بے قراری کو قرار آیا
سرِ مقتل ہزاروں بار میں ان کو پکار آیا

ستمگر بارِ گردن کا سر پٹکتا اتار آیا
ستم تو دیکھئے تربت میں بھی میں زیرِ بار آیا

سرِ گورِ غریباں بھول کر ایک دن جو یار آیا
بدل دی راہ تک جب سامنے میرا مزار آیا

سمجھتا ہوں غلط ہے جھوٹ ہے دھوکہ سراسر ہے
مگر اس پر بھی ہر وعدہ کا ان کے اعتبار آیا

تڑپ کر بجلیاں گرتی رہیں پیہم نشیمن پر
ہمارا آشیاں ہم کو نہ دو دن سازگار آیا

کبھی [illegible] دیکھا کبھی [illegible]
نہ پینے پر بھی اے ہمدم خمار آیا · [illegible] آیا

خلش خواہی دمِ صحرانوردی بڑھ گئی کتنی
ہر اک چھالا خوشی سے روبروئے نوکِ خار آیا

وہ اپنی چیز تھی اے اہلِ محشر، اس کی کیا پرسش
میں اپنا جامۂ ہستی سرِ مقتل اتار آیا

مجھے دم توڑنا بھی نزع میں دوبھر ہوا ہمدم
صدائیں کان میں آتی رہیں پیہم کہ یار آیا

خلش پرسش کی ہے اس منزلِ دشوار میں باقی
سکوں کی جستجو میں فیضیؔ گو زیرِ مزار آیا

سکوتِ مستقل ہے اور اداسی سی اداسی ہے
یہ اے دل، کون تربت پر بہ شکلِ سوگوار آیا

غزل

کیا اے صبا، نقاب اٹھایا نہ جائے گا
دیدارِ حسنِ یار دکھایا نہ جائے گا

کاندھا نہ دو، چلو ہی جنازے کے ساتھ ساتھ
مانا یہ بار تم سے اٹھایا نہ جائے گا

وحشی کو چھیڑیئے نہ خدا کے لئے حضور
بگڑا اگر تو ہوش میں لایا نہ جائے گا

اے برق، آشیاں کی طرح اب قفس بھی پھونک
کیا چار تیلیوں کو جلایا نہ جائے گا

دامن بچا کے قتل کرو، ورنہ روزِ حشر
خونِ شہیدِ ناز چھپایا نہ جائے گا

منظور گر نہیں ہے علاجِ مریضِ غم
کیا خاک میں بھی تم سے مِلایا نہ جائے گا

آنکھوں سے پٹی باندھ لو منظر ہے خوفناک
خنجر گلے پہ تم سے چلایا نہ جائے گا

چھوڑا ہے تاک کر نگہِ انتخاب سے
ناوک سے ان کے، دل کو بچایا نہ جائے گا

پامال کیں تمام امیدیں رہی ہے فیض حق کی
یہ کیا کہا نقاب اٹھایا نہ جائے گا

غزل

مفر ممکن نہیں دردِ جگر سے
عبث ہے پوچھنا پھر چارہ گر سے

اُٹھے محشر نہ سر اُٹھے گا در سے
کہ سر کرنا ہے اس منزل کو سر سے

دھواں بن کر چمن پر چھا گئی ہے
قفس میں آہ جو نکلی جگر سے

حقیقت شرع کی کھل جائے تم پر
بتاؤ گر فسطر سعیری نظر سے

سر محشر ندامت ہو نہ ان کو
ملائی کب نظر ان کی نظر سے

لحد پہ بعد مردن رو رہے ہو
ہوئے واقف اب الفت کے اثر سے

غزل

امید انصاف کی اب اے دلِ مضطر کہاں
سرِ محشر چلے آئے تو پھر محشر کہاں

مقامِ حشر سے کچھ دور اور برہم سے ہیں
یقینا یہ ہے کہ اب ہوگا بپا محشر کہاں

بر رہے ہیں جستجو کے تربتِ ناشاد میں
فکر ہے ان کو کہ اب برپا کروں محشر کہاں

وہ تو مرجھا جائیں گے اور ان پہ آئے گا شباب
داغِ عاشق سے کہیں تیرے گل بہتر کہاں

تجلیاں [illegible] بند آنکھیں ہو گئیں
دیکھ [illegible] آج [illegible] محشر کہاں

غزل

اسی سبب سے سنیں نہ اس نے ہماری دیوانہ وار باتیں
کہیں نہ دیوانگی میں کہہ دے یہ اپنے مطلب کی چار باتیں

کہا تھا شامِ وصال میں نے کہ عرض کرنی ہیں چار باتیں
مسلسل اس نے سحر تک آ کے دل ستائیں مجھ کو ہزار باتیں

یہ کوششیں ہیں نشانِ تربت نہ باقی اس کا رہے جہاں میں
کہ اٹھ کے صحرا میں کر رہے ہیں کچھ ایسے گرد و غبار باتیں

سمجھ کے مجبور دے نہ طعنہ خزاں کا صیاد قیدیوں کو
دکھائیں اعجاز گر جنوں کا کریں قفس میں بہار باتیں

خزاں ہو یا ہو بہار لیکن نشیمن اپنا ہے پھر نشیمن
قفس تو صیاد پھر قفس ہے بنایا کریں ہزار باتیں

نظر کا ان کی یہ فیض دیکھا الٰہی توبہ الٰہی توبہ
ہے کوئی خاموش اور کوئی کرے ہے دیوانہ وار باتیں

کہیں نہ دعوت یہ برق کو دیں مرے نشیمن کو پھونکنے کی
گئے ہیں کرتے ہوئے فلک پر جو گرد و غبار باتیں

عدو سے سرگرمِ گفتگو ہیں غضب میں مجھ سے بھی دوبدو ہیں
کبھی ہیں وجہِ تباہئ دل کبھی ہیں وجہِ قرار باتیں

غزل

پژمردہ بے سبب نہیں تربت کے چار پھول
غم میں شہیدِ عشق کے ہیں سوگوار پھول

وہ حاصلِ بہار، یہ غم آشکار پھول
گلشن کا ایک پھول لحد پہ ہزار پھول

کیا شک گذر گیا انہیں لالہ کے داغ پر
دیکھے اٹھا کے قبر سے کیوں بار بار پھول

صیاد فصلِ گل نہ سہی، ہے یہ چمن چمن
اور یہ قفس قفس ہے بچھا تو ہزار پھول

لالہ کا داغ دیکھ کے تربت پہ رو دیے
زخموں کے ہو گئے مرے آئینہ دار پھول

کچھ دن کو بھی تو رہنے وہ دی زینتِ مزار
گردِ و غبار کو بھی ہوئے ناگوار پھول

چھا کر رہے گی وسعتِ عالم پہ یہ بہار
وہ اور مرا مزار یہ کلیاں یہ ہار پھول

اے فیضؔ ہم قفس میں بھی ہیں حاملِ بہار
داغِ جگر ہیں رشکِ وہ صد ہزار پھول

غزل

جفا جو بے وفا ناداں ستم پیشہ سہی لیکن
میں پھر بھی چاہتا ہوں چارہ گر مجبور ہوں دل سے

سفینہ ڈوبنے کو تھا تو آخر ڈوب کر مانا
بھنور سے بچ کے وہ نکلا تو ٹکرایا وہ ساحل سے

نشیمن پھونک ڈالا برق نے اس کی بلا جانے
حقیقت چار تنکوں کی کوئی پوچھے مرے دل سے

اگرچہ دل بہلنے کا ہر اک ساماں قفس میں ہے
خیالِ آشیاں پھر بھی نہیں جاتا میرے دل سے

گریباں پھاڑنا، رونا، کبھی بے بات ہنس دینا
بہل جاتا ہے دل زنداں میں وحشت کے مشاغل سے

گریباں چاک کر، آنسو بہا، ہنس بول چپ ہو جا
تقاضائے محبت بولے ہر دم وحشتِ دل سے

عصا اب پیر تبسم ہے، ہنسی پیر نوحہ خوانی ہے
یہی تو چارہ گر آغازِ وحشت کی نشانی ہے

نشیمن تھا تو خوفِ برق اور صیاد کا ڈر تھا
قفس میں ہوں تو کچھ کچھ مطمئن سی زندگانی ہے

پھری ہیں پتلیاں، دم گھٹ رہا ہے، سانس رکتی ہے
ذرا بالیں پہ دم لیجے کہ قسمت آزمائی ہے

درِ زنداں کھلا ہے اور میں پابندِ زنداں ہوں
یہ وحشت کے کرشمے ہیں جنوں کی مہربانی ہے

وہ ہچکی لی پھری وہ پتلیاں وہ دم نکلتا ہے
ذرا ٹھہرو قریب الختم یہ غم کی کہانی ہے

عجب ضد ہے ہوئی تھی غرق جس گرداب میں کشتی
یہیں ساحل بنانا ہے وہیں کشتی ترانی ہے

جنازہ روک کر رخ سے کفن سرکا کے یہ بولے
ذرا ٹھہرو، ذرا ٹھہرو! محبت آزمائی ہے

اگر میں ضبط کرتا ہوں تو بڑھتی ہے خلش دل کی
اگر ان کو سناتا ہوں تو کہتے ہیں کہانی ہے

ادھر پتھرا چلیں آنکھیں ادھر بالیں پہ وہ آئے
عجب ہی کشمکش میں عیشؔ اپنی زندگانی ہے

غزل

ہے ان کو امتحاں منظور میری غیرتِ دل کا
تلاطم میں بھی لب پر نام لاؤں گا نہ ساحل کا

کسی کو امتحاں منظور ہے خودداریِ دل کا
مدد اے ضبطِ کامل لب پہ نام آئے نہ ساحل کا

قفس میں ہو گیا ساماں سکونِ قلبِ بسمل کا
عنایت بوئے گل کی ہے کرم ہے شورِ عنادل کا

عیاں کر کے رہوں گا آج میں ہر رازِ منزل کا
سہارا لے کے اٹھا ہوں میں اپنے عشقِ کامل کا

نگاہوں سے ہے اوجھل پھر بھی یہ ارمان ہے دل کا
تلاطم میں کوئی رخ ہی بتا دے کاش ساحل کا

رکھے گی یاد دنیا حشر تک یہ فعل بسمل کا
تڑپتے وقت چہرہ یاس سے دیکھا ہے قاتل کا

تعجب سے نہ دیکھو ہر طرف یہ داغ ہے دل کا
کہ جس نے رنگ پھیکا کر دیا ہے شمعِ محفل کا

خدا کے واسطے نیچی نہ کیجے حشر میں نظریں
کہ میں اقرار کر لوں گا یہاں بھی لغزشِ دل کا

نہ دیوانے سے پوچھو حالِ غم ورنہ وہی ہوگا
جو عالم پرسشِ ہمدرد سے ہوتا ہے ہر دل کا

ان آنکھوں سے تمہیں دیکھا ان آنکھوں کو رلاتے تم
ستاتے ہو عبث دل کو قصور اس میں ہے کیا دل کا

خدا رکھے تجھے وحشت کہ تو نے آبرو رکھ لی
نہ تھا آسان طے کرنا محبت کی منازل کا

اضافہ شوق میں ہوتا گیا ہر ہر قدم پیہم
گلہ کیسا کہ میں ممنون ہوں دوریِ منزل کا

یں گے داغ، غم، ارمان و حسرت، یاس و بے چینی
لینا جائزہ ہرگز میرے دکھے ہوئے دل کا

وہ کیوں منہ پھیر کر روتے ہیں اتنا پوچھ لے کوئی
تماشہ دیکھنے آئے تھے جو بربادیٔ دل کا

حدودِ ہوش سے اے فیض نکلا چاہتا ہوں میں
کہ اب احساس بھی مشکل ہوا جاتا ہے مشکل کا

غزل

کتنا اثر پذیر یہ ضبطِ فغاں ہے آج
نامہرباں جو کل تھا وہی مہرباں ہے آج

کل تک وہ مجھ سے شاد تھا نامہرباں ہے آج
بگڑا ہوا ضرور نظامِ جہاں ہے آج

چھائے قفس پہ آہ جو بن کر دھواں ہے آج
اک اور آسماں کے تلے آسماں ہے آج

گرتی ہیں کیوں تڑپ کے نشیمن پہ بجلیاں
کیا فصلِ گل میں قحطِ آشیاں ہے آج

ڈرتا ہوں دل سے کہتے ہوئے داستانِ غم
اپنا سہی پر ان کا بھی یہ رازداں ہے آج

صیاد ہو نہ ہو یہ نشیمن کی آگ ہے
چھایا ہوا فضائے چمن پر دھواں ہے آج

بڑھنے لگے ہیں سوئے گریباں جنوں میں ہاتھ
کیا آمدِ بہار سوئے بوستاں ہے آج

جب برق گر رہی تھی نشیمن پہ تھی نظر
پیشِ نظر قفس میں وہ کل کا سماں ہے آج

کیا میں حدودِ ہوش سے آگے نکل گیا
نظروں میں کیوں حقیر غمِ دو جہاں ہے آج

کیا چاہتے ہو جیب و گریباں ہو تار تار
کیوں تذکرہ بہار کا وردِ زباں ہے آج

طے ہو گی یا نہ ہو گی میری منزلِ جنوں
جس جا سے کل چلے تھے وہیں کارواں ہے آج

گھبرا کے اُف نکل جو گئی منہ سے یاس میں
ہر ایک کی زباں پہ وہی داستاں ہے آج

کیا غم غبار نے جو اُڑائے لحد کے پھول
داغِ جگر ہی رشکِ وہ گلستاں ہے آج

للہ زخمِ دل پہ چھڑکیے نمک ذرا
کچھ گھٹتی جاتی لذّتِ سوزِ نہاں ہے آج

مارا ہمیں اس ان کے تغافل نے اور فیضؔ
کیا جانے کون درد سے گریہ کناں ہے آج

غزل

جھلک جس میں امید و بیم کی معلوم ہوتی ہے
حقیقت میں وہی کچھ زندگی معلوم ہوتی ہے

رخوں پر زلف کی کچھ برہمی معلوم ہوتی ہے
جھلک پڑتی ہے شام اور تیرگی معلوم ہوتی ہے

جلا تھا جب نشیمن باغ میں ہر سو اجالا تھا
قیامت خیز اب ہر روشنی معلوم ہوتی ہے

مآل شوق موسیٰ دیکھ کر بھی خواہش جلوہ
مکمل اب میری دیوانگی معلوم ہوتی ہے

مرے زخم جگر کی چھوٹ سے ہیں دو جہاں روشن
چلے جاؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

یہ کیا بے وقت زلفیں آپ نے چہرے پہ بکھرا دیں
سحر کا وقت ہے اور شام سی معلوم ہوتی ہے

مناظر آشیاں جلنے کے پھر جاتے ہیں نظروں میں
چمن میں ہم قفس جب روشنی معلوم ہوتی ہے

قفس میں بوئے گل آتی تھی اب وہ بھی نہیں آتی
صبا کی ہو نہ ہو کچھ بے رخی معلوم ہوتی ہے

جھکا رہنے دے سر مقبول سجدہ ہو نہ ہو اے دل
طریق بندگی سے بندگی معلوم ہوتی ہے

یہ اپنا ظرف چارہ گر یہ اپنی اپنی فطرت ہے
تجھے تسکین، خلش مجھ کو بھلی معلوم ہوتی ہے

مصائب شامِ ہجراں کے سمٹ آتے ہیں نظروں میں
نظر کے سامنے جب تیرگی معلوم ہوتی ہے

سرِ گورِ غریباں ہو نہ ہو اس کے قدم آئے
لحد میں یک بیک کیوں روشنی معلوم ہوتی ہے

حقیقت میں انہیں برباد کرنا بھی نہیں آتا
یہ سب خوبی تری تقدیر کی معلوم ہوتی ہے

غزل

یہ مانا ضبطِ فغاں بار بار ہوتی ہے
یہ سب پر مگر بحد اختیار ہوتی ہے

سفینہ ڈوب رہا ہے نظر ہے ساحل پر
امیدِ زیست بڑی خوشگوار ہوتی ہے

قفس میں ہو چلے رنگین بال و پر صیاد
خزاں نصیب کو حاصل بہار ہوتی ہے

چڑھا کے پھول بہاؤ نہ اشک تربت پر
لحد کسی کی عبث زیرِ بار ہوتی ہے

بدلتا ہے کبھی تیلی کبھی قفس صیاد
ضرور آمدِ فصلِ بہار ہوتی ہے

نصیب کون سی منزل میں پھر سکوں ہوگا
خلش لحد ہی میں جب بار بار ہوتی ہے

اثر پذیر یقینی ہوئے مرے نالے
انہیں یوں ہی تو فغاں ناگوار ہوتی ہے

جو دیکھا آبلۂ پا نے پھوٹ کر روئے
یہ نوک خار بھی کیا غمگسار ہوتی ہے

عجیب کشمکش مرگ و زیست میں ہے مریض
بلا کی چیز شبِ انتظار ہوتی ہے

ہمیں ہے حکمتِ عشق و عاشقی کرنا
بلا سے ہو جو خلش بار بار ہوتی ہے

مریضِ عشق نے بدلی ہیں کروٹیں پیہم
مگر نصیب نہ شکل قرار ہوتی ہے

میں جان دے کے بچاؤں گا آبروئے عشق
بلا سے ہو جو بلا ہجر یار ہوتی ہے

غزل

اے ہم قفس جنوں تو وہی ہے کمال پر
دامن رہے نہ جیب رہے اپنے حال پر

دِل مجھ پہ غمزدہ میں دل پُر ملال پر
مل جل کے چھا رہے ہیں غم لازوال پر

تف جرأتوں پہ دل تری اور اس مآل پر
آہ و فغاں کا اور اثر خال خال پر

یہ ظلم کشتۂ شب فرقت کے حال پر
بکھرائیے نہ زلف رُخِ پُر جمال پر

آمادۂ فغاں کبھی مائل ملال پر
القصّہ دِل رہا نہ کبھی ایک حال پر

بکھرائی تم نے زلف رُخِ پُر جمال پر
تاریکیاں سی چھا گئیں میرے مآل پر

تم کو اگر غرور ہے حُسن و جمال پر
دِل کو بھی ناز ہے خلشِ لازوال پر

ابھرے ہیں جو نقشِ پا لحدِ پائمال پر
مَلتے ہیں ہاتھ وہ میرے حسن مآل پر

دنیا کے کل دلوں میں ہے میرے دِل کا انتخاب
حیرت میں اک جہاں ہے تیری دیکھ بھال پر

دانستہ کھا رہا ہوں میں دھوکے خدا گواہ
نازاں وہ ہو رہے ہیں فریب جمال پر

بنتا رہا بگڑتا رہا اپنا آشیان
المختصر رہا نہ کبھی ایک حال پر

منظور دو جہاں کہیں نالۂ صبح غم و الم
اس آستاں سے سر کا ہے اٹھنا محال پر

اے فیض اس کو چرخ کی گردش کا خوف کیا
چھا چھا گیا ہے جو غم و ماضی و حال پر

غزل

دعا ہے باغباں اپنی نہ آئے آنچ گلشن پر
بلا سے بجلیاں گرنے کو گر جائیں نشیمن پر

ہٹاتے ہی نہیں اب سامنے سے آئینہ وہ تو
نہ جانے ان کو کیا دھوکہ ہوا ہے روزِ روشن پر

خدا جانے کہ
خدا ہی جانے کیا خوبی تھی ان کے مرنے والے میں
وہ آ کر روز دو آنسو گرا جاتے ہیں مدفن پر

الٰہی شرم رکھ لینا نزاکت کی سرِ مقتل
گرے خنجر جو ان کے ہاتھ سے تو میری گردن پر

غزل

سعیٔ لاحاصل ہے ناصح تیرے سمجھانے کی بات
کچھ اگر دیوانہ سمجھے گا تو دیوانے کی بات

کیوں ہوئی ان سے محبت، کیوں اٹھا دردِ جگر
یہ سمجھنے کی ہے ناصح اور نہ سمجھانے کی بات

کیا کوئی ترمیم آئینِ جنوں ہونے کو ہے
آج کیوں ہوتی ہے دیوانے سے دیوانے کی بات

ہم قفس اپنا نشیمن فصلِ گل میں جل گیا
یہ بھلا دینے کے قابل ہے نہ دہرانے کی بات

کہتے کہتے داستانِ عشق دونوں جل بجھے
اہلِ محفل شمع کی سمجھے نہ پروانے کی بات

اس بہانے اس نے عرضِ مدعا ٹھکرا دیا
قابلِ غور و سماعت کب ہے دیوانے کی بات

کچھ تو خوبی ہے کہ سارے صاحبِ عقل و خرد
غور سے بیٹھے ہوئے سنتے ہیں دیوانے کی بات

ٹیس، بے چینی، خلش، دکھ درد، آلامِ جہاں
ہو نہ ہو اے دل، یہ سب ہے ان کے یاد آنے کی بات

آئیں وہ اور دردِ دل اٹھے نہ استقبال کو
فیضیؔ، یہ توہینِ الفت ہے یہ مر جانے کی بات

غزل

المدد عشق لٹا جاتا ہے سامان جنوں
کوئی داماں لیے جاتا ہے گریباں کوئی

ڈوبنی تھی تو وہ آخر لب ساحل ڈوبی
اپنی کشتی کو نہیں حاجت طوفاں کوئی

پھر بنالوں گا نشیمن کو جلادے آ کے برق
جلنے پائے نہ مگر شاخ گلستاں کوئی

وہ گری برق وہ لو جل کے نشیمن سے اٹھی
ایسے میں رکھ دے قفس نزد گلستاں کوئی

بعد مردن ہوا احساس محبت شاید
رکھ گیا شمع سر گور غریباں کوئی

کچھ سبب ہی نہیں کھلتا خلش پیہم کا
ٹوٹ کر رہ گیا کیا قلب میں پیکاں کوئی

کیوں ہوئی گور غریباں میں یکایک ہلچل
آج کیا آگیا یاں حشر بداماں کوئی

ہم نشیں ہیں یہی معراج جنوں کے آثار
کوئی داماں لیے جاتا ہے گریباں کوئی

آج شاید ہوا دیوانوں کو احساس بہار
چاک داماں کوئی کرتا ہے گریباں کوئی

حضرت فیض بھرتپوری کے کلام کا دیگر
زبانوں میں ترجمہ کرانا ادارۂ فیضِ ادب
کے زیرِ منصوبہ ہے.........
جناب سہیل غلام عباس نے
یہ ترجمہ کیا ہے۔

پروفیسر ایس جی عباس
Prof. S. G. Abbas

(1)

دل سے دلبند پیمبر کی ثنا کرتا ہوں
طالعِ عشق کو کچھ اور رسا کرتا ہوں
یہ نہ پوچھو کہ غرض کیا ہے یہ کیا کرتا ہوں
اجر احمد کی رسالت کا ادا کرتا ہوں

جز حسین اور مری فکر کا عنوان نہیں
یہ تو اک فعلِ حسن ہے کوئی احسان نہیں

To the beloved of the Prophet, my most
fervent salutation,
To their reverent being, my most
reverent adulation,
Ask not the reason for this deep-
seated veneration,
For the Prophet's noble services, it's but
an acclamation,
No other there but Hussain, is
the subject of my exercise,
It's an act of grace where my
whole interest lies.

(۲)

مجھ پہ موقوف ہے کیا جو بھی کرے مدح رقم
اس کو ملتے ہیں درِ علم سے موتی پیہم
عقل حیران ہے یہ دیکھ کے خالق کی قسم
دل کی آواز کو سن لیتا ہے کس طرح قلم

اپنی مرضی سے نہ چلتا، نہ کبھی لکھتا ہے
بات جو دل میں ہے میرے یہ وہی لکھتا ہے

It's I alone, but whoever pays him eulogy,
Precious gem he gets, and that too constantly,
Intellect is at a loss to know, there's no strategy,
With my heart's desire, the pen has ever a harmony,

It never works at its own accord,
With mind, the pen has an infinite concord.

(۴)

میری کیا تاب و تواں کیا عز و اوج و مقام
شہ کا اک بندۂ کمزور ہے، ناچیز غلام
ناتوانی میں بھی پایا ہے جو یہ زورِ کلام
حق کی تائید ہے، امدادِ نبیؐ، فیضِ امام

یہ نہیں دیکھتے وہ، فکر و نظر کتنی ہے
اتنی ہوتی ہے عطا جس کی طلب جتنی ہے

No worth I have, not the least
exaltation,
In being the sovereign's abject slave,
lies my exultation,
But despite being weak, so powerful
is oration,
It's God's grace, Prophet's favour and
Leader's approbation,

They deem not how deep is
in sight,
But grant as much as is
appetite,

(۴)

پاک ہے خانۂ کعبہ کی طرح دل کا حرم
لن ترانی کا نہ بت ہے، نہ تعلّی کا صنم
یا علیؑ کہہ کے میں جس وقت اٹھاتا ہوں قلم
پھر مرے زورِ طبیعت کا نہ پوچھو عالم

اسی کلمہ نے مری نظم کو قوت بخشی
یہ اسی وِرد نے گویائی کی طاقت بخشی

Like holy Kaaba, sacred is heart's chamber,
There resides no idol of vanity, nor of swagger,
I take the pen after "ya Ali" I utter,
The Muse works and works, it does'nt wither,

My power of poetry lies in this utterance,
This is in fact my oration's sustenance.

(۵)

صدقِ دل سے جو کہا مرثیۂ شاہؑ اُمم
رہ گیا ہو کے غمِ شاہؑ میں ہر غم مدغم
پھر عجب کیا جو ہیں معراج کے زینے پہ قدم
یہ تو منبر ہے ابھی جس سے بہت پست ارم

دیکھنا اوج جو تائیدِ خدا ساتھ میں ہے
عرش کا قصد ہے اور لوح و قلم ہاتھ میں ہے

From the core of my heart, when I
composed elegy,
Every other sorrow melted, such was
his tragedy,
It was my ascension of the
highest degree,
Higher than Eden is pulpit, most
certainly,

With the blessing of God, I
crave for exaltation,
And the Abode of God, is
my set destination.

English Section

An appreciation of Late Faiz Bharatpuri
By
●
Syed Sulaiman Qadr 'Kausar Zaidi'

Faiz Bharatpuri, the poet of nature,
That too of high stature,

Well versed in poetic diction
Yet versified historical facts, nay no fiction

As a litterateur supreme,
He is held in high esteem,

Was a devotee true, you deem
Chose the tragedy of Karbala, as theme

Hazrat Imam Husain and his companions he did adore,
Pathetic scenes portrayed, touched to the core,

Highlighted their sacrifices,
To say so suffices,

While listening to kausar, pray keep in view,
Its appreciation, not review.

It will not be out of place to mention here that at first he was a disciple of Naseem Amrohvi but then he himself was recognised as an authentic poet in the former's life time, which was confirmed by late Hazrat Nasim Amrohvi on a query from the writer.

Being a born poet and a staunch devotee of Hazrat Imam Husain, Faiz Bharatpuri devoted all his energies in composing marsia.

Today Faiz Bharatpuri is not among us but he has immortalised himself through his marsias (elegic poems) and he will ever be remembered.

I happened to be known to him and recited my poems in some of the gatherings addressed by him in connection with his poetry. His elegiac verse has such commendable qualities that as compared with it Gray's famous elegy pales into insignificance. A study of works reveals his deep insight in the history of the tragedy of Karbala. He is second to none in imagery and has successfully depricted the pathetic scenes. Somebody has aptly said, our sweetest songs are those which tell us of sadest thoughts. This holds good in the case of Faiz Bharatpuri. Apart from pathos his mournful poems create, he impresses as an epic poet when verifying heroic deeds of each of the matters holding overwhelming numbers of their adversaries at bay though deprived of food and drink for three consecutive days and nights.

He was a devotional poet of the Ist rank; and had adopted this line in the belief it was the best form of paying tribute to Ahlebait and as such a means of pleasing the holy prophet and earning Divine pleasure.

May his soul rest in eternal peace! Amen.

Syed Solauman Qadr
Kausar Zaidi

Faiz Bharatpuri

Syed Farzand Hasan, Faiz Bharatpuri was a great poet and sincere man. He was held in high esteem in the poetic getherings. That is why people are so sad after his demise. He attained an eminent position as a poet.

Though he began writing poetry 55 years ago he started composing elegies mourning the martyrs of Karbala (marsia) after migration to Pakistan-Karachi. Subsequent upon the partition of the subcontinent when Dr. Yawar Abbas founded his Ashrai Majalis (10 days programme of religious gathering mourning the death of the martyr of Karbala) as an annual feature and invited poets to recite poems of their own on the topic Faiz Bharatpuri evinced a keen intrerest and actively participated in the poetic getherings of elegy.

Faiz thinks poetry is not merely a matter of expressing feelings and emotions. It is like the craft of an artisan. A craft one must know. It is like a musical composition. One has to see if and where a note fits. A plant must have its roots in the soil. A root-less plant cannot flourish. Similarly, the roots of the traditions must be kept intact. However, in accordance with the changed circumstances, one must continue to prune the plant. It should be recognizable in the contemporary context so there are two things – continuity and renovation. Traditions and experiments. There is no laid-down formula or recipe in his poetry.

Faiz as a poet believes that every poet must find his own answers. If a person knows what he is doing, he will hit the right balance. Take some of prose poets. Normally, they give up in almost four years and come back to traditional poetry. He has never tried this rigmarole. Perhaps, a few times, come to think of it. However, he has tried to stay within the framework of tradition and tried innovations where he could. As in religion, there is freedom to interpret the revealed world in accordance with the needs of age, so it is in his poetry. But while interpretations aimed at tailoring things to contemporary reality is allowed, hereby is not.

Faiz believes a poet may influence other poets, but importment, objective conditions also create a new idiom, a certain kind of grammar a particular form of expression. The poet who becomes the first to employ these innovations becomes a stylist at a particular time, that is the case of Faiz as he devoted his later study in taking it for granted he wanted to be a missionary of martyrs of Karbala. It grew clearer to him how for he himself is truly understanding the MARSIA and the faith sacrifice and discipline among the followers of Islam as dictates are visible in his Marsias. It is one remarkable strength in "Faiz" Marsia, that he can give true presentation to the dimensions of tragedy of Karbala.

ghazals attracted greater public attention as these had better sonic appeal because of the lift and candence of the new vibrant composition of words invented by Faiz.

He maintianed the tendency of better class of poets in his vicinity withobjectivity of moral values of mankind. His poetry was full of exhalation to the full satisfaction of audience.

His poetic composition of words provided raiments to ghazals. He was equipped with adequate knowledge of modern poetry. His ghazals were well decorated with contrapuntal feelings of emotions and movements and were bedecked with melodic embellishments. That is one major input which increased the enchanting quality of his ghazals.

Faiz rendered composition of his ghazals with feeling and verse skillfully bringing out the mood of the literary and melodic contents.

Almost all the ghazals are song oriented haivng special appeal for the present generation.

Faiz writes, quietly, of people in spiritual pain. His heroes are courageous in situations where their lives depend on reconciling faith in God, and Prophet. There is no real dichotomy between the conscious and unconscious. One's unconscious is always involved in whatever one does consciously. Of course, there is kind of struggle between the conscious and the unconscious. Perhaps, unconsciously, Faiz would like to Screan out, let him give it all up and sit at home and intone God's name. But then he does not do that. Depends on how much fight he has in him so, he supposes, the fact that one goes on is due to many factors – a bit of faith, a bit of inner light, a bit of it from the outside, and then friendships. He moves the people, with the caravan, as it were and the people are not un-happy or sad.

"FAIZ BHARATPURI"

By
Mohsin Burney

Faiz Bharatpuri passed away peacefully, leaving behind his poetry to remind us all his calibre as a poet. He was an object of our admiration and affection, of our pride and our hopes for his literary concept of life, love with objectivity and consolation emerging from words of sadness.

He was born on November 11, 1911 at Bharatpur in a respectable family of the state and his father, Syed Ikram Husain Kaleem, was a poet of a distinction, having the flare to guide his son to become a poet. His father contributed a lot to educate his son for bridging the poetic verses into well versed ghazals.

Traditionally Faiz Bharatpuri followed the guide lines of Shad Bharatpuri and Urooj Bharatpuri. Urooj, apart from being a poet, was a man of letters and intellectual in his writings. Faiz was brainy and he managed to extract the colourful wisdom of Urooj and his guidance to the extent that he exercised himself a poet indeed. He became a fenceless poet in a short period.

His poetry provides sprightly interludes to increase enchantment of the presentation. Out of these, many

mentioned about the ultimate reality and values showing the bright path. He pleaded for endurance and patience by describing the characters of the companions of Hazrat Imam Husain (A.S.) and proved that the real success can be acquired by facing the sufferings and the hardships. Faiz has narrated that the grandson of the Holy Prophet stood firm against the cruel regime of Yazid and became immortal after martyrdom. Describing the tragedy of Karbala he has also universalised the grief of mankind in an attractive manner to present the absolute truth and perfection of life.. His narration of grief is identified by the aim of achieving the true goal of life by virtue of endless struggles and efforts against falsehood.

Faiz Bharatpuri stands immeasurably above the poets of "Mersia" who belong to the classical school of his favourite form of poetry. It is a fact that he dedicated himself for the accuracy and correctness of language and laid a dignified stress on the expression of remarkable thoughts and ideas. He had full command on language that is why his readers enjoy very much from literary point of view. His excellent imagination focusses the illustration in a magnificent style of versification. A worth praise poetic flow distinguishes him from his contemporaries in the field of "Marsia Nigari". Faiz believed that "Marsia Nigari" of his age is an efficious and modified interpretation of life. He did his best in this respect and became a renowned poet.

A person like Faiz Bharatpuri having vast and extensive knowledge is rarely seen so humble as he was with all. He was very simple, gentle, sweet and honey tongued person. He was regarded very much because he possessed the qualities of a high ranking person bearing the dignified values of humanity.

May God rest his soul in peace.

this respect from Shad Bharatpuri, Maulana Ghazanfar Urooj Bharatpuri and Maulana Naseem Amrohvi. The said personalities were authority on eastern classical poetry and literature.

Faiz Bharatpuri was awarded the poetical virtues by nature and further he was intelligent so within a very short period of time he appeared to be an outstanding poet. Most of his lyric poems are full of passions and romance bearing the most hunting music and some of these poems are full of pathos and meloncholy. Thus his lyricism consists of many phases of life and love. His contribution as a lyric versifier is admired for considerable deep feelings characterised by the excellent intellectual thoughts and splendid technical execution. I can freely say that these poems are full of imaginative strength, emotional wealth and grandeur of expression leaving magic appeal.

After a time of nearly 25 years he left composing the lyric poems and devoted himself fully towards relgious poetry. He has composed innumerable Naat, Manqabat and Salam but his major field of contribution remained "Marsia Nigari" the description of the martyrs of Karbala. The fundamental cause to adopt such poetry was to write about the pathos, courage and aim of the great martyrs who gave us the true recognition of Islamic values by facing the troubles and the tortures of Yazid who was a corrupt, cruel and a wicked person. According to his temperament, he was busy to prevail unislamic values as a Caliph. Hazrat Imam Husain (A.S.) flourished and grew in the light of the holy message. He possessed an unshakeable belief and the strongest possible character enriched by the Quranic principles and sunna. In the light of the facts and philosophy of "Shahadat" Faiz Bharatpuri described the values of human life. His topics are as wide abroad as life itself. His readers find that he has fully

Prof. Dr. Naeem Taqvi

O

"Faiz Bharatpuri – A renowned poet"

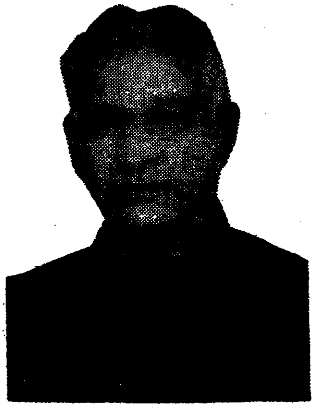

Faiz Bharatpuri was born on 11th November 1911 at Bharatpur and expired on 15th May 1989 at Karachi. He got his early education from his father Syed Ikram Hussain Kaleem a known poet of his time. After passing his matriculation in 1936, he took keen interest in composing lyric poems. He availed the opportunity to get guidance in